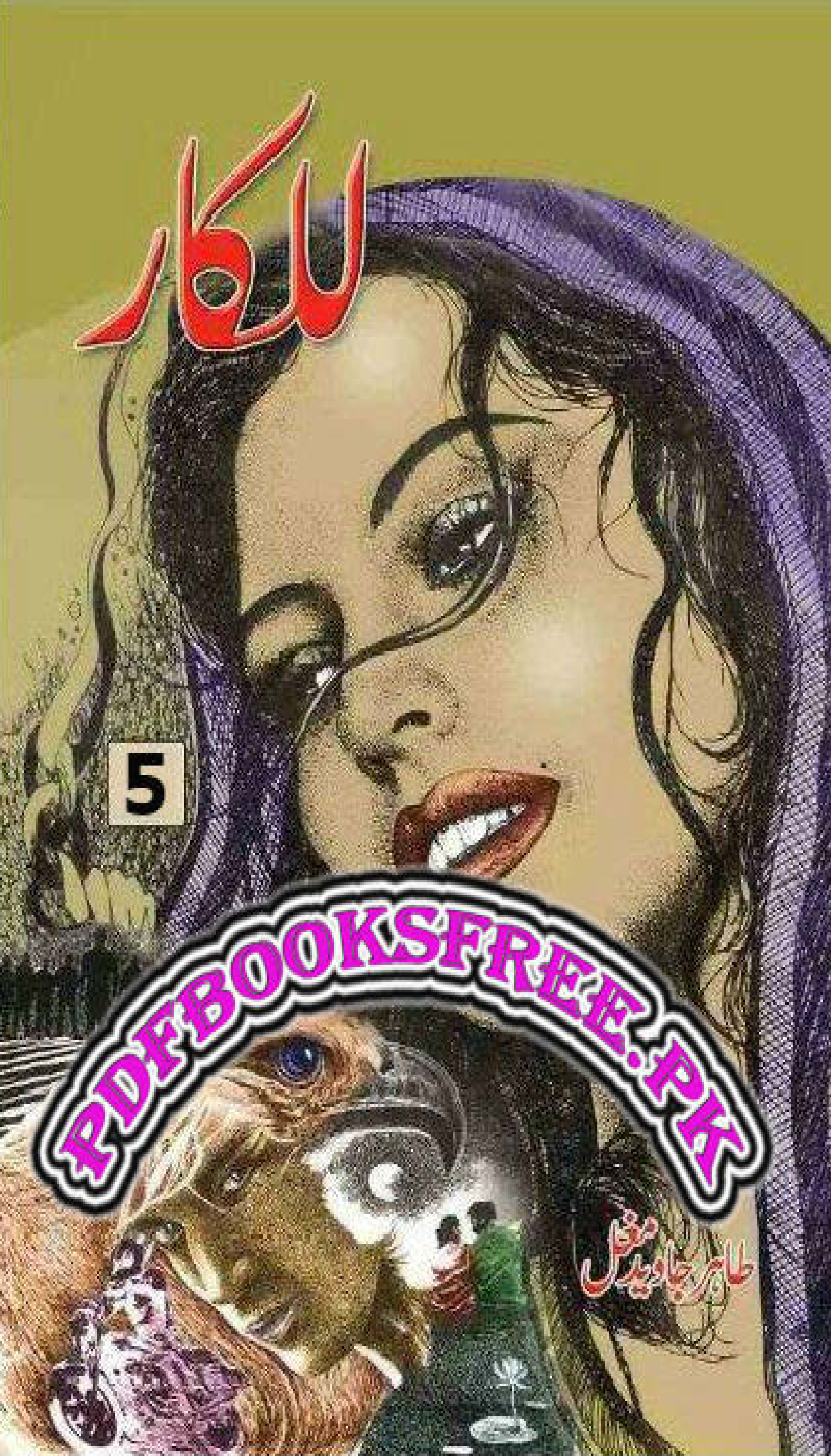

للکار
5
PDFBOOKSFREE.PK

عمران اپنی باتوں سے ان تہ خانوں کی گھٹن اور سنجیدگی دور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی باتوں سے ماحول کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اور تو اور تاؤ افضل جیسا بے رنگ شخص اور طلال جیسا نہایت سنجیدہ لڑکا بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ طلال سلطانہ کا سگا بھانجا تھا اور ہر سرگرمی میں اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اپنی خالہ پر جان چھڑکتا تھا۔ درحقیقت یہ طلال ہی تھا جس نے مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ اس کی خالہ، جارج گورا سے بدلہ لینے کے لئے تڑپ رہی ہے اور وہ کسی بھی وقت خاموشی کے ساتھ تہ خانوں سے نکل کر دوبارہ زرگاں کا رخ کر لے گی۔ یہ سب کچھ مجھے بتاتے ہوئے وہ زار و قطار روتا بھی رہا تھا۔ اس کی باتوں نے میرے دل پر ایسا اثر کیا تھا کہ مہینوں میں ہونے والا کام دنوں میں ہوا اور میں عمران کے ساتھ جارج گورا کی طرف نکل کھڑا ہوا تھا۔

طلال اب بھی ہر وقت سلطانہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ اپنی خالہ سے اس کا ایک قلبی تعلق بن چکا تھا۔ جارج کے ساتھ اپنی لڑائی کی رُوداد میں پوری تفصیل سے سب کو سنا چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب مزید سننا چاہتے تھے۔ یہ تذکرہ تہ خانے کے سارے مکینوں کے لئے زبردست دلچسپی کا باعث تھا۔ خاص طور سے طلال کے لئے۔ وہ اس سارے واقعے کی مکمل جزئیات جاننے کا خواہش مند تھا۔ آج بھی وہ موقع دیکھ کر میرے پاس آن بیٹھا تھا اور سامبر کے اس مقابلے کی باتیں کرنے لگا۔

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہیں سمجھی اور اس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔

اس کے سوالوں میں سادگی بھرا تجسس ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”خالو تابش! جب آپ کی گردن جارج کے باجو میں پھنس گئی اور آپ اسے نکال نا ہیں سکے تو آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا

آپ کو امید تھی کہ آپ نکل سکیں گے؟"

"امید پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ سیانے یہی کہتے ہیں کہ امید اور کوشش کا دامن آخر تک نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

"میرا مطلب ہے جی کہ سورج ڈوب جانے کی وجہ سے پنڈتوں نے لڑائی رکوا دی۔ فرج (فرض) کیا اگر وہ یہ لڑائی نا ہیں رکواتے تو کیا آپ نکل جاتے؟"

"میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ میری برداشت ساتھ دیتی رہی اور میں لڑائی کو لمبا کھینچتا رہا، یہاں تک کہ لڑائی کا وقت ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں نا کہ قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے جو کوشش کرتے ہیں۔"

طلال کی نگاہوں میں میرے لئے ستائش ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ مجھ سے مختلف سوال پوچھتا رہا۔ میں اتنی سردی گرمی کیسے برداشت کر لیتا ہوں؟ میں بھوک کیسے جھیل لیتا ہوں؟ میں کھردرے فرش پر کیسے سو جاتا ہوں؟ کیا واقعی مجھے درد محسوس نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران میں آفتاب خاں بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر تھا اور اس میں میٹھے چاول تھے۔ "یہ کیا ہے آفتاب؟" میں نے پوچھا۔

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ "تابش صاحب! ام نے منت مان رکھا تھا کہ اگر آپ زرگاں سے کامیاب ہو کر خیریت کے ساتھ واپس آ گیا تو ام لوگوں کا منہ میٹھا کرائے گا۔ ام نے آج زردے کا دیگ پکوایا تھا اور بچوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ کچھ چاول ام یہاں لے آیا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ امارے سامنے اپنا منہ میٹھا کرے۔"

میں نے اور طلال نے ایک ایک لقمہ لیا۔ "تمہیں جارج کے مرنے کی خوشی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنا زیادہ کہ آپ سوچ نہیں سکتا۔ لوگ کہتا ہے کہ دشمن کے مرنے پر بھی خوشی نہیں منانا چاہئے لیکن یہ ایسا گندہ دشمن تھا کہ ام خوشی منائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا...... اور یہ صرف امارا بات ہی نہیں ہے۔ اس راجواڑے کا زیادہ تر لوگ خوش ہے۔ پتا ہے، جب زرگاں سے یہ خبر یہاں پہنچا تو لوگوں کا چہرہ چمک اُٹھا۔ آپ جاتے جاتے ام کو منع کر گیا تھا کہ ام تہ خانے کے اندر نہیں جائے گا۔ پر ام سے برداشت ہی نہیں ہو سکا۔ رات تک کا وقت ام نے پتا نہیں کس طرح کاٹا اور پھر تہ خانے میں آ گیا۔ اس وقت آپ کا بی بی سلطانہ مصلے پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ خوشی کے مارے امارے منہ سے بات ہی نہیں نکلا۔ ام بس اتنا ہی کہہ سکا...... وہ

خبیث مر گیا، ختم ہو گیا......"

آفتاب خاں نے اس دن کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا جب فتح پور میں جارج گورا کے مرنے کی اطلاع پہنچی تھی۔

ہمارے یہاں تہ خانوں میں آنے کے بعد آفتاب خاں تقریباً روزانہ ہی اندر آ رہا تھا۔ وہ رات کو فتح پور کی گلیوں میں پہرا دیتا تھا۔ اس پہرے کے دوران میں ہی نصف شب کے وقت وہ چپکے سے مندر کا پرانا دروازہ کھولتا تھا اور اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت تہ خانوں میں اُتر آتا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تشویش تھی۔ اسی تشویش کی وجہ سے میں نے اور عمران نے زرگاں جاتے وقت آفتاب سے کہا تھا کہ وہ تہ خانوں میں آنے سے گریز کرے۔

میں نے ایک بار پھر اس سے یہی بات کہی۔ میں نے کہا۔ "آفتاب! دل تو یہ چاہتا ہے کہ تم ہر وقت ہمارے پاس رہو مگر مسئلہ وہی ہے کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اگر کسی رات کسی نے تمہاری آمدورفت دیکھ لی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"آپ کہتے ہیں تو ام آنا کم کر دیتا ہے لیکن ام آپ کو ایک بات کا پورا یقین دلاتا ہے، اماری وجہ سے کبھی کسی کو آپ کے یہاں ہونے کا پتا نہیں چلے گا......"

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے اور دروازہ کھول کر اندر آنے میں کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

اگلے روز آفتاب خاں نے تہ خانوں میں آ کر جو خبر سنائی، وہ واقعی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر اسی کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں تھی جسے ہم اس کی ساری نحوست سمیت زرگاں میں چھوڑ آئے تھے۔ آفتاب خاں نے بتایا کہ پچھلے چار پانچ روز سے بڑھیا نے مرن برت رکھا ہوا تھا۔ وہ زرگاں کے بڑے مندر کی سیڑھیوں پر دھرنا دیئے بیٹھی تھی۔ کمزور عقیدہ لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد اکٹھا رہتا تھا بڑی عمر کے کچھ اور مرد و زن بھی اس کے ساتھ اس بھوک ہڑتال میں شریک ہوتے گئے اور اچھا خاصا تماشا بن گیا تھا۔ پرسوں رات کو بڑھیا بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی۔ پتا چلا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس کے دیہانت کی خبر سے ہندوؤں نے مندر کے قریب ہی مسلمانوں کے ایک محلے پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیرا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ اس نہایت سنگین واقعے میں کم و بیش ساٹھ لوگوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

یہ دل خراش اطلاع تھی۔ زرگاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال بڑھ رہا تھا۔

خاص طور سے اونچی ذات کے ہندو بہت مشتعل تھے۔ مسلمانوں نے جس طرح میری اور جارج کی لڑائی میں میری حمایت کی تھی اور جس طرح چپکے چپکے میری جیت کی خوشی منائی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں کو یقیناً بہت تاؤ چڑھا تھا۔ اب اس کا بدلہ مسلمانوں کے پورے ایک محلے کو جلا کر لیا گیا تھا۔

یہ بہت افسردہ کر دینے والی خبر تھی اور اس میں افسردہ کر دینے والا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کم بخت بڑھیا اس سارے فساد کے باوجود ابھی زندہ تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب پتا نہیں کہ وہ واقعی بے ہوش ہوئی تھی یا یہ اس کا کوئی مکر تھا۔ زرگاں کے ضعیف العقیدہ لوگ اسے بھی بھگوان کا چمتکار قرار دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا واقعہ بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اگلے روز سب بجھے بجھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی کسی نے نہیں کھایا۔ سلطانہ بھی افسردہ تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ زرگاں اور نل پانی میں حالات پھر سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس بار لڑائی تک نوبت آ جائے۔“

”ہاں، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ساٹھ لوگوں کے مرنے کی خبر ہے۔ بہت سے زخمی بھی ہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔“ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ وہ وجہ زیادہ اہم ہے۔ جب ہم زرگاں سے آ رہے تھے تو وہاں جیل میں ہنگامہ ہوا تھا بلکہ اسے بغاوت ہی کہنا چاہئے۔ سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ان میں سے تیس چالیس کو سُولی کی سزا ہو جائے گی...... اگر واقعی ایسا ہو گیا تو مجھے نہیں لگتا کہ یہاں امن رہ سکے گا۔“

”آئندہ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سوچ رہا ہوں، تاؤ افضل کی کسی دختر سے شادی کر کے اسے جلدی سے دو تین بچوں کا نانا بنا دوں۔ اگر یہاں ہونے والی لڑائی میں مر بھی گیا تو کوئی میرا نام لینے والا تو ہو گا......“ وہ پھر پٹڑی سے اُتر گیا۔

”بس اب اپنی بکواس شروع کر دو۔“ مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بمشکل بٹھایا اور خلافِ توقع سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”تابی! ہم زیادہ دیر یہاں رہ نہیں سکتے۔ تمہیں پتا ہی ہے، حکم کے سامنے مجھے بتانا پڑا تھا کہ میں فتح پور کے مندر میں ہونے والے خونی ہنگامے کا چشم دید گواہ ہوں۔ اب ہمارے فرار کے

بعد ہماری تلاش شروع ہو چکی ہے۔ دیکھنا ایک دو دن میں حکم کے سپاہی یہاں فتح پور تک بھی پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آفتاب خاں سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ کسی بھی وقت ہماری یہاں موجودگی کا پول کھل سکتا ہے۔“

”تو پھر؟“

”ہمیں جلد از جلد نل پانی پہنچ جانا چاہئے۔ وہیں سے ہماری واپسی کا کوئی راستہ نکل سکے گا۔“

”لیکن اگر نل پانی پہنچنے کی کوشش میں دھر لئے گئے تو پھر؟“

”اس کا ایک حل ہے لیکن وہ حل یہاں سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ مجھے پہلے اس حل تک پہنچنا ہو گا۔“

”کھل کر بات کرو یار۔“

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”جب تمہاری گردن سے ”الیکٹرانک چپ“ نکلوانے کے لئے میں ڈاکٹر لی وان کو یہاں لے کر آیا تھا تو راستے میں ہنومان نامی ایک بستی میں رکا تھا۔ یہاں ایک ٹیلے پر ایک بڑا پگوڈا ہے۔ اس بستی میں ننھا کمار نامی ایک شودر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص خاندانی شکاری ہے۔ اس علاقے کی ہر اونچ نیچ کو جس طرح جانتا ہے، شاید ہی کوئی دوسرا جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے اگر ہم اس بندے کو کچھ رقم دیں تو یہ ہمیں نہایت محفوظ رستوں سے نل پانی کے نواح تک پہنچا سکتا ہے اور یہی نہیں، ہمارے لئے مناسب سواری کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔“

اس حوالے سے میرے اور عمران کے درمیان آدھ پون گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ حسبِ معمول عمران یہ کام بھی اکیلے ہی کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اڑ گیا کہ اگر جانا ہے تو پھر ہم اکٹھے جائیں گے۔ ورنہ نہیں جائیں گے...... کافی بحث وتمحیص کے بعد عمران رضامند نظر آیا۔ ہم نے اس بارے میں دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کر دیں۔ بے شک اس میں خطرہ موجود تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ عمران کی طرح مجھے بھی خطرات کو گلے لگانا اچھا لگنے لگا ہے۔

اس رات میں نے سلطانہ کو بھی بتا دیا کہ میں اور عمران ایک دو روز کے لئے مندر سے باہر جائیں گے تا کہ نل پانی پہنچنے کا معاملہ آسان ہو سکے۔ سلطانہ نے اس پر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ کرے گی اور مجھے باہر جانے سے روکے گی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ میں اسے زرگاں سے آنے والی دل خراش خبر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔

اور تیسرے دن مجھے پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ میرے لئے بالکل ناقابلِ یقین

ثابت ہوا۔ آفتاب خاں کا ایک اور روپ میرے سامنے آیا جس نے مجھے بھونچکا کر کے رکھ دیا...... بلکہ بنیادوں تک ہلا ڈالا۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ پسلی کے درد کی وجہ سے میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ سلطانہ میرے پہلو میں موجود نہیں ہے۔ میں نے لحاف ہٹایا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالٹین روشن کر کے میں نے دیکھا، کمرا خالی تھا۔ سلطانہ کی چپل بھی موجود نہیں تھی۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے غسل خانے میں دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی تہ خانے میں گیا۔ نوری، کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیاں اور طلال وغیرہ سب سو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تاؤ افضل بھی جو رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتا تھا، سویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سب سے اوپر والے تہ خانے کی طرف سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک کمرے میں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ میں لکڑی کے قدیم زینوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا اوپر گیا۔ ایک دم مجھے ایک دروازے کی اوٹ میں ہونا پڑا۔ میں نے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں سے سلطانہ کو نکلتے دیکھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ادھ کھلے دروازے میں آفتاب خاں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ سے کچھ کہا پھر ایک چھوٹا سا مستطیل ڈبا سلطانہ کو تھمایا جسے سلطانہ نے لے کر اپنی چادر میں چھپا لیا۔

وہ اب واپس پلٹنے والی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اُترا۔ کمرے میں واپس جا کر لالٹین بجھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ رہا ہے۔ یہ میں کیا دیکھ آیا تھا؟ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد سلطانہ کا ہیولا کمرے میں داخل ہوا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کئے بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے آفتاب سے حاصل ہونے والا گتے کا ڈبا پلنگ کے نیچے کہیں چھپایا۔ جو ہلکی پھلکی آوازیں پیدا ہوئیں، ان سے مجھے شک ہوا کہ ڈبے میں چوڑیاں یا اس قسم کی کوئی شے ہے۔

باقی کی رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور معاملہ تھا لیکن کیا تھا؟ اور اگر تھا تو وہ مجھ سے کیوں چھپا رہی تھی؟

میں نے سلطانہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل تھی۔ اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے مجھے وہ ڈبا دیکھنے کا موقع ملا جسے سلطانہ نے پلنگ کے نیچے

چھپایا تھا۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ اس میں پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں۔ یہ خوب صورت چوڑیاں وہ آفتاب سے لے کر آئی تھی...... اور آفتاب وہ شخص تھا جسے میں نے اپنی غیر موجودگی میں تہ خانے میں آنے سے منع کیا تھا اور وہ پھر بھی آتا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ عمران سارا دن مجھ سے پوچھتا رہا کہ میں کھویا کھویا کیوں ہوں؟ میں مختلف حیلوں سے اسے ٹالتا رہا۔ اس کی عقابی نگاہیں جان چکی تھیں کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ''ہماری پیاری سی بھابی سے پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں۔''

''اگر ہے تو بتاؤ یار' میں ایک اچھے دیور کا کردار بڑی خوبی سے ادا کر سکتا ہوں بلکہ ضرورت ہو تو بارعب جیٹھ بن کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ بھابی کے پاس اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوگا کہ میاؤں میاؤں...... میرا مطلب ہے، میں آؤں، میں آؤں کرنے لگے۔''

اس روز آفتاب خاں رات دس بجے کے قریب تہ خانے میں آیا۔ حسبِ معمول اس کے پاس باہر کی خبریں موجود تھیں۔ آج کی اہم ترین خبر وہی تھی جس کا اندیشہ دو دن پہلے عمران نے ظاہر کیا تھا۔ آفتاب نے بتایا کہ سہ پہر کے وقت دو جیپوں پر سوار آٹھ دس مسلح افراد بستی میں آئے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔

''کس طرح کی پوچھ گچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پوچھتا تھا کہ دوڈھائی ماہ پہلے مندر میں جو ہنگامہ ہوا، کس طرح کا تھا۔ اس میں کتنا لوگ مرا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ یہ پوچھنے لگا کہ باہر کا جو مسلمان لوگ یہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ دوبارہ یہاں آیا ہے یا نہیں۔ خو، انہوں نے ہر گھر میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں تفصیل مفصیل پوچھا اور کہا کہ اگر کسی نے کچھ چھپانے کا کوشش کیا تو اس کا حشر خراب ہو جائے گا۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر شام کے وقت واپس گیا ہے۔''

آفتاب خاں بالکل معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ وہ کل کیوں نہیں آیا؟

''بس جی...... کل مندر کے پاس ہی ایک گھر میں فوتیدگی ہوا۔ لوگ جاگ رہا تھا۔ ام نے ٹھیک نہیں سمجھا۔''

اس کے سفید جھوٹ نے میرے تن بدن کی آگ کو مزید بھڑکایا۔ اس گفتگو کے دوران میں سلطانہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ اس نے چائے کی پیالی آفتاب خاں کی طرف بڑھائی...... دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے میں گڑی رہیں۔ مجھے لگا کہ کوئی میرے منہ

پڑھا نچے رسید کر رہا ہے۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ سلطانہ جو ایک بیوی سے زیادہ ایک زرخرید باندی کی طرح میری اطاعت گزاری میں مصروف رہتی تھی، اپنے کردار کا ایسا رخ پیش کرے گی، یہ بعید از گماں تھا۔

اگلی رات صورتِ حال کچھ اور بھی واضح ہوگئی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ میں بستر پر جاگ رہا تھا لیکن آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ سینے میں بے چین دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ میرے پہلو میں ساکت لیٹی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سو رہی ہے یا نہیں۔ پروگرام کے مطابق آج آفتاب خاں کو نہیں آنا تھا۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا جب سلطانہ بستر سے اُتری اور چپل پہن کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ میری بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ میں نے پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر خود بھی اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑا۔ میں نے احتیاطاً ریوالور شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ درمیانی تہ خانے سے تاؤ افضل کی غنودگی بھری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ یہ کھانسی تھمی تو میں درمیانی تہ خانے سے گزر کر بالائی تہ خانے میں آیا۔ آج پھر کاٹھ کباڑ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ہلکی روشنی تھی جو یقیناً آفتاب خاں کی لالٹین ہی کی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب چلا گیا۔ مجھے کسی جھری یا درز کی تلاش تھی تا کہ اندر جھانک سکوں۔ کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بس میں اندر، مدھم آواز میں بولے جانے والے دو تین جملے ہی سن سکا...... سلطانہ کی دبی دبی آواز آئی...... "ناہیں آفتاب! اب یہ ممکن ناہیں۔ میں اسے اور دھوکے میں ناہیں رکھ سکتی۔ اسے کسی بھی وخت (وقت) پتا چل جائے گا۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ مجھے فکر تھی کہ تم انتظار کرتے رہو گے۔ اب بس چلتی ہوں۔"

"ابھی تو ام نے کوئی بات ہی نہیں کیا۔" آفتاب کی آواز اُبھری۔

"ناہیں، کافی باتیں ہوگئیں۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن پرسوں تو تم ٹائم پر آ جائے گا؟"

"اس شرط پر کہ مہروج اپنے کام سے چلا گیا...... اور دوسری بات یہ آفتاب کہ یہ آخری بار ہوئیں گا۔ بالکل آخری بار۔" سلطانہ کا لہجہ حتمی تھا۔

آفتاب نے شاید ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ منمنایا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے بعد بس ایک ہی مختصر سا جملہ میری سمجھ میں آ سکا۔ آفتاب خاں نے کہا تھا۔ "گرم چادر ضرور لے کر آنا۔"

زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورتِ حال سے پالا پڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ دل چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور دونوں کے سینوں میں گولیاں ٹھونک دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوچ بھی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ واہمہ ہی نہ ہو۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو کچھ دیکھا یا سنا جائے، وہ ویسا ہی ہو جیسا سمجھ میں آ رہا ہو۔ یہ آدھی رات کی ملاقاتیں اور باتیں کسی اور حوالے سے بھی تو ہو سکتی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت میرے سامنے نہیں آیا تھا جسے حتمی کہا جا سکے۔

میں سیڑھیاں اُتر کر واپس کمرے میں آ گیا اور بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد سلطانہ بھی آ گئی۔ پرسوں کی طرح بغیر کوئی آواز پیدا کئے اس نے پھر پلنگ کے نیچے [illegible] پھسپایا اور میرے پہلو میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے پر سلطانہ نے خود ہی میرے جانے کا ذکر چھیڑ دیا...... عام سے لہجے میں بولی۔ "مہروج! کل پھر جا رہے ہیں آپ؟"

"جانا تو چاہیے۔" میں نے بے دلی سے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

"عمران بھائی بھی ساتھ جائے گا؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ "کتنے بجے نکلیں گے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، کتنے بجے نکلوں تو تمہیں آسانی رہے گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ ذرا چونکی۔

"میرا مطلب ہے، بہت سویرے نکلوں گا تو تمہیں جلدی اُٹھنا پڑے گا۔ کھانا وغیرہ بنانا ہوگا۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب نکلیں گے، یا پھر شام کو۔"

"اور واپسی؟"

"دو راتیں تو تمہیں اکیلے گزارنا پڑیں گی۔"

"مہروج! اس کام میں جیادہ خطرہ تو ناہیں ہے؟" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خطرہ ہے تو اچھی بات ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"خطروں سے ہی تو راستے نکلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں طلال اندر آ گیا۔ اس نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خالہ! نوری کو

بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے، وہ تمہیں بلا رہی ہے۔

سلطانہ، طلال کے ساتھ بالائی تہ خانے کی طرف چلی گئی۔ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف کر دیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے پلنگ کے نیچے ہاتھ چلایا۔ ایک تاریک خلا میں چوڑیوں والے ڈبے کے ساتھ ایک بالکل چھوٹی سی پوٹلی بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے باہر نکال لی۔ یہ ایک ریشمی رومال تھا جس میں کچھ باندھا گیا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ یہ چاندی کے جھمکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی خوب صورت طلائی نتھ تھی۔ یہ نتھ میں نے یہاں اکثر ہندو عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی ان چیزوں کے ساتھ موجود تھی۔ سلطانہ کے واپس لوٹنے سے پہلے میں نے یہ اشیاء پھر اسی جگہ پر رکھ دیں۔

دروازہ کھولا اور بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی۔ رات کو جو ٹوٹے پھوٹے فقرے سنے تھے، وہ زہریلے تیروں کی طرح سوچوں میں سنسنا رہے تھے۔ ایک فقرہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ آفتاب نے سلطانہ سے کہا تھا، گرم چادر لے کر آنا...... اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے مندر سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ سلطانہ کو کسی قریبی گھر میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا۔ وہ کاٹھ کباڑ والے سرد کمرے کے بجائے کسی آرام دہ ماحول میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو کچھ تھا، فی الحال اندازوں اور قیافوں کے زمرے میں آتا تھا، یقین سے کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔

اس روز میں نے عمران کے ساتھ مل کر مندر سے باہر نکلنے اور ''ہنومان گاؤں'' میں نتھا کمار نامی اس ہندو شکاری سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ ہمیں اگلے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی مندر سے نکل جانا تھا۔ دیہاتیوں کے بھیس میں ہمیں پیدل سفر کرنا تھا اور ہنومان گاؤں پہنچنا تھا۔ ہمارے دیہاتیوں والے بھیس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے آفتاب نے ہمیں دو کسیاں بھی فراہم کرنا تھیں جنہیں ہم نے کاشت کاروں کے انداز میں کندھے پر رکھنا تھا۔ مقامی دیہاتیوں والے لباس ہمارے پاس پہلے سے موجود تھے۔ میں نے عمران کو اپنی اندرونی ہلچل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

○......❖......○

اگلے روز شام ہونے تک ہم جانے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کا کرتا دھرتا اقبال ہوتا تھا۔ اب بھی وہی تھا۔ میں سلطانہ کو چور نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے اندرونی اضطراب کو محسوس کر کے دل خون ہونے لگتا تھا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی

ایلن ہماری روانگی کے حوالے سے بڑی فکر مند تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اڑچن پیدا ہونے سے ہمارا پروگرام بدل نہ جائے۔

کیا یہ وہی سلطانہ تھی جسے میں جانتا تھا اور شوہر سے جس کی وفاداری کے قصے مشہور تھے؟ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈتا تھا تو ذہن میں دھند سی بھرنے لگتی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی آفتاب خاں مندر میں پہنچ گیا اور ہم اس کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ فتح پور میں ابھی چراغ جل رہے تھے تاہم گلیاں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مندر کی تعمیر کے لئے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ ہم ان ڈھیروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر ہم نے آفتاب خاں کو ''الوداع'' کہا اور اپنے منتخب راستے پر چل دیئے۔

قریباً ایک فرلانگ آگے آ کر میں ناگ پھنی اور تھوہر کے گنجان درختوں میں رک گیا۔ یہیں پر وہ آسیب زدہ جوہڑ بھی تھا جس میں چند دن پہلے ہم نے شان دار جرمن جیپ کو غرقاب کیا تھا۔ عمران بولا۔ ''یہاں کیوں رک گئے ہو؟ ابھی کوئی جن بھوت آ کر کہے گا، السلام علیکم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں اور یہاں گھاس پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو چٹنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کاشت کاروں والی ''کسّی'' کندھے سے اُتار کر ایک طرف رکھی اور بیٹھ گیا۔

عمران نے آنکھیں نکالیں۔ ''اوئے، تم تو سچ مچ بیٹھ گئے ہو۔ کیا واقعی مرنے کا ارادہ ہے؟''

میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ چونکا۔ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر خود بھی ''کسّی'' ایک طرف رکھ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس مشکوک جوہڑ کی طرف کوئی آئے گا نہیں...... دیگر خطرات سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس ہتھیار موجود تھے۔ عمران کی بھاری چادر کے نیچے وہی دور مار رائفل تھی۔ میرے تہ بند کی ڈب میں ریوالور تھا اور جیب میں وہی نارفی چاقو جس نے جارج گورا کے عروج کو دائمی زوال دیا تھا۔

عمران نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے یار! دو تین دن سے تمہاری بتی گل ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گہرے اندھیرے میں اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''کچھ بولو یار! ہم بھی ایک دوسرے کو نہ بتائیں گے تو اور کون بتائے گا۔ اچھا...... چلو یہی بتا دو کہ یہاں کیوں رکے ہو؟''

''اس لئے کہ ہم نے آگے نہیں جانا۔ آج رات یہیں رکنا ہے۔''

''یہیں رکنا ہے؟ وہ کیوں؟''

''میں ایک بندے کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''کون بندہ؟''

''آفتاب خاں.....'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ دکھ کے بوجھ سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''آفتاب خاں؟ اس نے کیا کیا ہے؟''

''وہ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا......اور شاید تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔'' مجھے اپنی آنکھیں نم محسوس ہوئیں۔

عمران ایک ایسا دوست تھا جس کو میں اپنی ہر غمی خوشی میں شریک کر سکتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی پردہ ہی نہیں ہے لیکن آج عمران سے سلطانہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے حوصلہ جمع کیا اور دل فگار لہجے میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو اب تک صرف میں جانتا تھا۔

گہری تاریکی میں، مَیں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کا چہرہ بھی حیرت کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کئی سوال جواب کئے......اور آخر میں وہ بھی اسی گومگو کی کیفیت میں چلا گیا جس میں، مَیں تھا۔ سلطانہ کے سابقہ کردار کی طرف دیکھتے تھے تو سب جھوٹ لگنے لگتا تھا، نگاہ کا فریب محسوس ہوتا تھا.....مگر واقعات کی گواہی کچھ اور کہانی سناتی تھی۔

عمران نے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''......تو تمہارا خیال ہے کہ آج رات سلطانہ، مندر سے آفتاب خاں کے ساتھ نکلے گی اور کسی قریبی گھر میں جائے گی۔''

''یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دس بجے کے بعد سے مندر کے آس پاس موجود رہیں تاکہ ہمیں آفتاب کے آنے اور جانے کا پتا چلے۔''

عمران نے ماتھا ہاتھ میں پکڑ لیا اور کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ اب نو بجنے والے تھے۔ وہ بولا۔ ''اگر ہمیں مندر کی طرف ہی جانا ہے تو پھر اُٹھ جائیں۔ دس پندرہ منٹ پہلے کیا اور بعد میں کیا۔ جاتے جاتے بھی آدھ گھنٹا تو لگ ہی جانا ہے۔''

میں نے کسّی اُٹھائی۔ پگڑی درست کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ عمران بھی اُٹھ گیا۔ وہ ایک دم پژمردہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم مجھے حوصلہ دینا بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ میرے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''گھبراؤ نہ تابی! جو ہوگا ہمارے لئے اچھا ہی ہوگا اور پتا نہیں کیوں اب بھی میرا ذہن اس ساری صورتِ حال کو مان نہیں رہا ہے۔''

ہم گھنے درختوں میں چلتے ہوئے جوہڑ سے واپس روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے میں ہم واپس مندر کے آس پاس پہنچ گئے۔ آسمان پر ہلکا سا ابر تھا جس کے سبب تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی تھی۔ فتح پور کی زیادہ تر روشنیاں اب بجھ چکی تھیں۔ گلیوں میں ہلکی دھند تھی اور آوارہ کتوں کا شور تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان ایک مناسب جگہ دیکھی اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ قریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب ہمیں ایک روشنی مندر کی طرف آتی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے وہ روشنی مندر کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ یہ یقیناً آفتاب خاں ہی تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ چند لمحے بعد غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ آفتاب کا ہیولا سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد ہیولا اوجھل ہو گیا۔ وہ مندر میں جا چکا تھا۔

اب انتظار پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگیا۔ نصف شب کے سناٹے کا فائدہ اُٹھا کر آفتاب مندر کے اندر تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں طول پکڑتی گئیں۔ ایک ہی جگہ سردی میں بیٹھے بیٹھے جسم اکڑنا شروع ہوگیا تھا۔ میں تو ایسی سختی کا کچھ عادی ہوگیا تھا لیکن عمران اس موسم کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ انتظار ختم ہوا۔ مندر کا دروازہ کھلا اور سیڑھیوں پر حرکت نظر آئی۔ اس مرتبہ آفتاب کے ہیولے کے ساتھ دو اور ہیولے بھی تھے۔ ایک ہیولا واضح طور پر عورت کا تھا اور یہ یقیناً سلطانہ ہی تھی۔ اس نے خود کو سرتاپا چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ تینوں ہیولے سیڑھیوں سے اُترے اور انہی درختوں کی سمت بڑھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے خود کو لمبی گھاس اور گھنی شاخوں میں کچھ اور بھی ''کیموفلاج'' کر لیا۔ ہم سے قریباً پندرہ بیس میٹر کی دوری پر آ کر تینوں ہیولے جھاڑیوں میں ٹھہر گئے۔ میرے اندازے کے مطابق تیسرا ہیولا ہمارے دوست اقبال کا تھا۔ اس نے سلطانہ کو کندھے سے تھاما ہوا تھا اور وہ تھوڑا سا جھکی ہوئی تھی جیسے تکلیف میں ہو۔ آفتاب کی مدھم آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ بس دو منٹ یہاں رکیں۔ ام اس سامنے والے احاطے سے بائیسکل لے کر آتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد اقبال کی جانی پہچانی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ سلطانہ کو تسلی دے رہا تھا۔ ''کچھ نہیں بھابی! پیٹ کا معمولی درد ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آفتاب بتا رہا ہے،

بڑا سیانا حکیم ہے۔ پورا علاقہ مانتا ہے اسے۔"

سلطانہ شاید ہولے سے کراہی تھی۔ پھر اس نے ایک بوتل میں سے دو گھونٹ پانی پیا۔

اسی دوران میں آفتاب خاں بھی سائیکل لے کر آ گیا۔ اقبال نے سلطانہ کو سہارا دے کر سائیکل کے چوڑے کیریئر پر بٹھایا۔ اس کی مدھم ہائے ہائے سنائی دی۔ اقبال نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ اجوائن اور سونف کا پانی ہے۔ دو دو گھونٹ پیتی جائیں اس سے فائدہ ہوگا۔"

آفتاب خاں سائیکل پر سوار نہیں ہوا بلکہ اسے یونہی چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا...... اقبال تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا پھر واپس مندر کی طرف چلا گیا۔ اب ہمارے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہیں کھڑے رہتے۔ ہم درختوں میں سے نکلے اور ایک محفوظ فاصلے سے بائیسکل کا پیچھا کرنے لگے۔ سلطانہ بدستور کیریئر پر تھی اور آفتاب اسے پیدل دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ یقین کرنا تو مشکل تھا کہ سلطانہ واقعی بیمار ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ اس ڈرامے کا حصہ لگتا تھا جس کے کچھ سین میں پچھلے تین چار روز سے دیکھ رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ اور آفتاب خاں نے مندر سے باہر آنے کے لئے بیماری والا کھیل کھیلا ہے۔ اقبال کو تو خواتین کی حفاظت کے لئے مندر میں ہی رہنا تھا۔ آ جا کے آفتاب خاں ہی تھا جو ناگہانی تکلیف کی صورت میں سلطانہ کو کسی معالج کے پاس لے جا سکتا تھا۔ اب یہ "تکلیف" کیا تھی، اس کا "علاج" کیا تھا اور معالج کون تھا، اس کا پتا تو آنے والی گھڑیوں میں ہی چل سکتا تھا۔ کچھ آگے جا کر آفتاب خاں نے اپنی لالٹین روشن کی اور سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا لی۔ حفاظت کے لئے اس کے پاس اپنی رائفل بھی موجود تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ گھنے درختوں میں سفر نہیں کر رہا تھا۔ لالٹین روشن ہونے سے ہمیں تعاقب میں مزید آسانی ہوگئی اور ہم نے احتیاطاً اپنا اور آفتاب خاں کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔

یہ سفر بغیر کسی وقفے کے جاری رہا اور میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا کہ آفتاب اور سلطانہ کی منزل کہیں آس پاس ہی ہے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اپنے مقامِ آغاز سے تقریباً پانچ میل آگے آ چکے تھے...... یہاں ان دونوں نے آدھ گھنٹے کا وقفہ کیا اور ایک بار پھر چل پڑے۔ سفر کی شکل اب بھی وہی تھی۔ سلطانہ سائیکل کے کیریئر پر تھی اور آفتاب پیدل چل رہا تھا۔ جس قسم کے راستے تھے، وہ سوار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سفر کا یہ دوسرا دورانیہ اندازاً ایک گھنٹے کا رہا۔ نہایت ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح صادق کا وقت قریب آ گیا ہے۔

سلطانہ اور آفتاب کا یہ دوسرا قیام گھنی خودرو جھاڑیوں میں ہوا۔ ہم ابھی تک بڑی کامیابی سے تعاقب کر رہے تھے۔ ہم اب بھی ان دونوں کے زیادہ قریب نہیں گئے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کی وجہ سے تاریکی ذرا کم محسوس ہونے لگی تھی۔ عمران نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آفتاب، سائیکل کے پاس اکیلا کھڑا ہے۔"

"سلطانہ کہاں ہے؟"

"شاید اپنی کسی ضرورت کے لئے درختوں میں گئی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سلطانہ کے ہیولے کو خودرَو جھاڑیوں اور درختوں میں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ اپنے کپڑے بدلنے کے لئے جھاڑیوں میں گئی تھی۔ اب اس کے جسم پر ہندولڑکیوں کی طرح لہریےدار ساڑھی تھی۔

آفتاب اور سلطانہ کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ اب وہ دونوں ہی سائیکل کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اجالا ہونے کی وجہ سے تعاقب ہمارے لئے دشوار ہو گیا تھا لیکن یہ دشواری تا دیر برقرار نہیں رہی۔ اچانک ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایک بڑے مندر کا کلس دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بھجن کی آواز بھی کانوں میں پڑنے لگی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی میں کافی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مختلف رنگوں کے جھنڈے لہراتے نظر آئے...... اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی مذہبی تہوار ہے۔ یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مسلمان نہ ہونے کے برابر نظر آ رہے تھے۔ غالباً اردگرد کی چھوٹی موٹی بستیوں سے بھی لوگ یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہم سلطانہ کو دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنا نصف سے زیادہ چہرہ ساڑھی کے پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک ہندولڑکی نظر آتی تھی۔ ہمیں دور سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر لگتا ایسے ہی تھا کہ اس نے ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں وہ نتھ اور جھمکے وغیرہ آ گئے جو تہ خانوں میں آفتاب نے اسے دیئے تھے۔ کیا وہ چیزیں بھی سلطانہ کو صرف روپ بدلنے کے لئے دی گئی تھیں؟ صورتِ حال تشویش ناک تھی، پھر بھی میرے سینے میں خوش گوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ کچھ بھی تھا مگر سلطانہ کے حوالے سے میرا بدترین اندیشہ ماند پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم ایک شامیانے کی اوٹ میں چلے گئے اور ان دونوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگے۔ سلطانہ اب ہرگز بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے ایک عارضی دُکان سے پوجا کی کچھ چیزیں خریدیں اور اس طرف چلی گئی جدھر عورتوں کا ہجوم تھا۔ آفتاب خاں اب اس سے الگ تھلگ

ہو گیا تھا۔ مندر کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ مندر میں داخل ہونے کے لئے عورتوں اور مردوں کے علیحدہ علیحدہ راستے تھے۔ کم عمر بچے بھی عورتوں کے ساتھ تھے۔ اندر داخل ہونے کے لئے قطاریں بنائی گئی تھیں۔ سکیورٹی سخت تھی۔ عورتوں کی تلاشی لینے کے لئے عورتیں موجود تھیں۔ سلطانہ بھی ایک قطار میں لگ چکی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتی ایک ہندو عورت کی کلائیوں پر لال اور پیلی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ ہندو عورت کے کندھے سے لگا ہوا ایک شیر خوار بچہ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکرایا۔ پھر ماں بیٹا بھیڑ میں اوجھل ہو گئے۔

ہم نے دیکھا کہ آفتاب خاں ایک سائیکل مرمت والے کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ ہم بھی ایک قریبی چائے خانے میں گھس گئے۔ یہاں سے ہم آفتاب پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ساری سائیکل کھلوا کر اسے ''اوور آل'' کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یقیناً یہ بھی وقت گزاری کا ایک بہانہ تھا۔

''یہ تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے پیارے۔'' عمران نے چائے خانے کی خستہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں چکر تو کوئی اور ہی ہے۔'' میں نے تائید کی۔ میرے اندر خوشی اور دکھ کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ سلطانہ کے کردار کے حوالے سے جو جان لیوا شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، وہ اب باطل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نسبت سے میرے سینے میں پیدا ہونے والا گاڑھا سیاہ دھواں اب چھٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک دوسری طرح کے فکر و غم نے لے لی تھی۔ کچھ عرصے پہلے سلطانہ کے پاس سے ایک زہریلی پڑیا ملی تھی۔ اس پڑیا میں ویسا ہی نیلگوں زہر تھا جیسا زرگاں میں ہاشم رازی عرف ہاشو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ تب میرے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں سلطانہ کا تعلق بھی تو کسی طور پر ہاشو کی سرگرمیوں سے نہیں؟ آج کی صورتِ حال چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی کہ میرا وہ اندیشہ درست تھا۔

''مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔'' میں نے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ سلطانہ کسی بہت خاص مقصد سے اندر گئی ہے۔''

''کہیں یہ وہی زہر والا معاملہ تو نہیں؟'' میری آواز میں لرزش آ گئی۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس بارے میں ہمیں...... آفتاب خاں ہی بتا سکتا ہے۔''

''تو پہنچیں اس کے پاس؟''

''نہیں تابی! یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا۔ آفتاب خاں بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آتا رہا

ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس کے پاس جائے۔ دوسرا دور رہ کر ارد گرد کا جائزہ لے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ دیکھو، ان شامیانوں کے پیچھے گنے کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ تم کسی طرح آفتاب کو ان کھیتوں میں لے آؤ۔ میں بھی تمہارے آس پاس ہی رہوں گا۔''

تھوڑی سی تفصیل طے کر کے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں سیدھا سائیکلوں کی اس دُکان پر پہنچا جہاں آفتاب بیٹھا اپنی سائیکل سروس کرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ جلیبی کھا رہا تھا...... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ چند لمحوں کے لئے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اوہو، تابش بھائی! آپ یہاں؟ یہ ام...... کیا دیکھ رہا ہے؟''

''مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا...... تم یہاں کیسے؟'' میں نے کہا۔

''ام نے یہاں ایک بندے کو ادھار پیسا دیا ہوا ہے۔ اس سے لینے آیا تھا۔ یہاں اس میلے میں یہ سائیکل کا دُکان دیکھا تو سوچا کہ سائیکل کو بھی ٹھیک ٹھاک کرا لے لیکن...... لیکن آپ تو ہنومان گاؤں گیا تھا نا۔ خو، اس کا راستہ تو نالے کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔''

میں نے آواز دبا کر کہا۔ ''نالے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہے تھے مگر راستے میں گڑبڑ ہو گئی۔ کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ شاید زرگاں کے ہی تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس طرف کو نکلے ہیں۔''

''عمران بھائی کہاں ہے؟''

''وہ سامنے کھیتوں میں۔ اسے تھوڑی سی چوٹ بھی لگ گئی ہے۔''

آفتاب خاں بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یقیناً اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور آفتاب خاں گنے کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ یہ آٹھ دس فٹ اونچے کھیت تھے۔ ''کہاں ہے عمران بھائی؟'' آفتاب نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔

میں نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ریوالور نکال لیا۔ آفتاب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''خبردار آفتاب! اپنے ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو...... اور نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ارد گرد کے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور عمران بھی وہاں آ گیا۔ اپنی گرم چادر کے نیچے اس نے رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت رکھی ہوئی تھی۔ آفتاب سمجھ گیا

کہ معاملہ سنگین ہے۔ ''نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے پھر پھنکار کر کہا۔

اب آفتاب کا رنگ سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ بہرحال، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ عمران نے بھی دور مار رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ میرا ریوالور پہلے سے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے آفتاب کی پھولی ہوئی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک شکاری چاقو، نسوار کی ڈبیا، تھوڑی سی کرنسی اور چند کاغذ نکلے۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ چھوٹی نال والی رائفل میں نے اُتار لی اور دور پھینک دی۔

''امارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ یہ سب کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''ام نے کیا کیا ہے؟''

''سلطانہ، اندر کیا کرنے گئی ہے؟'' عمران نے رائفل آفتاب کے سر سے لگا کر پوچھا۔

آفتاب ایک بار پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہم دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا...... عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ تہ خانوں کے اندر اور تہ خانوں سے باہر جو کچھ ہوا ہے، وہ ہم دیکھتے رہے ہیں۔ جب تم ''بیمار'' سلطانہ کو سائیکل پر بٹھا کر فتح پور سے روانہ ہوئے تھے، تب بھی ہم تمہارے پیچھے تھے۔ اب کوئی سوال نہ کرنا۔ بس جواب دینا...... سلطانہ کو تم نے کس کام سے اندر بھیجا ہے؟''

''ام نے نہیں بھیجا۔ وہ خود گیا ہے۔ وہ خود جانا چاہتا تھا۔'' آفتاب خودسری کے انداز میں بولا۔

''کیوں جانا چاہتی تھی وہ؟''

''ام نہیں جانتا...... اور اگر جانتا بھی ہوتا تو تم کو نہ بتاتا۔'' آفتاب کا لہجہ اب واشگاف ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو ہراس نظر آیا تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔

''تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو ہم دوسری طرح پوچھیں گے۔'' میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کیا۔

''آپ کا جس طرح مرضی پوچھو۔ ام اپنے باپ کا اولاد ہی نہیں اگر تم کو ایک لفظ بھی بتائے۔'' آفتاب کا انداز مزید آتشیں ہو گیا۔ اب وہ سرتاپا ایک خردماغ پٹھان نظر آتا تھا۔

''اور ام تم کو ایک اور بات بتا دے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔ اگر تم زیادہ واویلا کرے گا تو پھر سلطانہ بی بی کا جان بھی چلا جائے گا۔ یہ لوگ اس کا بوٹیاں نوچ لے گا۔ بہتر ہے کہ جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو اور یہ سب کچھ ہمارے فائدے میں بھی ہے۔''

''کس فائدے کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند سیکنڈ چپ رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زبان کھولے یا نہیں۔ پھر پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''کیا تم مسلمان نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل اس ظلم پر خون نہیں ہوتا جو یہ لوگ ام پر کر رہا ہے؟ کیا تم نے زرگاں میں جل کر مرنے والے بچوں کی آخری پکاروں کو بھلا دیا ہے؟ ان کا بدلہ لینا ام سب کا فرض ہے اور ام لیں گے۔''

عمران نے ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ اس نے گن کی نال جھکا دی اور بولا۔ ''ہماری سوچیں تم سے علیحدہ نہیں ہیں آفتاب! جو آگ تمہارے دل میں بھڑک رہی ہے، وہی ہمارے دل میں بھی ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ تم ہمارے ساتھی ہوتے ہوئے بھی ہم سے سب کچھ چھپا رہے ہو۔''

''اور یہی کچھ سلطانہ نے بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے اعتماد میں لے لیتی تو مجھے یہ دکھ نہ ہوتا۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ شاید تم نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''نہیں...... ام نے کسی کو مجبور نہیں کیا...... اور یہ سارا کام مجبوری کا ہے بھی نہیں۔ یہ تو اندر کی غیرت اور جوش کا کام ہے۔ یہ نہ زبردستی کروایا جا سکتا ہے، نہ زبردستی رکوایا جا سکتا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''اگر ہمیں دوست سمجھتے ہو آفتاب خان تو سب کچھ کھول کر بتا دو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں۔''

''ام کیا بتائے؟''

''تم اور سلطانہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہے ہو؟''

''ام نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ بس اندر کا جذبہ ہوتا ہے۔''

''اندر کا جذبہ تو ہمارے اندر بھی ہے...... لیکن ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔ تم نے کچھ کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی تمہیں راہ دکھا رہا ہے۔ ہمیں صاف بتاؤ آفتاب خاں! ہمیں لگ رہا ہے کہ تمہارے، سلطانہ اور ہاشو وغیرہ کے درمیان تعلق ہے۔''

آفتاب کے چہرے پر رنگ سا گزرا لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔ سنبھل کر بولا۔ ''ام ہاشو وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ام کو صرف اتنا پتا ہے کہ وہ سلطانہ بی بی کے گھر میں کام کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سوچ بھی امارے جیسا ہو مگر امارے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' آفتاب کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ ہاشو، سلطانہ، طلال، آفتاب شاید کسی ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، سلطانہ کتنے پیکٹ لے کر گئی ہے اندر؟''

''کک...... کون سے پیکٹ؟''

''زہر کے پیکٹ۔ جو پرشاد میں ملائے جانے ہیں۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''آ...... آپ پتا نہیں کیا بات کر رہے ہیں...... وہ کسی اور کام سے گیا ہے۔ خو، ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔''

مجھے لگا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ آفتاب کا کھوکھلا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اندر سے ہل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔ ''دیکھو، اگر تم ہمیں دوست نہیں سمجھو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ تمہیں بعد میں پچھتاوا ہوگا۔''

''آپ امارا دوست ہے لیکن اس بارے میں ابھی ام آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ ابھی یہ کام ہو لینے دو۔'' وہ اٹل آواز میں بولا۔ اس کے اندر وہی سختی موجود تھی جو انتہا پسند گروہوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی خاموشی برقرار رکھنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے اور ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔

آفتاب کی تلاشی سے برآمد ہونے والی چیزیں ابھی عمران کے ہاتھ میں تھیں۔ ان میں دو تین تہ شدہ کاغذ بھی تھے۔ ایک رقعہ نما کاغذ پر عمران کی توجہ مبذول ہوگئی۔ اچانک مجھے لگا کہ آفتاب، عمران پر جھپٹے گا اور رقعہ نما کاغذ اس سے چھین لے گا۔ میں نے...... ریوالور کا رخ ایک بار پھر اس کے سر کی طرف کر دیا۔ ''آفتاب! اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ حرکت کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔''

عمران نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تحریر پڑھنا شروع کی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔ ''......ش تمہارے پاس آ رہا ہے۔ اس کے پاس دو تھیلی ہے۔ ایک اپنے پاس رکھو، دوسری کام میں لاؤ۔ چڑھاوے کا میلہ تین چار اور پانچ تاریخ کو ہوگا۔ ان میں سے کوئی تاریخ چن لو۔ عورتوں والے حصے میں جانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ س حلیہ بدل کر جا سکے گی۔ اس کا کام بس یہ ہوگا کہ وہ تھیلی گلزار تک پہنچا دے۔ گلزار ''میٹھا'' بانٹنے والی عورتوں کی کرتا دھرتا ہے۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ باقی کام وہ کرے گی۔''

یہ تحریر رونگٹے کھڑے کرنے والی تھی۔ تحریر میں موجود اشارے واضح تھے۔ تھیلی کا

مطلب زہریلے پاؤڈر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ س کا اشارہ سلطانہ کی طرف تھا۔ میٹھے سے مراد پرشاد تھا۔

یہ وہی بے رحم انتہا پسندی تھی جو ہم نے ہاشم عرف ہاشو میں دیکھی تھی۔ یہ اندھا جوش نہیں بھی ہوتا، کسی بھی مذہب، فرقے یا گروہ میں ہوتا، یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ چھوٹا سا بچہ آیا جو اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور بے وجہ شرمایا تھا۔ وہ بچہ صرف ایک بچہ تھا۔ ایک بے گناہ...... یہی بچہ پھر یہاں، زہر کھا کر مرنے والا تھا۔ اس بچے کو نہیں مرنا چاہئے تھا۔ یہ کوئی بھی تھا، یہ اس دنیا کا ''کل'' تھا۔ یہ امید کی کرن تھا یہ آس کی ڈور تھا۔ میں یا آفتاب خاں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے تھے کہ کل یہ بچہ، خدا کا نام لیوا نہیں ہوگا، یہ سچائیوں کا علم نہیں اُٹھائے گا، کہنہ عقیدوں کو نہیں توڑے گا اور زخموں کا مرہم نہیں بنے گا۔ ہم اسے مرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے آفتاب خاں، ہاشو، کھوسٹ بڑھیا اور ستیش میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔

عمران نے میری اور میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے۔ سلطانہ جو میری بیوی تھی، جو میرے سانسوں میں بستی تھی، مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔ اس کے لباس میں زہر چھپا ہوا تھا۔ یہ زہر پرشاد میں ملایا جانے والا تھا، یا ملایا جا چکا تھا۔ ہم حرکت میں آتے تو سلطانہ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ نہ آتے تو بے شمار عورتیں اور بچے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ حرکت میں آنا ضروری تھا۔

اچانک بندوق کا زوردار فائر سنائی دیا۔ یہ فائر مندر کے عین سامنے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ چلائے۔ ایک سیکنڈ کے لئے...... صرف ایک سیکنڈ کے لئے میری اور عمران کی توجہ اس دھماکے کی طرف گئی، آفتاب نے فائدہ اُٹھایا اور اُٹھ کر تیزی سے فصل میں گھس گیا۔ ''رک جاؤ۔'' عمران دہاڑا۔

اس نے رائفل سیدھی کی مگر فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر آفتاب اونچے گنوں کے اندر کافی آگے پہنچ چکا تھا۔ اس کا پیچھا کرنا بے سود لگا۔ ہم واپس پلٹے اور اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوئے جس نے مندر کے سامنے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لوگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بدک گئے تھے اور وہ خالی ہی ایک طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کسی کو لپک کر اس گھوڑا گاڑی میں آ گھستے دیکھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ مجھے سبز اوڑھنی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سلطانہ کی اوڑھنی بھی سبز تھی۔

عمران نے بھی سبز اوڑھنی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے بھی وہی شک ہوا جو مجھے ہوا تھا۔
کیا اس بھگٹٹ دوڑتی ہوئی خالی گھوڑا گاڑی میں سلطانہ داخل ہوئی تھی؟ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی نے تیزی سے یوٹرن لیا اور گھوڑا گاڑی کے پیچھے روانہ ہوئی۔ چار پانچ مقامی افراد چھلانگیں لگا کر اس ٹریکٹر ٹرالی پر چڑھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا اور دوڑتی ہوئی ٹرالی پر چڑھ گئے اور اکیلی یہ ٹریکٹر ٹرالی ہی نہیں تھی جو گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکی تھی اور دو تین گھوڑا گاڑیاں اور گھڑ سوار بھی گھوڑا گاڑی کو روکنے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا گاڑی میں سبز اوڑھنی والی عورت گھسی ہے اور یقیناً یہی عورت مندر میں ہنگامے کی ذمے دار تھی۔ اب ہمارے لئے اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں گھسنے والی سلطانہ تھی۔
گھوڑا گاڑی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی دونوں طرف مکئی اور گنے کے بلند کھیت تھے۔ وہ کافی آگے نکل گئی تھی۔ بھاری بھرکم ٹریکٹر ٹرالی کو اس کا پیچھا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پیچھے سے آتے ہوئے گھڑ سواروں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ ''رستہ دو۔''
ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو راستے کے بائیں کنارے پر کر لیا۔ یوں گھڑ سواروں کو تیزی سے آگے جانے کا موقع مل گیا۔ ہماری بوسیدہ ٹرالی اور دیگر دو گھوڑا گاڑیوں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔

ٹرالی پر سوار افراد بھی دیگر لوگوں کی طرح مشتعل نظر آتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسی گاڑی میں گھسی ہے وہ۔''
دوسرا شخص بولا۔ ''اس کے پاس چاقو تھا۔ میں نے اسے چاقو چلاتے دیکھا ہے...... جیادہ عمر کی بھی ناہیں ہے۔ لڑکی سی لگتی ہے۔''
ایک اور آواز آئی۔ ''ایسی گندی ناری کو کون ہندو کہے گا۔ مندر میں گھس کر فساد کرت ہے۔ یہ تو ہندو کے بھیس میں کوئی راکھشس لگت ہے۔''
''اس نے کیا کیا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔
''ابھی پکڑی جاوے گی تو پتا چل جاوے گا۔''
ایک نوجوان نے کلہاڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ ہمارے کندھوں پر رکھی ہوئی ''کسیاں'' ہمارے بہروپ کو پختہ کر رہی تھیں۔ ٹرالی کے

اگلے حصے میں کھڑا ایک پنڈت نما شخص بولا۔ ''یہ زنانے حصے کی طرف سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی۔ دو تین گوپیاں اس کے پیچھے تھیں اور پکڑو پکڑو کی دہائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے پجاری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے چاقو چلا دیا۔ پھر دو اور بندوں کو بھی گھائل کیا اور باہر نکل آئی۔''

میں نے عقب میں دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ایک دو گاڑیاں اور چند مزید گھڑ سوار بھی اس تعاقب میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہی وقت تھا جب سب سے آگے بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں سے اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ یہ فائر ان گھڑ سواروں پر کئے گئے جو اس تعاقب میں سب سے آگے تھے اور گھوڑا گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بڑے کارگر فائر ثابت ہوئے۔ پہلی گولی تو براہِ راست گھڑ سوار کو لگی۔ ہم نے اسے گھوڑے سے الٹ کر کچے راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھا۔ دوسری گولی نے ایک گھوڑے کو ''ہٹ'' کیا۔ گھوڑا بدک کر اچھلا اور پھر مکئی کے کھیتوں میں گھس کر ہنہنانے اور گول گول چکرانے لگا۔
تعاقب کرنے والے گھڑ سوار بری طرح ٹھٹک گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مسلح نہیں تھا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ گھوڑا گاڑی سے اپنا فاصلہ بڑھا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری ٹریکٹر ٹرالی کے آس پاس آ گئے۔ دو چار گھڑ سوار رک گئے اور راستے کے کنارے پر پڑے اس موچھیل گھڑ سوار کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے جو گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولی کا شکار ہوا تھا۔
''لگتا ہے کہ کمینی گاڑی میں اکیلی ناہیں ہے۔'' ایک شخص پھنکارا۔
''لیکن گھسی تو اکیلی ہی تھی۔''
''ہو سکت ہے کہ کھیتوں میں سے نکل کر اس کا کوئی یار بھی گھس گیا ہو اندر۔'' پنڈت نما شخص نے خیال ظاہر کیا۔
میرا دھیان سیدھا آفتاب خاں کی طرف چلا گیا۔ اس واقعے سے ایک منٹ پہلے آفتاب موقع سے فائدہ اُٹھا کر کھیتوں میں بھاگ نکلا تھا۔ عمران اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سلطانہ کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ بھی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا ہو؟
میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی شاید اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔
تعاقب طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر ٹرالی بری طرح ہچکولے کھا رہی

تھی۔ ہچکولوں کی وجہ سے پنڈت نما شخص دو بار فرش پر لڑھکا اور کھڑا ہوا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر جوش کے ساتھ ساتھ ہراس بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ گھوڑا گاڑی میں سے ان پر فائرنگ کی جائے گی۔ وہ سب کے سب کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔

ہمیں صرف ایک گھڑسوار کے کندھے پر رائفل نظر آ رہی تھی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ بھاگتے گھوڑے پر سے فائر کر سکتا۔ ویسے بھی وہ زیادہ باہمت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کافی پیچھے آ گیا تھا۔ دوسری رائفل ایک تنومند شخص کے پاس تھی اور وہ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھا۔ یہ گھوڑا گاڑی ٹرالی سے بھی پیچھے تھی۔ تنومند شخص اپنی رائفل کو ٹھیک سے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

یوں یہ تعاقب طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا...... اگلے پندرہ منٹ میں فرار ہونے والی گھوڑا گاڑی میں سے پستول کے چار فائر مزید ہوئے۔ تین فائر تو ہوائی تھے اور گھڑسواروں کو ڈرانے کے لئے کئے گئے تھے لیکن چوتھا فائر سیدھا تھا۔ یہ اس گھڑسوار کے عین سر میں لگا جو دلیری دکھا کر گھوڑا گاڑی کے زیادہ قریب آ گیا تھا۔ یہ گھڑسوار گولی کھا کر بھی گھوڑے کی پشت سے ہی چپکا رہا لیکن وہ زندہ حالت میں نہیں تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد وہ ریت کی بوری کی طرح گھوڑے سے لڑھک گیا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولیوں نے دو افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ نشانے کی درستگی اس شبہے کو تقویت دے رہی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں دوسرا فرد شاید آفتاب خاں ہے۔ دوسرے گھڑسوار کے شکار ہونے کے بعد پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی سے تنومند رائفل بردار نے چار فائر کئے مگر یہ بے مقصد فائر تھے۔ رائفل اور نشانے کے درمیان ٹریکٹر ٹرالی اور دو گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ وہ شخص درست نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا......

یہ عجیب و غریب تعاقب قریباً ایک گھنٹا مزید جاری رہا۔ راستے میں بھی کچھ گھڑسوار تماشا دیکھنے کے لئے اس تعاقب میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑے اب ہانپنا شروع ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑا گاڑی کی رفتار بھی سُست پڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پندرہ بیس منٹ یہ سلسلہ مزید جاری رہا تو گھوڑے بے دم ہو جائیں گے۔ تعاقب کرنے والے بھی شاید اسی وقت کے منتظر تھے...... مگر پھر جو کچھ ہوا اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔

ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ یہ چند سو نفوس پر مشتمل کوئی کچا پکا گاؤں تھا...... گاؤں

کے درمیان سے گزرتے گزرتے گھوڑا گاڑی نے ایک دم موڑ کاٹا اور سیدھی ایک نیم پختہ احاطے میں گھس گئی۔

تعاقب کرنے والے رک گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی کی رفتار سُست ہوئی پھر وہ بھی ٹھہر گئی۔ گھوڑا گاڑی جس احاطے میں داخل ہوئی تھی، اس کے آخر میں آٹھ دس نیم پختہ کمرے اور برآمدے نظر آ رہے تھے۔ چھت پر پانی کی گول پختہ ٹینکی بھی تھی۔ دیکھنے میں یہ کوئی اسکول لگتا تھا مگر پھر میری نظر لکڑی کے پھاٹک کے قریب لگے ایک بورڈ پر پڑی یہ ایک شفاخانہ تھا۔ اس کے ایک علیحدہ پورشن میں شاید جانوروں کا علاج بھی ہوتا تھا۔ ہم کافی فاصلے پر تھے پھر بھی احاطے میں بندھے ہوئے مویشی اور خچر وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے اپنی اپنی سواریوں سے اُترے۔ افراتفری کے عالم میں انہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہی وقت تھا جب عمارت کے اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ تب ہم نے ایک حواس باختہ عورت کو عمارت کے اندر سے بھاگ کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور نہ ہی پاؤں میں چپل۔ ابھی وہ احاطے کے وسط میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ عقب سے دو فائر ہوئے اور وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئی۔ اس جواں سال عورت کے نیلگوں لباس کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اس طرح کا وردی نما لباس میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس عورت کو عمارت سے نکل کر بھاگنے کی سزا دی گئی ہے۔ سزا دینے والا آفتاب خاں بھی ہو سکتا تھا۔

چار پانچ منٹ کے اندر اس پُرسکون بستی میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ عمارت کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کچھ آس پاس کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ کھڑکیوں میں بھی ڈرے ڈرے چہرے نظر آنے لگے۔

میں اور عمران بھی کچھ قریب چلے گئے۔ کھلے ہوئے پھاٹک میں سے ہمیں وہ گھوڑا گاڑی نظر آ گئی جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے پانی اور گھاس کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے بدترین اندیشے درست ہیں۔ آفتاب خاں اس عمارت میں ہی موجود تھا۔ ہم نے چھت پر اس کی جھلک دیکھی۔ وہ بھاگ کر پانی والی ٹینکی کے پیچھے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف نظر آئی۔

''یہ تو وہی ہے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''اور اس کا مطلب ہے کہ سلطانہ بھی اندر ہی ہے۔''

''یہ تو بڑا خطرناک کام ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اب انہیں چھوڑیں گے نہیں۔'' عمران نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

عمران کی بات سو فیصد درست تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو ہمارے سامنے گر چکی تھیں۔ دو راستے میں اور تیسری یہاں احاطے میں۔ اس کے علاوہ کہا جا رہا تھا کہ بھاگنے والی عورت نے مندر میں بھی چاقو چلایا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہاں بھی کوئی موت ہوئی ہو۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے کندھوں پر ''کسیاں'' تھیں۔ ہم دیہاتیوں کے لباس میں تھے اور ہجوم کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہم نے ابھی تک سلطانہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اب بھی دل میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ شاید سلطانہ اس خرد ماغ قاتل پٹھان کے ساتھ نہ ہو۔

میں نے کہا۔ ''سوچنے کی بات ہے کہ آفتاب کے پاس رائفل کہاں سے آئی؟ ہم نے تو اس کی رائفل کھیت میں پھینک دی تھی...... سلطانہ کے پاس بھی کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ اسے اس عمارت کے اندر سے ہی ملی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، آفتاب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ وہ بھاگ کر اسی جگہ گھسے گا؟''

''لگتا تو نہیں۔'' عمران نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''تم نے دیکھا ہی ہوگا، گاڑی نے سیدھا چلتے چلتے ایک دم موڑ کاٹا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آفتاب نے اندازہ لگایا تھا کہ گھوڑے اب زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔''

''ایسے علاقے میں ایسی صاف ستھری عمارت کا ہونا بھی حیران کن ہے۔ مجھے تو ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ایک جواں سال دیہاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے گلے میں کئی تعویذ تھے اور وہ حلیئے سے کھیت مزدور ہی لگتا تھا۔ بہت سے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور دیوار کی اوٹ سے بار بار شفا خانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس صاف نظر آتا تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے مقامی لہجے میں کہا۔ ''یہ کوئی اسپتال ہے بھیا؟''

''ہاں بھیا! اندر مریج بھی ہیں۔ تیس چالیس تو جرور ہوں گے۔ چھوٹے بچے بھی ہیں اور خود بڑے ڈاکٹر جی اور ان کے ملاجم بھی۔''

''اوہو۔'' میں نے حیرت ظاہر کی پھر عام لہجے میں پوچھا۔ ''بڑے ڈاکٹر جی کون ایں؟''

''پتا نا ہیں۔ ہم ان کو بس بڑے ڈاکٹر جی ہی کہوت ہیں۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

''قریب کھڑا ایک دوسرا شخص بولا۔'' جاپانی ڈاکٹر ہیں۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ان کا نام لی وان تو نا ہیں؟''

''ہاں، اسی طرح کا ہے۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔ ''ہر مہینے تین روج کے لئے یہاں آتے ہیں۔ بڑا لمبا سفر کرتے ہیں۔ بھگوان ان کی اور ان کے ملاجموں کی رکھشا کرے۔'' ...ہاتی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے وسط میں پڑی لاش پر جم گئیں۔

''یہ کون ہے جس کو گولی لگی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے ڈاکٹر جی کی ملاجم ہے۔ زبیدہ نام ہے۔ ہمارے گاؤں ہی کی ہے۔ بڑی اچھی ...رت تھی۔'' دیہاتی کی آواز بھرا گئی۔

دراصل اس عورت کی نیلگوں وردی دیکھ کر ہی مجھے شک گزرا تھا کہ ایسا لباس میں کہیں ...لے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ جب میں نل پانی میں تھا تو ڈاکٹر مجھے لے ...اکٹر لی وان کے شاندار اسپتال میں گیا تھا۔ تب اس نے لی وان سے میری الیکٹرک ... کے بارے میں ڈسکشن کی تھی۔ وہیں اسپتال میں، مَیں نے ایسے کپڑوں والی دو تین ...یں دیکھی تھیں۔

اچانک چھت پر سے بڑی گھن گرج کے ساتھ رائفل کے تین فائر ہوئے۔ لوگ سہم سہم ...ختلف چیزوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہمارے ساتھ بات کرنے والے دونوں دیہاتی بھی ... ہو کر نیچے بیٹھ گئے۔ کسی شخص نے پکار کر کہا۔ ''ڈاکو گولی چلا رہے ہیں۔ سب لوگن ...ہاں سے دور ہٹ جاویں۔ ورنہ نقصان ہو جاوے گا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب خاں نے لوگوں کو احاطے سے دور رکھنے کے لئے ہوائی فائر ...ہیں۔ وہ بڑی چابک دستی اور سفا کی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ...طانہ نے مل کر عمارت میں موجود مرد و زن کو یرغمال بنا لیا ہے اور کسی کو باہر نہیں نکلنے دے ...

...ورت حال میں بڑی تیز رفتار تبدیلیاں آئی تھیں جس نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ...ں بھی چکرا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہوگا۔

سلطانہ کا جو روپ میرے سامنے آیا تھا، وہ ناقابلِ تصور تھا۔ صرف ایک ہفتہ پہلے میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری باہوں میں آ کر اور آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے والی سلطانہ کو میں ایک نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار دیکھوں گا اور یہ صورتِ حال اس کی اپنی پیدا کردہ ہوگی...... میرا دل خون ہونے لگا تھا۔

آفتاب خاں کی پکارتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ بڑی پاٹ دار آواز میں بول رہا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی اس کے الفاظ صاف سنائی دیئے۔ اس نے جنونی لہجے میں کہا۔ ''ام تم لوگوں کو صاف بتاتا ہے، اگر کسی نے اندر آنے کا کوشش کی تو ام ان سب کو بھون ڈالے گا جو یہاں امارے پاس ہے۔ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسپتال کے پھاٹک اور دیواروں سے دور رہو، ورنہ اپنے نقصان کا تم خود ذمے دار ہوگا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' ایک اونچی پگڑی والے شخص نے پکار کر پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص اس ''اٹھرا'' نامی گاؤں کا مکھیا تھا۔

''بس فی الحال ام یہی چاہتا ہے کہ کوئی اندر آنے کا کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی ام سے بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اکیلا اندر آئے اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہئے۔''

ہمارے ساتھ ٹرالی پر سوار ہو کر یہاں آنے والا ایک شخص گرج کر بولا۔ ''تم ہتھیارے ہو۔ تم نے خون کئے ہیں۔ ہم تم جیسے حرامزادے سے بات کاہے کو کریں گے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالیں گے۔''

ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والے تنومند رائفل بردار نے ایک گندی گالی دی اور آفتاب خاں کی طرف اندھا دھند دو فائر کئے۔

گاؤں کا مکھیا تڑپ کر رائفل بردار کے سامنے آ گیا اور اسے مزید فائر کرنے سے روک دیا۔ وہ چلا کر بولا۔ ''یہ کیا کرت ہو تم؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اندر ہمری عورتیں اور بچے ہیں۔ ان کا جیون خطرے میں ہے۔''

دو تین مقامی افراد آگے بڑھے اور انہوں نے تنومند رائفل بردار سے زبردستی رائفل چھین لی۔ رائفل بردار بھی طیش میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑتے، عمران ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ''کیا کرت ہیں آپ لوگ۔ یہ جھگڑنے کا ناہیں، سوچنے کا وقت ہے۔ یہ ایک دم جنونی لوگن ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ کسی بھی وقت کچھ کر سکت ہیں۔ ہمیں ان سے بات کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ اصل میں کون ہیں اور کیا چاہت ہیں۔''

''کون بات کرے گا آگے جا کر؟'' مکھیا نے اردگرد دیکھ کر پوچھا۔

سب ٹھٹکے ہوئے نظر آئے۔ عمران ترت بولا۔ ''میں کرتا ہوں جی۔ یہ پٹھان لوگن ہیں اور مجھے تھوڑی بہت پشتو بھی آوت ہے۔''

مکھیا چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر عمران کے چہرے کا اعتماد دیکھ کر وہ بولا۔ ''اگر تم اپنی مرضی سے جانا چاہت تو چلے جاؤ۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی دُرگھٹنا ہوئی تو ہم ذمے دار ناہیں ہوں گے۔''

''ناہیں جی۔ آپ کی کوئی ذمے داری ناہیں۔ آپ بس پرارتھنا کریں۔''

''کیا بات کرو گے؟'' سانولی رنگت والے مکھیا نے پوچھا۔

''وہی جو آپ کرنا چاہت ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

چند سیکنڈ میں عمران نے مکھیا اور اس کے ساتھیوں کو شیشے میں اُتار لیا بلکہ ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والا پنڈت نما شخص بھی اس بات پر راضی ہو گیا کہ عمران اندر جائے۔ عمران نے اپنی چادر اُتار پھینکی اور پگڑی بھی کھول کر گلے میں ڈال لی۔ بہرحال چادر اُتارنے سے پہلے اس نے اپنی رائفل بڑی صفائی سے میری چادر کی بغل میں منتقل کر دی تھی۔ رائفل دو حصوں میں تھی، اس کا بیرل کھول دیا گیا تھا۔ اپنی دھوتی کو اچھی طرح اڑس کر وہ بڑے اعتماد سے احاطے میں داخل ہوا۔ چھت پر سے یقیناً آفتاب نے عمران کو دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ آفتاب کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے مقامی دیہاتیوں کے سامنے ہمارے بھانڈا پھوٹ جائے۔ بہرطور اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

چند سیکنڈ بعد آفتاب کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''قمیص اُٹھا کر دکھاؤ۔''

عمران نے قمیص اُٹھا کر دکھا دی۔

''دھوتی کھولو۔'' آفتاب نے چھت پر سے حکم صادر کیا۔

عمران نے اپنے میلے کچیلے تہ بند کے بند کھول کر دکھا دیئے۔ تہ بند کے نیچے زیر جامہ تھا۔

''ٹھیک ہے، آگے آ جاؤ۔''

عمران سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہو گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ آفتاب

اب دوست نہیں دشمن تھا۔ دو گھنٹے پہلے ہم نے اس پر رائفل تانی تھی۔ اب عمران اس کی رائفل کے نشانے پر تھا۔ ابھی تک یہ کنفرم نہیں تھا کہ آفتاب کے ساتھ صرف سلطانہ ہی ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی گھوڑا گاڑی سے نکل کر عمارت میں روپوش ہوا ہے۔ مجھے عمران کی صلاحیتوں اور اس کی ''لک'' پر بھروسا تھا۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی راستے نکال لیتا تھا۔ اسے گفتگو اور قائل کرنے کا فن آتا تھا مگر دوسری طرف بھی ایک نہایت سرپھرا شخص تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے یوں بیگانہ ہوا تھا جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ اب اس کے سر پر خون سوار تھا۔

عمران کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اب تقریباً پانچ چھ سو مرد و زن اس نیم پختہ عمارت کے گرد اور آس پاس جمع ہو چکے تھے۔ بہت سی لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور رائفلیں اپنی چمک دکھانے لگی تھیں۔ بہرحال، یہ سارے کے سارے مقامی دیہاتی تھے اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے میری اصل حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں جارج گورا کو عبرت ناک شکست دے کر اس کا پیٹ چاک کرنے والا شخص ایک، گرد سے اٹے ہوئے دیہاتی کے روپ میں ان کے درمیان موجود ہے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ عمران کو دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی۔ عمران پھاٹک سے گزر کر ہمارے درمیان آ گیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس کے تہ بند کی ڈب میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو پہلے نہیں تھی...... لیکن یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔ عمران نے گاؤں کے مکھیا بلرام اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ اندر ایک عورت اور دو بندے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان اور دوسرا مقامی لگتا ہے۔ دونوں کے پاس رائفلیں ہیں، اس کے علاوہ دھماکا خیز مواد بھی ہے۔ انہوں نے یہ دھماکا خیز مواد اسپتال کے اکلوتے وارڈ میں اس طرح رکھ دیا ہے کہ اسے کسی بھی وقت اڑایا جا سکتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر لی وان بھی اندر ہی ہے۔ وہ اور اس کی عملہ، حملہ آوروں کے قبضے میں ہے۔ سب کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔

''یہ لوگن چاہتے کیا ہیں؟'' مکھیا نے پوچھا۔

''پہلے تو وہ بات ہی ناہیں سن رہے تھے جی۔ پھر میں نے پٹھان سے پشتو میں بات کی اور اس کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ تھوڑے سے نرم پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے جانا چاہت ہیں۔ انہیں تازہ دم گھوڑوں کی ایک بڑی گھوڑا گاڑی

دی جاوے۔ اس کے علاوہ گھوڑا گاڑی کے دو فالتو گھوڑے دیئے جاویں...... اور وشواس دلایا جاوے کہ ان کا پیچھا ناہیں کیا جاوے گا۔ ایسا ہوگیا تو وہ چلے جاویں گے۔''

ہمارے ساتھ آنے والا پنڈت نما شخص تڑخ کر بولا۔ ''یہ ناہیں ہوسکت۔ ان لوگن نے ہمارے گاؤں کے کم از کم دو بندوں کا جیون لیا ہے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے ایک نردوش ناری کی ہتھیا کی ہے۔ اب یہ ہمیں الٹا دھمکا رہے ہیں اور یہاں سے نکل جانا چاہت ہیں۔''

مکھیا اور پنڈت نما شخص ایک بار پھر الجھ پڑے۔ مکھیا نے کہا۔ ''تم بدھی (عقل) کی بات ناہیں کر رہے ہو پنڈت۔ کیا تم یہ چاہت ہو کہ اگر تمہارے گاؤں کے بندے مارے گئے ہیں تو اس گاؤں کے بھی دس بیس بندے مارے جاویں؟ تم دیکھ رہے ہو ان لوگن کے سر پر خون سوار ہے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کو بند کر لیا ہے۔ یہ سب کچھ اڑا دیں گے تو پھر کیا ہووے گا؟ ہمیں اس بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیئے۔''

پنڈت نما شخص بولا۔ ''تم لوگن ضرورت سے زیادہ ڈر گئے ہو۔ دھماکے سے سب کو اڑا دینا اتنا آسان ناہیں ہے اور کیا پتا ان کے پاس بارود ہے بھی یا وہ کیول ڈراوا دے رہے ہیں۔''

عمران جلدی سے بولا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے جی۔ انہوں نے وارڈ میں دو تین جگہ کچھ رکھا ہوا ہے۔ کالے رنگ کے تار بھی بچھائے ہوئے ہیں۔ وہ بارود کے تار ہی ہوسکت ہیں۔ مجھے وشواس ہے جی......''

پنڈت نما شخص کا نام مہاویرا تھا۔ وہ بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے لیکن ہم کو جلد بازی ناہیں کرنی چاہیئے۔ ہم کو چاہیئے کہ ان لوگن کو کچھ دیر باتوں میں لگائیں اور ایک دو گھنٹے کا وقت گزاریں۔ اتنے میں ہم اپنے کچھ بندے ہنومان گاؤں کی طرف بھیجیں۔ وہاں چوکی موجود ہے۔ چوکی سے سپاہی یہاں آ سکت ہیں۔ ہوسکت ہے کہ اتنی دیر میں کسی دوسری جگہ سے بھی مدد آ جاوے۔ تب ان قاتلوں کے ساتھ اچھے طریقے سے معاملہ نمٹایا جاسکت ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن آپ لوگن نے میری آخری بات تو سنی ہی ناہیں۔''

''کیسی بات؟''

''ان کتوں نے ہمیں گھوڑا گاڑی دینے کے لئے صرف آدھ گھنٹے کا سمے دیا ہے اور اس سمے میں سے آٹھ دس منٹ گزر بھی چکے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر آدھ گھنٹے میں گاڑی ناہیں پہنچی تو وہ ایک بندے کو گولی مار کر باہر برانڈے میں پھینک دیویں گے اور پھر ہر پندرہ

منٹ بعد ایک بندے کی ہتھیار کرتے جاویں گے۔ پٹھان کے پاس گھڑی ہے اور اس نے گھڑی دکھا کر مجھے ٹائم بتایا ہے۔"

مہا ویرا اور مکھیا بلرام سمیت کئی افراد کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ "اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔" عمران نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کہوت ہیں کہ ہم یہاں سے جاتے وقت آٹھ دس بندوں کو ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب سمجھیں گے کہ محفوظ جگہ پر پہنچ گئے ہیں تو انہیں چھوڑ دیویں گے۔ ضمانتیوں میں کوئی عورت ناہیں ہووے گی۔ بڑا اور چھوٹا ڈاکٹر ہووے گا اور کچھ دوسرے بندے ہوویں گے۔"

مکھیا بلرام نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھا اور ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ابھی پنچایت میں مشورہ کرے گا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود پنچوں کو اکٹھا کیا اور حویلی کی طرف چلا گیا۔ لوگ عمران کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اس سے اندر کے حالات جاننا چاہ رہے تھے۔ عمران نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مکھیا اور دیگر لوگوں کو بتایا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال کو سنگین بتا رہا تھا۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ وہ اس سنگینی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ اس کا یہ انکشاف بھی مجھے مشکوک لگ رہا تھا کہ اندر آفتاب خاں کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔

کچھ دیر بعد جب عمران کے گرد سے بھیڑ چھٹی تو میں نے [illegible] لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا واقعی آفتاب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ایک نیوز چینل والا اپنی "خبر" دوسرے چینل کو نہیں دیتا، اپنی جان دے دیتا ہے۔"

"لیکن میں چینل والا نہیں ہوں۔"

"کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چینل والا ہے یا نہیں۔ آج کل تو اینٹ اکھاڑیں تو نیچے سے کیمرے والا اچھل کر باہر آ جاتا ہے۔ ناظرین کم پڑتے جار[illegible]، چینل زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر اینکر ایک ہی دہائی دے رہا ہے، ہمارے ساتھ رہیے گا۔ اب تو بچے بھی اور کھیلوں کی جگہ چینل چینل کھیلتے نظر آتے ہیں۔ دیکھنا بہت جلد ہر فیملی کا اپنا اپنا چینل ہوگا۔ فیملی کا سربراہ ہی اس کا ڈائریکٹر کہلائے گا۔"

"تم بکواس ہی کرو گے یا کچھ بتاؤ گے؟"

"میں بتاؤں گا، تب بھی تم کہو گے کہ بکواس کر رہا ہے۔"

"نہیں کہتا۔"

"آفتاب خاں اکیلا ہے۔" عمران نے خلافِ توقع سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ صرف سلطانہ ہے۔ سلطانہ نیچے ہے۔ آفتاب چھت پر ہے۔ چھت پر ایک روشن دان ہے۔ اس روشن دان کے نیچے مریضوں سے بھرا ہوا وارڈ ہے۔ آفتاب اوپر سے کسی بھی مریض کو یا اس کے لواحقین کو شوٹ کر سکتا ہے...... وہ بالکل جنونی نظر آ رہا ہے۔"

"بارود والی جو بات تم نے کی ہے؟"

"وہ بھی درست نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ دباؤ میں آئیں اور آفتاب کو یہاں سے نکلنے کا راستہ دینے میں دیر نہ کریں۔ آفتاب کے پاس بس ایک رائفل ہے اور اس کے پچاس ساٹھ راؤنڈز ہیں۔ یہ رائفل اس نے یہیں اسپتال کے چوکیدار سے چھینی ہے۔"

"کیا تم نے سلطانہ کو دیکھا ہے؟"

"نہیں لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ آفتاب کے ساتھ سلطانہ ہی بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ عمران کی اس اطلاع کے بعد یہ امید دم توڑ گئی کہ شاید اس ماردھاڑ میں شریک ہونے والی سلطانہ نہ ہو۔ سینے میں اندھیرا سا اُتر گیا۔

"سلطانہ کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آفتاب نے بتایا نہیں مگر لگتا ہے کہ ہتھیار ہے۔ ورنہ وہ اسے نیچے اکیلا چھوڑ کر اوپر نہ آتا۔"

"آفتاب کا رویہ کیسا رہا ہے تمہارے ساتھ؟"

"وہی جو دشمن کا دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دم غیر نظر آ رہا ہے۔ اس نے مجھے خود سے پندرہ بیس فٹ دور رکھا ہے اور تمام وقت رائفل مجھ پر تانے رکھی ہے۔ پہلے تو وہ کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ صرف مرنے اور مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پر میں نے کوشش کی اور اس کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی وقت ہے، وہ سلطانہ کے ساتھ یہاں سے نکل سکتا ہے۔ ابھی اس کے گرد صرف مقامی لوگ ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد جب حکم کے کارندے اور زرگاں کے مسلح گارڈز اپنے جدید اسلحے کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تو اس کے لیے اپنی کوئی شرط منوانا ناممکن ہو جائے گا۔ شکر ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب [illegible] ہے یہ مکھیا اور پنچ وغیرہ بھی کوئی عقل کا فیصلہ کر لیں۔"

"اگر انہوں نے نہ کیا تو پھر؟"

"پھر خون خرابا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آفتاب اپنی دھمکی کو عملی شکل دے گا۔ وہ بے گناہ

لوگوں کو مارنا شروع کر دے گا۔‘‘

’’کیا جو لوگ مندر سے آفتاب اور سلطانہ کا پیچھا کرتے یہاں پہنچے ہیں، وہ انہیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟‘‘

’’اگر یہ دونوں جلدی نکل جائیں تو نکل بھی سکتے ہیں۔ میں نے بتایا ہے نا کہ آفتاب اور سلطانہ اکیلے نہیں نکلیں گے۔ وہ اپنے ساتھ کم از کم آٹھ دس یرغمالی رکھیں گے، اسی لئے آفتاب نے بڑی گھوڑا گاڑی بھی مانگی ہے...... میں تو اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوا ہوں۔ یہ وہ آفتاب لگتا ہی نہیں جس کے ساتھ ہم نے تہ خانوں میں وقت گزارا ہے۔‘‘

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے جب پھر کئی افراد عمران کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے اندر کے حالات پوچھنے لگے۔ یہ سب سیدھے سادے مقامی دیہاتی تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس دور دراز جگہ پر کسی نے ہمیں پہچانا نہیں تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر دور تک کھیت تھے اور ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور راستے تھے۔ اس گاؤں کے بیشتر مکان کچے تھے۔ نیچی چھتوں پر اور گلیوں کی نکڑوں پر نیم عریاں بچے اور رنگ برنگی اوڑھنیوں والی دیہاتنیں نظر آتی تھیں...... ایک حویلی کی دیوار پر بہت سے اپلے لگائے گئے تھے۔ ان اوپلوں کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔

اچانک مکھیا بلرام اور اس کے پنچ تیز قدموں سے واپس آتے دکھائی دیئے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے عزیز اسپتال کے اندر گھِر گئے تھے۔ اس کے علاوہ احاطے میں مری پڑی عورت کے لواحقین بھی گریہ زاری کرتے دکھائی دیئے۔ وہ انگلیوں سے احاطے کی طرف اشارے کر رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے جاتا اور عورت کی لاش کو اُٹھا کر لے آتا۔

مکھیا اور پنچوں نے عمران سے چند ایک سوال مزید پوچھے۔ تب وہ پنچ عمران کے ساتھ احاطے کے اندر گئے۔ آفتاب خاں چھت پر بالکل چوکس موجود تھا۔ اس نے پہلے یہ یقین کیا کہ اندر آنے والے افراد بالکل غیر مسلح ہیں پھر اس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دی۔

اس بار ہونے والی گفتگو پانچ دس منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ پنچ دھوتیاں پھڑ پھڑاتے ہوئے واپس آئے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حملہ آور طیش میں ہیں۔ آدھ گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے۔ انہوں نے چھوٹے ڈاکٹر کو مارنے کی تیاری کر لی ہے۔ دو چار منٹ اور گزر گئے تو وہ اس راج نامی ڈاکٹر کو گولی مار کر چھت سے نیچے پھینک دیں گے۔

پنچوں کے واپس آنے کے صرف پانچ منٹ بعد مکھیا بلرام نے اعلان کیا کہ انہوں نے اندر موجود لوگوں کا جیون بچانے کے لئے حملہ آوروں کی بات ماننے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں گھوڑا گاڑی اور گھوڑے دیئے جا رہے ہیں۔ یہ پیغام لے کر عمران ایک ادھیڑ عمر پنچ کے ساتھ اندر گیا۔ مکھیا بلرام اور اس کے دیگر پنچ ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گئے جنہیں یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ امید تھی کہ عمران اور پنچ جلد ہی لوٹ آئیں گے مگر ان کی واپسی میں پھر تاخیر ہوئی۔ کچھ گڑ بڑ لگ رہی تھی۔ وہ دونوں قریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر پنچ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

’’وہ حرامجادے مکر گئے ہیں۔ وہ کہوت ہیں کہ وہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ یہاں سے جاویں گے۔ اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ اڑا ڈالیں گے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ہاتھ پیچھے موڑ کر ایک رسّی سے باندھ دیئے ہیں اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔‘‘

’’وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟‘‘ مکھیا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

’’کچھ پتا ناہیں جی۔ شاید ان کو شبہ ہے کہ ان کے ساتھ وشواس گھات ہوگا۔ وہ باہر نکلے تو مارے جاویں گے۔‘‘

’’لیکن اس سے پہلے تو وہ سب کچھ مان رہے تھے؟‘‘ ایک پنچ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

’’لیکن اب وہ کچھ نہیں مان رہے۔ پٹھان نے کہا ہے کہ وہ سرکاری لوگن سے بات کرنا چاہت ہیں۔‘‘

’’سرکاری لوگن؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں، وکہوت ہیں کہ کسی سرکاری بندے کو بلایا جاوے...... یا پھر کوئی فوجی افسر یہاں آوے۔‘‘

یہ تبدیلی حیران کن تھی۔ عمران بھی الجھا ہوا اور خاموش نظر آیا۔

ہجوم میں اب اور طرح کا اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ جن لوگوں کے عزیز اندر تھے، وہ [illegible] پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی پھر واویلا کرنے لگے۔ آفتاب خاں نے [illegible] کی لاش احاطے میں سے اُٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔ عمران اور پنچ امام دین دو [illegible] افراد کے ساتھ احاطے میں گئے اور عورت کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر باہر لے آئے۔ [illegible] ایم ایم رائفل کی گولی اس کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور سامنے سے

باہر نکل گئی تھی۔ اس کی نیلی یونیفارم سے اُٹھنے والی ''دواؤں کی بو'' سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے چاری یہاں نرس کے طور پر مریضوں کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ اس کی موت نے ہر کسی کو افسردہ اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے رشتے دار نوحہ کناں تھے جن میں اس کا اسکول ماسٹر شوہر اور دو چھوٹے بچے بھی تھے۔

میں نے عمران کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چل گیا ہے یار؟''

''ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... لگتا ہے کہ آفتاب اور سلطانہ نے اچانک اپنا ارادہ تبدیل کیا ہے۔ شاید کوئی نئی بات ان کے سامنے آئی ہے جس کی وجہ سے وہ جانا نہیں چاہ رہے۔''

''وہ سرکاری لوگوں کو بلانے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔''

عمران نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں تھیں۔ وہ بے خیالی میں اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھو رہا تھا۔ یہ بھی اس کے سوچنے کا ایک انداز تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ مجھ سے بولا۔ ''اب ہم زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ کسی بھی وقت ہمیں پہچانا جا سکتا ہے۔''

''تو پھر؟''

''ہمیں کھسکنا پڑے گا۔'' اس نے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میری سمجھ میں بھی یہی بات آ رہی تھی کہ اب یہاں سے کھسکنا ہی بہتر ہے۔ زیادہ تر لوگ جواں سال عورت کی لاش کی طرف متوجہ تھے۔ ہم ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھے۔ اچانک میری نظر تین گھڑسواروں پر پڑی وہ چمکیلی دھوپ میں گرد اڑاتے تیزی سے موقع واردات کی طرف آ رہے تھے۔ یہ سرخی مائل پگڑیوں والے زرگاں کے مسلح سپاہی تھے۔ عمران نے بھی انہیں تاک لیا تھا۔ ہم دونوں نے چہرے اپنی میلی کچیلی پگڑیوں میں چھپائے اور رخ پھیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم موقع واردات سے محفوظ فاصلے پر کماد کے کھیت میں موجود تھے۔ ہم ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ عمران کے کہنے پر میں نے چادر کے نیچے سے دور مار رائفل نکالی اور اس کے بیرل کو فکس کر کے اسے تیار حالت میں کر لیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ایک چھوٹا سا ریڈیو نما آلہ نکال لیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک واکی ٹاکی تھا۔ ''اوئے! یہ کہاں سے ملا تجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسپتال سے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کا ہے، پر اب آفتاب کے قبضے میں ہے۔ اس کا دوسرا سیٹ'' آفتاب کے پاس ہے۔''

''اس نے خود دیا تھا؟''

''تو کیا میں چھین کر لایا ہوں؟'' عمران نے کہا اور سیٹ کو آن کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے شبہ تھا کہ عمران کی قمیص کے نیچے تہ بند کی ڈب میں کچھ ہے۔ اب یہ شبہ درست نکلا تھا۔ عمران نے ''سیٹ'' کا چمکیلا انٹینا کھینچا۔ بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کی سیٹ کے بیٹری سیل وغیرہ دیکھے لیکن اس میں زندگی کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اس نے جھلا کر سیٹ کو تھپتھپایا۔ وہ ایک دم جاگ اُٹھا۔ اس پر دو چھوٹی لائٹس روشن ہو گئیں، ایک سرخ دوسری سبز۔ اسپیکر سے گھوں گھوں کی مدھم آواز آنے لگی۔

عمران نے ایک کھٹکا دبایا تو بیپ کی باریک آواز اُبھری۔ یہ بیپ دوسرے سیٹ پر جا رہی تھی۔ آٹھ دس دفعہ کی بیپ کے بعد کھٹ پٹ ہوئی اور اسپیکر پر آفتاب کی آواز اُبھری۔ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ''ہیلو...... کون ہے؟''

''عمران بول رہا ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ بے موت مارے جاؤ گے۔ ساتھ میں وہ بھی جان سے جائے گی۔''

''تم اپنا نصیحت اپنے پاس رکھو۔ ام جو کچھ کر رہا ہے، سوچ سمجھ کر رہا ہے اور ایک بار پھر ام تم کو بتا دینا چاہتا ہے، کسی نے کوئی چالا کی مالا کی دکھایا تو بہت خون خرابا ہوگا۔ ام کسی کو نہیں چھوڑے گا۔''

''لیکن اب کیا نئی بات ہوئی ہے؟ تمہارا مطالبہ تو مان لیا گیا تھا۔ مکھیا نے بڑی گھوڑا گاڑی اور گھوڑوں کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں راستہ دینے پر تیار ہیں۔ تم اپنے ساتھ ضمانت کے طور پر کچھ لوگوں کو بھی رکھ سکتے ہو۔''

''نہیں، اب ام نہیں جائے گا۔ اب امارا مطالبہ کچھ اور ہے اور یہ مطالبہ کسی اور کو نہیں، صرف حکم کے لوگوں کو بتائے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''حکم کے لوگ دس بیس کی تعداد میں نہیں سیکڑوں کی تعداد میں آئیں گے اور بہت جلد ان کو یہ شک بھی ہو جانا ہے کہ جو لڑکی تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں پہنچی

ہے، وہ سلطانہ ہے...... ایک باران کو یہ شک ہو گیا تو سمجھ لو کہ وہ آخری حد تک جائیں گے۔ تم اس پورے گاؤں کو بھی گولیوں سے اڑا دو تو وہ تمہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔"

"وہ جانے دیں گے۔ ان کا باپ بھی ام کو نہیں روک سکتا۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد مت کرو عمران صاحب۔ تم اس معاملے سے نکل جاؤ ورنہ پچھتانا پڑے گا۔"

میں نے واکی ٹاکی پر جھکتے ہوئے کہا۔ "آفتاب خاں میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بارا سے بلا دو۔"

"وہ اپنی جگہ پر ہے۔ وہ اب نہیں آ سکتا۔ اس کی طرف سے بھی تم دونوں کے لئے یہی پیغام ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ بری طرح پھنس جاؤ گے۔"

اس کے ساتھ ہی کسی بڑی عمر کے مرد کی زور زور سے رونے کی آواز آئی اور آفتاب خاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ کی اصلیت سامنے آنے والا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اب یہ نئی آفت آ گئی تھی۔ آفتاب یہاں سے بحفاظت نکلنے کے بجائے ایک بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا تھا۔

ہم نے پھر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔

عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آفتاب کے ہاتھ میں کوئی ایسی شے لگی ہے جس کے بعد اس کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی کچھ شرطیں منوانا چاہتا ہے۔"

"ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ اسلحہ...... یا پھر کوئی ایک ایسا شخص جو حکم وغیرہ کے لئے بہت اہم ہو...... یا پھر حکم اور اس کے ساتھیوں کی کوئی خاص کمزوری۔"

قریباً ایک گھنٹے کے اندر صورتِ حال بہت تبدیل ہو گئی۔ حکم کے کم و بیش دو درجن سپاہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک جیپ پر آئے تھے۔ یہ جیپ غالباً ان جیپوں میں شامل تھی جو ہماری تلاش میں یہاں چکرا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور جیپ بھی پہنچ گئی۔ پہلی جیپ بڑی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہو گئی۔ غالباً یہ لوگ مزید نفری لانے اور حکام بالا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے لپکے تھے۔ ہم یہ ساری نقل و حرکت گنے کے اونچے کھیت کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ اب

ہمارے لئے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ واپس بستی میں پہنچیں۔ آفتاب اور سلطانہ بھی وہ قیمتی وقت ضائع کر چکے تھے جو انہیں یہاں سے نکال سکتا تھا۔ حکم کے سپاہیوں کے آنے کے بعد اب یقیناً وہ آوازیں بھی دب گئی تھیں جو اندر پھنس جانے والے لوگوں کے عزیزوں کی تھیں۔ اب لوگ اصرار نہیں کر سکتے تھے کہ حملہ آوروں کی بات مان کر لوگوں کو رہا کرا لیا جائے۔

مزید ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ہم دوبارہ آفتاب یا سلطانہ سے رابطہ نہیں کر سکے۔ کماد کا کھیت ہمارے لئے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھا۔ اگر کوئی دیہاتی اس طرف آتا بھی تو ہم خود کو پوشیدہ رکھنے کے لئے دائیں بائیں ہو سکتے تھے۔ حرکت کرنے سے پودوں میں سرسراہٹ کی آواز ضرور پیدا ہوتی تھی لیکن اس سرسراہٹ کو کسی کتے بلی کی حرکت سے بھی منسوب کیا جا سکتا تھا۔

واپس جانے والی جیپ کچھ دیر بعد تیز رفتاری سے دھول اڑاتی واپس آ گئی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ خوش گوار سنہری دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، جیپ میں سے کوئی اعلیٰ فوجی افسر نکل کر شفا خانے کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس کی کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس واقعے کے بیس پچیس منٹ بعد اچانک ہمارا رابطہ ایک بار پھر آفتاب خاں سے ہو گیا۔ عمران نے بٹن دبایا تو اسپیکر پر آفتاب کی آواز اُبھری۔

"ہیلو...... کون؟"

"میں عمران بول رہا ہوں۔ یہ جیپ پر ابھی کون آیا ہے یہاں؟"

"حکم کا ہندو فوجی افسر تھا۔ ام نے اسے بتا دیا ہے کہ ام کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ امارا ڈیمانڈ پورا کرتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ام ان سب کو ایک ایک کر کے مارے گا اور لاشیں باہر انڈے میں پھینکے گا۔" آفتاب کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے۔

"کیا ڈیمانڈ کی ہے تم نے؟"

"ام کو ہاشم صاحب کی رہائی چاہئے...... فوراً...... ان لوگوں کو ہاشم صاحب کو چھوڑنا پڑے گا اور یہاں پہنچانا پڑے گا۔"

"ہاشم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو۔ بس ام چاہتا ہے کہ حکم اس کو رہا کرے اور وہ یہاں پہنچ جائے۔"

"لیکن وہ تمہاری بات کیوں مانیں گے؟" عمران نے پوچھا۔

"اس لئے کہ ان کا دُکھتا رگ امارے قبضے میں آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"راج بھون کا کاپر (کافر) عورت امارے پاس ہے۔ وہ لوگ امارا بات نہیں مانے گا تو ام اس حرامزادی کو ننگا کر کے اور اس کے سر میں روشن دان کھول کر اسے برانڈے میں پھینکے گا اور یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ یہ جارج گورا کا بہن اور سرجن اسٹیل کا بیوی ہے۔"

میں اور عمران سناٹے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "تم...... ماریا کی بات کر رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہ امارے سامنے بیٹھا ہے۔ ام نے اس کو مرغی کی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔ کسی بھی وقت اس کے گلے پر چھری چلا دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی چلانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ آفتاب خاں نے شاید اسے ٹھوکر ماری تھی۔ ہم ششدر تھے۔ میں نے قریباً پہچان لیا۔ یہ آواز ماریا ہی کی تھی۔

"یہ یہاں کیسے؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"برا وقت بندے کو خود گھیر کر اس کی اصل جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔" آفتاب بولا۔ "یہ یہاں شکار پر آیا ہوا تھا۔"

"شکار...... کس کا شکار؟"

"ڈاکٹر لی وان کا...... یہ سفید کتیا اس پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس سے تم دونوں کے بارے میں سن گن لینا چاہتا تھا۔ یہ دو دن پہلے مریضہ کے روپ میں اپنا منہ سر لپیٹ کر یہاں پہنچا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ مقامی کپڑوں میں یہ انگریز عورت ہے۔ یہ تو سلطانہ بی بی نے اسے پہچانا اور ام کو بتایا۔"

"ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عمران بولا۔

"ابھی ام تم کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ ابھی ام تم سے صرف یہ کہتا ہے کہ اس معاملے سے نکل جاؤ۔ ام کو امارے حال پر چھوڑ دو۔ ام ان لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس پر بھی غور کر لیتے ہیں لیکن ہمیں بتاؤ تو سہی کہ ماریا یہاں پہنچی کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

واکی ٹاکی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ بس گھوں گھوں کی مدھم آواز آتی رہی۔ ہمیں لگا کہ شاید آفتاب نے پھر سلسلہ منقطع کر دیا ہے مگر پھر اس کی آواز ابھری۔ "ام نے تم کو بتایا ہے نا کہ یہ شکارن ہے اور یہ بندوق صندوق سے نہیں اپنے حسن سے شکار پر ماتا ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کو اپنی گوری چمڑی پر ریجھانے کے لئے یہاں آیا تھا۔ سامبر مقابلے میں اپنے بھائی کی موت کے بعد سے یہ جلے پاؤں کا بلی...... بلکہ کتیا بنا ہوا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی

...ان یہ بھی تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے خصم سرجن اسٹیل کو شک تھا کہ تمہاری ...ان سے "بجلی کا چپ" کسی عام شخص نے نہیں نکالا، کسی بہت سیانے ڈاکٹر نے ہی ایسا کیا ہو گا۔ ان لوگوں کے دماغ میں ڈاکٹر لی وان یا چھوٹے ڈاکٹر کے بارے میں شک تھا۔ یہ کتیا ...س کو تم ماریا کہتا ہے، مریض کے روپ میں ڈاکٹر لی وان کے پاس آیا۔ یہ اس سے اندر کا بھید لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ بھید لیتا، اس کا اپنا بھید کھل گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ...کاری خود شکار ہوا۔" اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے لیٹی ماریا کو ٹھوکر وغیرہ رسید کی۔ اس ...ے چلانے اور پھر انگلش میں گالیاں دینے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔

"خاموش۔" آفتاب دہاڑا۔ "ابھی تمہارا ایک انگلی کٹا ہوا ہے۔ ام باقی بھی کاٹ ڈالے گا پر یہ سارا انگلی تمہارے اندر ٹھونسے گا...... تمہارے پلید منہ کے اندر اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گا۔" آفتاب کا لہجہ لرزا دینے والا تھا۔

ہم صورتِ حال کی اس قطعی غیر متوقع کروٹ پر ششدر تھے۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ سرجن اسٹیل کی بیوی اور جارج کی بہن، آفتاب کے قبضے میں آ گئی ہے۔

ماریا نے غالباً پھر واویلا شروع کر دیا تھا۔ آفتاب نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔

اب سچویشن سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آفتاب نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ ماریا ایک شکارن تھی۔ وہ اپنے جسم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس سے پہلے ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ وہ رات کے اندھیرے میں ایک پارسی کو "جسمانی رشوت" دے کر راہِ فرار اختیار کر گئی تھی۔ شاید یہاں وہ ڈاکٹر لی وان یا اس کے اسسٹنٹ کو حسن کے جال میں جکڑنے کے لئے وارد ہوئی تھی۔ آفتاب کا کہنا تھا کہ وہ ان سے ہمارے بارے میں کوئی "کلیو" حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"اس کا جواب لاہور میں اکثر رکشوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے، وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔" وہ بولا۔

"یہ تو بہت لمبا چکر چل گیا ہے۔ اگر واقعی ماریا، آفتاب کے قبضے میں آ چکی ہے تو زرگاں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ انہیں ہاشم رازی کو رہا ہی کرنا پڑ جائے۔"

"لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کو بڑی تیزی سے لڑائی اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔" عمران کی پیشانی پر بال لہرا رہے تھے اور آنکھوں

میں گہری سوچ تھی۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا لیکن رات کے وقت اب بھی کافی سردی ہوتی تھی۔ جوں جوں شام کے سائے لمبے ہوتے گئے، کماد کے اس کھیت میں خشکی بڑھتی گئی۔ شام کے فوراً بعد ہی اوس بھی گرنا شروع ہو گئی۔ بستی میں چراغ روشن ہو گئے۔ شفا خانے کی عمارت کے ارد گرد اب ایک جم غفیر موجود تھا۔ زرگاں کے بیسیوں مسلح سپاہی اور گارڈز بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شفا خانے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہر طرف حرکت کر رہے تھے۔

میرے سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ کی صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور دل کو درد سے لبریز کر دیتی تھی۔ دو چار دن میں ہی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اوپر تلے دل فگار انکشاف ہوئے تھے اور اب وہ ایک بدترین صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ جب دو دن پہلے میں نے تہ خانوں میں آفتاب اور سلطانہ کو رازدارانہ گفتگو کرتے سنا تھا۔ سلطانہ نے کہا تھا...... آفتاب! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ آخری بار ہو گا...... یقیناً وہ اسی خطرناک مہم جوئی کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ زہر سے بھرا ہوا ایک پیکٹ اپنے لباس میں چھپا کر مندر میں کسی گلزار نامی معذور عورت تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جائے گا لیکن انسانی ارادے اور منصوبے ہمیشہ تو پورے نہیں ہوتے۔ جہاں، سلطانہ کے خیال میں اس کا کام ختم ہو جانا تھا، وہیں سے صورتِ حال نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ مندر کے اندر گڑبڑ ہوئی اور سلطانہ خود کو بچانے کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے دفاع میں تیز دھار آلہ بھی استعمال کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہمارے سامنے تھا۔ وہ اور آفتاب کم از کم تین افراد کے قتل میں ملوث ہو چکے تھے اور اب سیکڑوں افراد کے گھیرے میں تھے۔ ان کے حوالے سے اگر کوئی امید تھی تو یہی تھی کہ وہ اپنے پاس سفید فام ماریا کی موجودگی کا دعویٰ کر رہے تھے۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ سردی کے سبب وہ قدرے لرزاں آواز میں بولا۔ ”کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ واقعی تمہاری شاگردی اختیار کر لی جائے۔“

”کس معاملے میں؟“

”سردی، گرمی اور بھوک پیاس جھیلنے کے معاملے میں۔ یار! تم تو ایسے بیٹھے ہو جیسے خالہ جی کے ڈرائنگ روم ہو اور باقاعدہ انگیٹھی دہک رہی ہو۔ یہاں تو اپنی قلفی جمی جا رہی ہے۔“

”تو بن جاؤ شاگرد۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”لو بن گیا۔“ اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”اب اپنے شاگرد کے لئے کچھ کرو۔“

”کیا مطلب؟“

”یار! اپنے شاگرد کی جان بچاؤ۔ اس کے لئے کہیں سے کوئی انگیٹھی وغیرہ لے کر آؤ۔ لوئی مونگ پھلی، چلغوزے، کوئی دودھ پتی وغیرہ۔“

”ایسے کام تو شاگرد اپنے استادوں کے لئے کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ پرانے زمانے کی پرانی باتیں ہیں استاد جی۔ ہم نئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایسی فرسودہ رسموں کو ختم کرنا چاہئے بلکہ آج ہی سے اس نیک کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔“ اس نے میری گرم چادر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

مجھے واقعی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے چادر اُتاری اور اس کی طرف بڑھا دی۔ ”لو، اسے اپنی چادر سے جوڑ کر ڈبل کر لو تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔“

”نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا استاد جی۔ مجھے اکڑ کر مرنا قبول ہے لیکن یہ طعنہ مجھ سے ہرگز برداشت نہیں ہو گا کہ میں نے صرف یہ چادر تم سے ہتیانے کے لئے استادی شاگردی کا ڈراما رچایا تھا۔ نو ناٹ ایٹ آل۔“

”رکھ لو۔ مجھے واقعی ٹھنڈ نہیں لگ رہی۔“

”تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی لیکن مجھے تو بے عزتی لگ رہی ہے نا۔“ اس نے کہا۔

پھر اس مسئلے کا درمیانی حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں گرم چادروں کو آپس میں جوڑا اور اس کی ایک ہی بکل بنا کر اس میں گھس گئے۔ ہم نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے مگر عمران کی حسِ مزاح ہمیشہ کی طرح برقرار تھی۔ وہ میرا دھیان بٹانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ساتھ بے مثال تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ ایک اور ایک گیارہ کا محاورہ کسی عمران جیسے ساتھی کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہو گا جب ایک بار پھر سیون ایم ایم رائفل کی خوفناک آواز نے سناٹے کو چکنا چُور کیا۔ اس کے فوراً بعد بستی میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پانچ دس منٹ بعد عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے دور سے دیکھا۔ کچھ لوگ ایک چارپائی اُٹھائے احاطے سے نکل رہے تھے۔ یہ ویسا ہی سین تھا جیسا ہم نے صبح کے وقت دیکھا تھا۔ جب ماری جانے والی نرس کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر احاطے سے نکالا گیا تھا۔ اب یقیناً کوئی اور لاش نکالی جا رہی تھی۔

آفتاب کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ جارحیت بڑھ رہی تھی۔ "لگتا ہے کہ یہ ہوش کھو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوش کھونے کے لئے ہوش کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں تو شاید ہوش ہے ہی نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

"ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سیکڑوں کا مجمع ہے، اگر طیش میں آ کر یہ لوگ ایک دم اندر گھس گئے تو دونوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔"

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ اچانک بہت سے لوگوں کی نعرہ زنی سنائی دی۔ جے جے کار کا زوردار آوازہ گونجا اور اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد کا ایک بڑا گروہ شفا خانے کے پھاٹک کی طرف بڑھنا چاہ رہا ہے۔ یہی وقت تھا جب پھاٹک کے قریب شعلے سے چمکے اور رائفل کے کئی فائر ہوئے۔ آگے بڑھنے والا گروہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہوائی فائرنگ کرنے والے یقیناً حکم کے سپاہی ہی تھے۔ وہ مشتعل لوگوں کو آگے بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ اندر ایک اہم ترین عورت یرغمالی کی حیثیت سے موجود تھی۔ وہ جارج گورا کی بہن اور سرجن اسٹیل کی بیوی تھی اور سرجن اسٹیل جیسے سفید فام لوگ حکم کی ناک کا بال تھے۔ وہ ان سے معاملات بگاڑنے کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے...... وہ جانتے تھے ان لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں، پیسا ہے، اسٹیٹ کے کئی امراء اندرخانے ان سفید فاموں کے وفادار ہیں۔ جارج کے بعد اگر ماریا کو بھی کچھ ہو جاتا تو بہت بڑے نقصان کی بات تھی۔

مشتعل لوگوں کو نہ صرف منتشر کر دیا گیا بلکہ عام ہجوم کو بھی شفا خانے کی چاردیواری سے دور ہٹا دیا گیا۔ ہم دور سے صاف نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ رسیاں وغیرہ لگا کر عمارت اور لوگوں کے درمیان ایک فاصلہ بنایا جا رہا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے وقفے سے سیون ایم ایم کا ایک اور فائر ہوا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہی شوروغوغا برپا ہوا۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ ٹارچوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں ایک چارپائی اُٹھا کر احاطے سے باہر لائی جا رہی ہے۔ یقیناً اس چارپائی پر بھی ایک لاش تھی اور یہ لاش آفتاب خاں کی طرف سے، محاصرہ کرنے والوں کو تیسرا تحفہ تھی۔

رات کے ٹھٹھرے ہوئے سناٹے میں ایک بار پھر عورتوں کے بَین گونجے۔ ہجوم میں ہلچل نظر آئی۔ گاہے بگاہے حکم کے فوجیوں کے للکارے بھی سنائی دے رہے تھے۔ یہ للکارے عام لوگوں کو پُرسکون رکھنے کے لئے بلند کئے جا رہے تھے۔

میں اور عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف یکسر خاموشی تھی۔ ہم بھی تادیر یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بیٹری کے کمزور پڑنے کا خدشہ تھا۔ آفتاب بالکل دیوانے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس طرح کا دیوانہ پن بندے کو حیران کن کامیابی دلاتا ہے یا برباد کر دیتا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب نے ہاشم عرف ہاشو کی رہائی کے لئے حکم کے ہرکاروں کو ایک خاص مہلت دی ہے۔ وہ مہلت چونکہ ختم ہو گئی ہے اس لئے وہ یرغمالیوں میں سے کچھ لوگوں کو مار کر باہر پھینک رہا ہے۔

"یار! اس نے کہیں ڈاکٹر لی وان کو ہی نہ مار دیا ہو؟" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ مقامی عورتیں جس طرح واویلا کر رہی ہیں، یہی لگتا ہے کہ کوئی مقامی ہی مرا ہے۔"

"مگر مقامی لوگ ڈاکٹر کو بھی تو بہت چاہتے ہیں۔ اس کی موت بھی انہیں دکھی کر سکتی ہے۔" میں نے نکتہ اُٹھایا۔

"لیکن میرا نہیں خیال کہ آفتاب اتنی جلدی کسی اہم یرغمالی کو مارے گا۔ وہ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے، عام لوگوں میں آفتاب اور معذور گلزار جیسے لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ اپنے ظاہری روپ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تربیت یافتہ ہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہاشم رازی، ان کے بڑوں میں سے ہو، یا پھر ان کا سرغنہ ہی ہو؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ حکم کے دربار میں ہم نے ہاشم کی جو شعلہ فشانی دیکھی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھی۔"

"لیکن اگر وہ اہم ترین شخص ہے تو پھر اس کی رہائی زرگاں والوں کے لئے اتنی آسان نہیں ہوگی۔"

"مگر ادھر بھی تو دیکھو جگر! یہاں ماریا جیسی لڑکی پھنسی ہوئی ہے۔ یہاں کے گورے ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ماریا کو کچھ ہو۔ وہ حکم کو ماریا کے لئے ہر قیمت دینے پر تیار کر لیں گے۔ حکم اور اس کے حواریوں کے لئے ان انگریزوں کی بات ٹالنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے گاڑے ہوئے ہیں۔"

"یہ انگریز کتنی تعداد میں ہوں گے یہاں اسٹیٹ میں؟" میں نے پوچھا۔

"تعداد تو زیادہ نہیں ہے۔ گیتا مکھی بتا رہی تھی کہ یہ ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔"

اتنے ہی لوگ فوج کے مختلف عہدوں پر ہیں لیکن اس انگریز خانہ خراب میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہمیشہ سے مقامی لوگوں کو تقسیم کر کے اپنا کام نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارے برِ صغیر کی تاریخ پچھلے ڈھائی سو سال سے اسی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہاں بھی ان لوگوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اندر خانے اپنی طاقت بنائی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں یہ لوگ گرشیروں پر ریسرچ کرنے اور تیندوؤں کا شکار کرنے یہاں آئے تھے۔ اب یہاں یہ کافی تعداد میں ہیں۔ راج بھون میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ فوج میں انہوں نے اہم عہدے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے مقامی لوگوں میں سے ہی ایسے وفادار ڈھونڈ لئے ہیں جو وقت پڑنے پر حکم کو بھی تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔ اصل میں حکم کی جو شان و شوکت نظر آ رہی ہے وہ ان گوروں کی وجہ سے ہی ہے۔ حکم کے پیچھے گورے ہیں جن کی وجہ سے مقامی لوگ حکم کی ساری عیاشیوں کے باوجود اسے اوتار کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال، وہ قیدیوں کو اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑ لینے والی بات ہے۔''

''اَن دیکھی زنجیریں؟''

''یار! وہی بے ہودہ افواہ کہ حکم کے خاص قیدی اگر جارج گورے کی جیل سے بھاگ بھی جائیں اور کسی طرح اسٹیٹ کی حدوں سے نکلنا چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ حکم نے انہیں روحانی عمل سے پابند کیا ہوا ہے اور وہ کہیں بھی ہوں، پکڑ لئے جاتے ہیں۔ اب ہم جان ہی چکے ہیں، یہ ''روحانی عمل'' دراصل وہی منحوس الیکٹرانک چپ ہے جو سرجن اسٹیل خاص قیدیوں کے جسموں میں پلانٹ کرتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی شعبدے ہیں جن کے ذریعے حکم کی ''روحانیت'' کو جلا بخشی جاتی ہے۔''

''تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! پھر وہی بے ہودہ سوال؟ تم جانتے بھی ہو کہ میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میرا تو کام ہی ریسرچ کرنا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے سر کے خوب صورت بالوں کا خیال رہتا ہے، اگر میں گنجا ہونا قبول کرلوں اور اپنے دماغ کو اس کی پوری گنجائش کے مطابق استعمال کرنے لگوں تو میں ''بالکل بکواس چینل'' اور ''چغد نکمے نابینا چینل'' کو بھی مات دے دوں۔''

''یہ کون سے چینل ہیں بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار وہی...... بالکل بکواس چینل یعنی بی بی سی اور چغد نکما نابینا، سی این این۔''

وہ پٹری سے اکھڑ رہا تھا۔ میں اسے بمشکل واپس لایا۔ وہ گرم چادر میں سمٹتے ہوئے

بولا۔ ''تم نے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا ہوگا؟ وہی مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار۔ اسے انگریزوں نے اتنا کمزور کردیا تھا کہ وہ بس نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ اصل حکم انگریزوں کا ہی چلتا تھا۔ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی صورتِ حال یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اورنگ زیب کا پڑپوتا بہادر شاہ مسلمان تھا اور حکم جی ہندو ہے۔ جو کچھ نتیجہ میں نے نکالا ہے، اس کے مطابق حکم نے بس اپنے راج پاٹ کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ وہ اچھا کھا پی رہا ہے۔ ایک ہندو کی حیثیت سے ناچ گانے اور خوب صورت عورتوں کی صحبت سے لطف لیتا ہے۔ ساتویں کے جشن جیسی تقریبوں کی آڑ میں اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ چل رہا ہے، اسی طرح چلتا رہے۔ وہ ان گوروں کے خلاف کسی طرح کا سخت رویہ اختیار کر کے اپنے آرام سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں ان گوروں کا اصل دشمن کوئی اور ہے۔''

''کون؟''

''یہاں کے مسلمان۔ مراد شاہ اور انور خاں جیسے لوگ۔ جو بکنا اور جھکنا نہیں جانتے...... جو حکم کے چھوٹے بھائی ''چھوٹے سرکار'' کے ساتھ مل کر نل پانی میں بہت طاقت پکڑ چکے ہیں اور کسی بھی وقت زرگاں میں حکم اور اس کے انگریز دوستوں کے لئے شدید خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نچلی ذاتوں کے کچلے مسلے ہندو اور بودھی بھی زرگاں کے عیش پرستوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں۔''

''فی الوقت تو تم واقعی ایک صحافی لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''صحافی ایک نسبتاً چھوٹا لفظ ہے۔ تم میرے لئے مناسب لفظ استعمال کرنا چاہو تو وہ دان شور (دانشور) ہے۔ دان شور سمجھتے ہو نا تم؟ عقل مند، صاحب ذی شور۔''

''ذی شعور۔'' میں نے کہا۔

وہ میری تصحیح کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''عقل تو بچپن سے ہی میرے اندر بہت زیادہ تھی بلکہ میری ماں تو پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھے کہتی تھی، کبھی دوسروں کے سامنے کوئی بے وقوفی کی بات بھی کرلیا کرو، ورنہ لوگ سمجھیں گے تم بونے ہو۔ میری ہوشیاری کا اندازہ لگاؤ، جہاں دوسرے لوگ پانی کے بھرے ہوئے لوٹے سے طہارت کرتے ہیں، میں صرف آدھے کپ پانی سے کام چلا لیتا تھا۔ بارہ ٹینی کھیلنے میں، مَیں اپنے محلے کا چمپئن تھا۔ ایسی ایسی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ میرے ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، تم میں قدرتی طور پر ایک اچھا ''لڑاکا'' بننے کی صلاحیت ہے۔ اگر تم فوج میں چلے جاؤ تو بڑے اچھے جرنیل بن سکتے ہو۔ میں اپنے بے تحاشا ''آئی کیو'' کی وجہ سے فوج میں نہ جا سکا۔ انٹرویو کرنے والے

نے پوچھا جلدی سے بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں...... میں نے کہا، دینے ہوں تو چار اور لینے ہوں تو بائیس۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور پوچھا۔ نو دو اور گیارہ کتنے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو ہوتے ہی نہیں کیونکہ وہ تو بھاگ جاتے ہیں۔ اس نے کہا...... ٹھیک ہے تم بھی بھاگ جاؤ۔ یو آر ٹو انٹیلی جینٹ۔ میں فوج میں تو نہ جا سکا لیکن میں نے ایک اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے بارہ ٹینی کے تجربے کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ پتا ہے کس طرح؟''

''کس طرح؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے جنگی چالوں اور لڑائی کی حکمت عملیوں پر ایک کتاب لکھی۔ وہ پاپولر ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کو اور میری دان شوری کو تسلیم کیا۔ یقین کرو بہت سی حالیہ جنگوں میں میری کتاب کی دی ہوئی تکنیکیں ہی استعمال ہوئی ہیں۔ بلکہ جگر...... کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا ہے کہ پلاسی کے میدان میں انگریزوں نے سراج الدولہ کے خلاف بھی یہی تکنیکیں استعمال کی تھیں۔''

''حضور! یہ بڑی پرانی بات ہے۔ آپ اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں موجود ہوتا تو انگریزوں کو اپنی کتاب کی نقل کرنے دیتا......؟ اور سراج الدولہ صاحب کو شکست ہونے دیتا؟'' وہ تڑخ کر بولا۔

میں خاموش رہا۔ وہ بے سروپا باتیں کر کے میری توجہ صورتِ حال کی سنگینی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ سنگینی ایک بہت بھاری پتھر کی طرح رات کے سینے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اسے کچل رہی تھی۔

یہ پہاڑ جیسی رات تھی۔ صورتِ حال کی بے یقینی نے اسے مزید گراں کر دیا تھا۔ آخری فائرات ساڑھے دس بجے کے قریب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی بوگیر کتوں کی آوازیں گونجتی تھیں یا مسلح محافظوں کے بلند آوازے سنائی دیتے تھے۔ اب کم از کم چار جیپیں یہاں موجود تھیں۔ جیپوں کو شفا خانے کے اطراف میں مختلف جگہوں پر کھڑا کر کے ان کے انجن اسٹارٹ رکھے گئے تھے اور ان کی ہیڈ لائٹس کو سرچ لائٹس کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

عمران واکی ٹاکی سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ وہ ایک بار پھر آفتاب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو آفتاب؟ تم نے دو بندے اور مار دیئے ہیں۔ تم اپنے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہو۔ تم مرو

گے اور تمہارے ساتھ سلطانہ کی جان بھی جائے گی۔''

''ام مرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ سلطانہ بی بی ڈرتا ہے۔ مرنے سے تم جیسا بزدل ڈرتا ہے۔ امارا راستہ ایک دم سیدھا ہے۔ غازی یا شہید۔''

''لیکن بے گناہ نہتے لوگوں کو مارنا کون سا جہاد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ بے گناہ نہیں، یہ کافر لوگ ہے۔''

''کہاں کہا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو اس طرح مارا جا سکتا ہے؟''

''جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ تو کافروں کا ہی بنایا ہوا مقولہ ہے۔''

''ام مقولوں شقولوں کو نہیں جانتا، ام صرف اتنا جانتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو نہیں چھوڑا تو ام ان سب کو اگلے جہان روانہ کرے گا لیکن ام کو لگتا ہے کہ شاید اس کا نوبت نہ آئے۔ یہ بزدل لوگ اندر سے ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ یہ ہاشم صاحب کو چھوڑے گا...... ان کو چھوڑنا پڑے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! اگر تم زیادہ سختی دکھاؤ گے تو پھر تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی برداشت کھو دیں اور تم پر حملہ کر دیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تمہاری ہوا باندھ رکھی ہے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگوں کو یہ بتایا ہوا ہے کہ اندر دو سے زیادہ لوگ موجود ہیں۔ ان کے پاس دھماکا خیز مواد بھی ہے جو انہوں نے مریضوں کے وارڈ میں نصب کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم صرف دو ہو اور رائفل کے علاوہ تمہارے پاس کوئی کارگر ہتھیار بھی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیں۔''

آفتاب بے پروائی سے بولا۔ ''ان کا جو جی چاہتا ہے کرے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کچھ کرے گا تو سب کا خانہ خراب ہو گا۔ کم از کم یہ سفید رنگ کی کتیا تو بالکل بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

ایک بار پھر ماریا کے چلانے اور کراہنے کی آواز آئی۔ آفتاب جب بھی اس کا ذکر کرتا تھا، اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ بھی رسید کرتا تھا۔

''ڈاکٹر لی وان کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''وہ ایک دم سڑی بڈھا ہے۔ ام اس کا عزت کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے مندر میں تمہارا ا[illegible]ن کر کے ام سب کا مدد کیا تا۔ ام نے کل اس سے کہا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نکلنا چاہتا

ہے تو ام اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ بک بک کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے مریضوں کو اور اپنے اسپتال کو چھوڑ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ جینا مرنا پسند کرے گا۔ ام نے کہا ٹھیک ہے، اگر تمہاری قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر مرو۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لگاتار بک بک کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ام کو مارنا شروع کر دیا۔ ام نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ اب اس نے جو واویلا بھی کرنا ہے، اندر ہی کرتا ہے۔"

"تم نے اسے مارا بھی ہے؟"

"اس نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے مار کھایا ہے...... لیکن زیادہ نہیں...... بس ام نے رائفل کے دستے سے ایک چوٹ لگایا ہے اس کی کنپٹی پر۔ ہاں، اگر یہ اپنا منحوس واویلا بند نہیں کرے گا تو اور مار کھائے گا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں طیش نے اندھا کر رکھا ہے آفتاب خاں! ڈاکٹر لی وان ایک خدا ترس شخص ہے۔ اس نے اس دور دراز علاقے میں یہ اسپتال بنایا ہے...... ہر مہینے بارہ چودہ گھنٹے کا مشکل سفر کر کے یہاں پہنچتا ہے۔ ضرورت مندوں کا مفت علاج کرتا ہے۔ ان ضرورت مندوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں......"

"لیکن وہ خود تو کافر ہے نا...... اور کافر کافر ہی ہوتا ہے...... کافر ہی ہوتا ہے۔" آفتاب کے لہجے میں پھر آگ بھڑک اُٹھی۔

شاید یہ بحث طول کھینچتی مگر عمران نے مداخلت کی اور آفتاب سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار سلطانہ کی بات ہم سے کرا دے۔ پہلے تو آفتاب نہیں مانا لیکن پھر اس نے رائے بدل لی۔ شاید دوسری طرف یعنی سلطانہ کی طرف سے بھی ایسی خواہش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ واکی ٹاکی لے کر نیچے جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سلطانہ سے بات کراتا ہے۔

دور ناگ پھنی اور کیکر کے درختوں کے پیچھے بہت سی روشنیاں حرکت کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ فوجیوں کو مزید کمک مل گئی ہے اور گھیرا مضبوط کیا جا رہا ہے۔ آنے والی گھڑیوں میں یہاں کیا ہوگا، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں سلطانہ کی پژمردہ آواز واکی ٹاکی کے اسپیکر پر اُبھری۔ "مہروج...... مہروج! آپ میری آواج سن رہے ہیں؟"

"ہاں سلطانہ! میں سن رہا ہوں۔" میری آواز میں خود بخود درد لہریں لینے لگا۔

"آپ کہاں ہو مہروج؟"

"تمہارے آس پاس ہی ہوں اور تم کہاں ہو؟"

"مم...... میں یہاں اسپتال کے اندر۔"

"اور کوئی ہے تمہارے پاس...... میرا مطلب ہے آفتاب خاں کہاں ہے؟"

"وہ چلا گیا ہے۔ اس وخت (وقت) میں اکیلی ہوں۔" سلطانہ کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ! ایسا کیوں کیا تم نے؟ کیوں مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھا؟ میں تمہارا شوہر تھا سلطانہ...... تمہارا شریکِ زندگی...... تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم ان لوگوں کا حصہ تھیں جن میں آفتاب، ہاشو اور گلزار بی بی جیسے خطرناک قاتل شامل ہیں لیکن تم نے میرے سامنے ایک گھریلو عورت کا روپ بنائے رکھا۔ تم نے مجھے بتایا کہ تمہاری زندگی مجھ سے اور بالو سے شروع ہو کر ہم دونوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے...... ایسا کیوں کیا تم نے؟"

جواب میں سلطانہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم نے ہر قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے سلطانہ۔ یہاں تک کہ پرسوں رات کو بھی تم نے بس مندر سے میرے جانے کا ہی انتظار کیا اور پھر آفتاب کے ساتھ اپنے کام پر نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سب کیا تھا سلطانہ؟"

دوسری طرف سے چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ تب مدھم سسکی کی آواز اُبھری۔ سلطانہ نے کہا۔ "اپنی صفائی میں کہنے کے لئے میرے پاس کچھ ناہیں ہے مہروج! میں بس آپ سے مافی اِچ مانگ سکتی ہوں۔ اتنا جرور کہوں گی کہ میں جو کچھ ہوں، پہلے سے ہوں۔ اس وخت آپ بھی میری جندگی میں ناہیں آئے تھے۔"

"لیکن تم کیا ہو؟ مجھے تو پتا چلے سلطانہ...... میں جسے اپنی بیوی کہتا رہا ہوں، وہ اصل میں ہے کیا؟"

"وہ آپ کی بیوی اِچ ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولی۔ "اور آپ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ...... آپ...... سوچ بھی ناہیں سکتے...... لیکن......"

"لیکن کیا؟"

وہ گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ "میں جو کچھ ہوں، مجھے حالات نے بنایا ہے مہروج! جب حکم جی اور جارج گورے جیسے حاکم تقدیروں کے مالک بن جاتے ہیں، لوگن پر جلم

ڈھاتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، راہ چلتی عورتوں کو بری نجر سے دیکھتے اور انہیں بے عزت کرنا چاہتے ہیں، تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے بہت جلم سہا ہے مہروج! ہم راجپوت ہیں، ہمارا دوش بس یہ تھا کہ ہم حکم اور گورے جیسے لوگن کی من مانیوں کے سامنے سر ناہیں جھکاتے تھے۔ شاید کسی وخت ہم ہار ہی جاتے لیکن پھر ہمیں ہاشم صاحب جیسا آسرا مل گیا۔ ہاشم صاحب وہ سب کچھ کر سکتے تھے جو ہم ناہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا، خفیہ ٹھکانے تھے اور بڑے نڈر ساتھی بھی تھے۔ ہاشم صاحب گونگے ملازم کے روپ میں ہمارے گھر رہنے لگے تھے۔ صرف میں، میرے ابا جی اور بھائی نبیل جانتے تھے کہ ہاشم صاحب کیا ہیں۔"

"سلطانہ! تم میری شریکِ زندگی ہونے کا دعویٰ کرتی رہیں اور مجھے اتنی اہم باتوں سے بے خبر رکھا؟"

"میں نے کئی بار سوچا مہروج کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں لیکن ہر بار ڈر گئی۔ مجھے لگا کہ میں آپ کو کھو دوں گی۔ آپ مجھ سے بہت دور چلے جائیں گے۔ میں یہ ناہیں کہتی مہروج کہ میں نے ہاشم صاحب کے کہنے پر جو کچھ کیا، وہ سب ٹیک اِچ تھا لیکن وہ سب کچھ غلط بھی ناہیں تھا۔ یہ ان گوروں کا کٹھ پتلی حکم جی، کم جور مسلمانوں پر جس طرح کے جلم ڈا رہا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ ہاشم صاحب اور ان کے ساتھی اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ کہیں ان سے جیادتی بھی ہو جاتی ہوئے گی مگر جیادتیاں تو دونوں طرف ہو رہی ہیں۔"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "زرگاں جانے سے پہلے میں نے تم سے کیا کہا تھا سلطانہ؟ میں نے کہا تھا کہ...... اب میں ہوں...... اب اپنے سارے غم دکھ مجھے دے دو۔ ایک بیوی کی طرح گھر کی چار دیواری میں آ جاؤ۔ میں تمہارے ہر دکھ کا مداوا کروں گا، تمہارے سارے آنسو پونچھوں گا۔ میں نے کہا تھا نا؟"

وہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ چند لمحے بعد رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے انکار ناہیں ہے مہروج! آپ نے کہا تھا اور آپ اپنے کہے کا پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اب وہی کچھ کروں جو آپ چاہتے ہیں لیکن قدرت کو شاید یہ منجور ناہیں تھا۔ میں آپ کے لئے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی مہروج! لیکن ایک آخری کام مجھے کرنا تھا...... اور...... یہ کوئی جیادہ خطرناک کام بھی ناہیں تھا۔ لل...... لیکن ہم پھنس گئے مہروج...... اور اب جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر......" اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"وہاں مندر میں کیا ہوا تھا؟" میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ "میں اس بڑے کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں [illegible] یا جاتا ہے۔ وہیں پر مجھے گلزار سے ملنا تھا مگر راستے میں ایک بار پھر تلاشی ہو گئی۔ اس تلاشی میں بڑی گوپی کو میرے کپڑوں میں چھپے لفافے کا پتا چل گیا۔ اس نے لفافہ نکال لیا اور مجھے مارنے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک چھری پڑی تھی۔ میں نے چھری اٹھائی اور بھاگ نکلی۔ دو تین لوگن میرے راستے میں آئے۔ میں نے ان پر وار کیا اور پھر ایک بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں چڑھ گئی۔ اس وخت مجھے بالکل جانکاری ناہیں تھی کہ آفتاب خاں بھی مجھ سے مل جائیں گے۔ گھوڑا گاڑی کھیتوں میں تھوڑا اِچ آگے گئی تھی کہ وہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔"

"اسے پتا تھا کہ تم گھوڑا گاڑی میں ہو؟"

"ہاں، اس نے مجھے گاڑی میں چڑھتے دیکھ لیا تھا......"

اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خبر نہیں کہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے یا پھر ویسے ہی واکی ٹاکی آف کر دیا تھا۔

میں اور عمران کوشش کرتے رہے لیکن دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا۔ سلطانہ سے گفتگو شروع کرنے سے پہلے درختوں کے درمیان جو متحرک روشنیاں نظر آئی تھیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں حکم کے گارڈز اور سپاہیوں کو کافی بڑی کمک مل گئی ہے۔ ایک طرف آفتاب کہہ رہا تھا کہ اس کا مطالبہ مانا جانے والا ہے اور بہت جلد ماریا کے بدلے میں ہاشم رازی کو رہا کر کے یہاں پہنچایا جانے والا ہے...... جبکہ دوسری طرف اسپتال کا گھیرا مضبوط تر کیا جا رہا تھا۔ حالات تیزی سے پینترے بدل رہے تھے۔ سلطانہ سے بات کرنے کے بعد میں بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ رگ و پے میں تاریکی سی اُتر گئی تھی۔ سلطانہ وہ ہستی تھی جس نے مجھے نئے سرے سے جینا سکھایا تھا۔ ثروت کے بے پناہ غم کو بھلانے میں اس کی سحر انگیز شخصیت نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ نڈر، بے دھڑک اور اپنے پیاروں پر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی۔ وہ جب میرے پاس ہوتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مرکز و محور بس میں ہی ہوں لیکن یہ غلط نکلا تھا۔ ایک بہت بڑا بھرم ٹوٹا تھا اور اس کے ٹوٹنے نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

"کوئی آ رہا ہے۔" عمران کی سرگوشی نے مجھے ایک دم خیالوں سے چونکا دیا۔

میں نے کان لگا کر سنا۔ گنے کے پودوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ پچیس تیس قدم دور تھی تاہم اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ گہری تاریکی میں ہم کچھ دیکھنے کے

قابل تو نہیں تھے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ ایک سے زیادہ افراد ہیں۔ عمران نے رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ میں بھی چوکس ہو گیا۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ اگر کوئی دیہاتی اپنی ''حاجت روائی'' کے لئے آیا ہوتا تو اکیلا ہوتا......

ہم دم سادھ کر بیٹھ رہے اور سرسراہٹ کا اُتار چڑھاؤ سنتے رہے۔ آنے والوں کی خوش قسمتی یا بدقسمتی انہیں ہمارے بالکل قریب لا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ ہمارے سامنے ہوں گے...... لیکن پھر اچانک ہم سے صرف چھ سات میٹر کے فاصلے پر سرسراہٹ رک گئی۔ ایک باریک ڈری ڈری نسوانی آواز اُبھری۔ ''کیا ہوا جی؟''

''بس یہیں بیٹھ جاوت ہیں۔'' ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی لڑکی لڑکا ہیں۔ پودوں کے درمیان سے ہمیں ان کے موہوم سے ہیولے بھی دکھائی دیئے۔ لڑکا شاید بیٹھنے لگا تھا مگر نوجوان لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ''ناہیں جی...... آپ کے کپڑے خراب ہوویں گے۔ میں اپنی چادر بچھا دیوت ہوں۔''

نوجوان لڑکا منع کرتا رہا مگر لڑکی نے ہموار جگہ پر اپنی اوڑھنی بچھا دی۔ پھر نوجوان غالباً بیٹھ گیا مگر لڑکی کھڑی رہی۔ ''بیٹھو نا تم بھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''نن...... ناہیں جی...... آپ کھتری ہیں، میں شودر...... میں آپ کے برابر بیٹھوں گی تو مجھ کو پاپ لگے گا۔''

''ناہیں...... کچھ ناہیں ہوگا۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں...... بیٹھ جاؤ۔'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہم سے اتنے قریب تھے کہ اگر ہم حرکت کرتے یا اونچی سانس بھی لیتے تو شاید انہیں شک ہو جاتا۔

لڑکی مسکین آواز میں بولی۔ ''باپو کہوت ہیں کہ ہم لوگن کا سایہ بھی آپ پر ناہیں پڑنا چاہئے۔ آپ کی پوترا بھرشٹ ہو جاوت ہے۔''

''لیکن یہ تو کالی رات ہے چمپی! اس میں تو سایہ ہوتا ہی ناہیں اور ویسے بھی میں تم سے کہوت ہوں کہ یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں۔ بھگوان نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ ذات پات، یہ اونچ نیچ کی سیڑھیاں، یہ سڑی ہوئی رسمیں، یہ سب کچھ تو ہمارا بنایا ہوا ہے۔''

''ناہیں جی! باپو کہوت ہیں ایشور نے سب کو ایک جیسا ناہیں بنایا۔ کوئی آپ کی طرح عقل مند اور شکتی والا ہے، کوئی ہماری طرح کم عقل اور کم جور ہے۔ کوئی پیسے والا ہے، کوئی گریب، کوئی گورا، کوئی کالا، کوئی مالک کوئی چاکر...... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سنسار ہی ناہیں چل

مانا تھا۔''

''سارے پرانے لوگن کی طرح تمہارے باپو کے دماغ میں بھی بھس بھرا ہوا ہے چمپی! بیکار ہے۔ کبھی کسی بڑے شہر میں جا کر دیکھو۔ چھوٹی سے چھوٹی جاتی کے لوگن بھی پڑھ لکھ کر بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ بڑی جاتیوں کے ناکارہ لوگن ان کی نوکری کرنے پر مجبور ہو جاوت ہیں۔ ہمارے دھرمی مہاشوں نے دھرم کو توڑ موڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب دیکھو، یہ جو کچھ ہمارے گاؤں میں ہو رہا ہے اس کا کارن بھی تو یہی ظلم اور انیائے ہے نا۔ حکم جی ان سفید پگڑی والوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ پھر ان مسلمانوں میں سے کچھ سر پھرے خون خرابا شروع کر دیوت ہیں۔''

''چھوٹے مالک! مجھ کو تو بڑا ڈر لگت ہے۔ میری دیدی کا دیور بھی اسپتال کے اندر ہے۔ دیدی کی ساس اور سسر کل سے رو رہے ہیں۔ کچھ لوگن اب کہوت ہیں کہ فوجی کبھی بھی اندر والوں کی بات ناہیں مانیں گے۔ وہ ایک دم اندر گھس جاویں گے اور پھر بہت خون خرابا ہو جاوے گا......''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نوجوان کی آواز اُبھری۔ ''چلو چمپی! چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو سب اندازے ہی ہیں۔ جو کچھ ہوگا، سامنے آ جاوے گا۔ تمہیں ٹھنڈ تو ناہیں لگ رہی؟''

''ناہیں جی۔''

''پر تمہارے گال تو ٹھنڈے ہیں۔''

''ہائے رام...... ایسا نہ کرو مالک۔ آپ کو پاپ لگے گا۔''

''تمہیں چھونے سے مجھے پاپ لگے گا؟'' وہ مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو اور کیا مالک! آپ پلید ہو جائیں گے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تو تمہیں چھوؤں گا ناہیں تو پریم کیسے کروں گا؟''

''مم...... مجھے بہت ڈر لگت ہے جی۔ آپ...... مجھے کپڑوں کے اوپر سے ہاتھ لگا لیں۔''

''چلو کہیں کہیں ایسا بھی کر لیں گے لیکن پاس تو آؤ نا۔'' پھر شاید اس نے چمپی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لوگن کو پتا لگ گیا تو میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ میں آپ کے چرن چھوتی ہوں، مجھے شما کر دیں۔''

''دیکھو، غلطی میں کر رہا ہوں اور شما تم مانگ رہی ہو۔ اس کو کہوت ہیں الٹی گنگا......

ویسے میں نے ایک دن پنڈت جی سے پوچھا تھا۔ وہ کہوت تھے کہ اگر نیچی ذات کی ناری اونچی ذات کے مرد کو سیوا (خدمت) کی نیت سے چھوئے گی اور ناری صاف ستھری بھی ہووے گی تو پھر پاپ ناہیں لگے گا۔ تم یہ سمجھو کہ تم سیوا کر رہی ہو۔"

"لل..... لیکن..... مالک....." پھر شاید نوجوان نے لڑکی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے ڈھانپ دیا تھا، اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ دونوں اب زمین پر بچھی چادر پر لیٹ گئے تھے۔ ان کی ہانپی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ منمنائی۔ "آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کو صبح اپنے پتا کے ساتھ مندر جانا ہے۔ میرے انگ سے لگ کر آپ پلید ہو رہے ہیں۔"

"یہ کوئی پلیدی ناہیں ہے۔ میں اشنان کر لوں گا۔"

"بڑے پجاری جی کہوت ہیں، ایسی پلیدی اشنان سے دور ناہیں ہوتی۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں بڑے پجاری کو بھی۔ چار سال پہلے بھنگن کی بیٹی کو جو جڑواں بچے ہوئے تھے اور مر گئے تھے، وہ اسی پجاری کے تھے....."

"ہائے رام! آپ کیسی باتیں کرت ہیں؟" اچھوت لڑکی لرز کر بولی۔

کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے رہے پھر لڑکی خود کو اپنے پریمی کی بانہوں سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گئی..... "بس مالک! اب مجھ کو جانے دو۔ کچھ دیر میں پو پھٹ جاوے گی پھر میرا جانا مشکل ہو جاوے گا۔"

دونوں اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نوجوان اسے چوم کر بولا۔ "مجھ سے پریم کرتی ہو نا؟"

"وہ کچھ دیر چپ رہی پھر دبی آواز میں بولی۔ "بہت زیادہ..... لیکن اس پریم کا انت کیا ہووے گا؟"

"میں تم سے بیاہ کروں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکت ہے جی؟ میں آپ کی باندی تو بن سکت ہوں، پتنی ناہیں۔"

"میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ ہم دونوں نل پانی چلے جاویں گے۔ وہاں ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کریں گے۔"

وہ دو چار منٹ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر لڑکی نے اوڑھنی جھاڑ کر اپنے سر پر لی اور کھیت سے نکل کر چلی گئی۔ نوجوان وہیں رکا رہا۔ وہ شاید لڑکی کے ساتھ ہی کھیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن وہ واپس جانے کے بجائے تھوڑا سا آگے آیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے لئے کوئی اچھا گنا منتخب کرنا چاہ رہا ہو یا پھر

شاید وہ ویسے ہی نظر دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے ہماری موجودگی کے بارے میں شک ہو گیا۔ وہ ذرا ٹھٹکا پھر اس نے تیزی سے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قمیص کے نیچے سے اپنا دیسی ساخت کا ریوالور نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز سے کہا۔ "کون ہے؟"

عمران تڑپ کر اس پر جا پڑا۔ اس نے پھرتی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر وہ تین چار گنا زیادہ پھرتیلا بھی ہوتا تھا شاید عمران سے بچ نہ سکتا۔ وہ عمران کے نیچے عین اس جگہ پر گرا جہاں کچھ دیر پہلے وہ چھپی کے ساتھ موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے چھپی اس کے نیچے تھی، اب وہ خود کسی کے نیچے تھا۔ عمران نے دائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی وہ کلائی پکڑ لی جو قمیص کے نیچے تھی۔ اس نے نیچے پڑے پڑے عمران پر مکا چلایا جو خالی گیا۔ عمران نے جواباً اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ عمران نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جدوجہد فضول ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ماچس کی تیلی روشن کر کے ہم نے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس نے مقامی انداز کی سفید دھوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ حلیے سے کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا۔ "یہ کون سی فلم کا سین ہو رہا تھا یہاں؟" عمران نے اس کی گردن میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"مم..... میں تو پیشاب کرنے آیا تھا۔"

"پیشاب کرتے ہوئے تم باتیں بہت کرتے ہو..... ہم سب کچھ سن رہے تھے۔" عمران نے جواب دیا۔

وہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے سب کچھ مان لیا۔ اس نے اپنا نام بھرت کمار بتایا۔ وہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا ابھی یہاں اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ ان کی حویلی کے ایک غریب نوکر کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے سچا پریم کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

بھرت نامی اس نوجوان کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ہم دونوں کی یہاں موجودگی پر بھی حیران تھا۔ میں اور عمران اس سے مقامی دیہاتیوں کے انداز میں، مَیں باتیں کرتے رہے لیکن وہ ہمارے اس انداز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ غالباً اسے شبہ تھا کہ ہمارا تعلق نل پانی سے یا پھر حکم کے دیگر مخالف لوگوں سے ہے اور ہم یہاں "اتھرا" گاؤں میں ہونے والے واقعات کی ٹوہ لے رہے ہیں۔

بھرت نامی اس نوجوان سے ہمیں تازہ ترین صورتِ حال معلوم ہوئی اور یہ تشویش ناک تھی۔ اس نے بتایا کہ اسپتال کی عمارت کے اندر جن حملہ آوروں نے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے، ان میں مختار راجپوت کی خطرناک بیٹی سلطانہ بھی شامل ہے۔

ہمارا یہ بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا تھا کہ بہت جلد ان لوگوں کو یہاں سلطانہ کی موجودگی کا علم ہو جانا ہے۔ اس انکشاف کی تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''حکم جی کے لوگن پہلے ہی سلطانہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو بھی پتا ہووے گا کہ کچھ مہینے پہلے سلطانہ نے زرگاں میں گھس کر چار اہم بندوں کو جان سے مار دیا تھا۔ ان میں موہن کمار بھی تھا جسے یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ سلطانہ کسی خطرناک گروہ میں بھی شامل ہے۔ کل یہ ایک زہریلا لفافہ لے کر پونم پور کے مندر میں گھسی تھی۔ وہاں یہ لفافہ اس نے کسی ایسی عورت کو دینا تھا جو اسے پرشاد کے حلوے میں ملا سکے...... تلاشی میں لفافے کا پتا چل گیا اور سلطانہ دو بندوں کو گھائل کر کے وہاں سے بھاگ نکلی۔ اب سوال یہ تھا کہ سلطانہ زہر والا لفافہ کس کو دینا چاہت تھی۔ مندر والوں کو تین عورتوں پر شک تھا۔ ان تین عورتوں کو باری باری ٹیکا لگایا گیا اور ان میں سے ایک نے اپنا اپرادھ قبول کر لیا۔''

''ٹیکا لگایا گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہی درد والا ٹیکا جو حکم کے سپاہی لگاتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے، دو چار منٹ میں پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔''

میں اور عمران سمجھ گئے کہ بھرت اسی منحوس انجکشن کی بات کر رہا ہے جو دو ڈھائی ماہ پہلے ہم نے میڈم صفورا کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں میں اس انجکشن کے حوالے سے بڑا ہراس پایا جاتا تھا۔ بھرت نے روانی میں اپنی بات جاری رکھی اور بتایا کہ جرم کا اعتراف کرنے والی ایک شوبھا نام کی عورت ہے لیکن اس کا اصل نام گلزار معلوم ہوا ہے۔ یہ ٹانگوں سے معذور ہے اور مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس نے مانا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ، اسی کو زہر کا پیکٹ دینے کے لئے مندر میں گھسی تھی۔

بھرت کے اس انکشاف کے بعد کہ سلطانہ کو پہچانا جا چکا ہے، یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں فوجیوں کی مزید کمک کیوں آئی ہے اور گھیرے کو مضبوط کیوں کر دیا گیا ہے۔ اب یہ زبردست تناؤ والا معاملہ بن چکا تھا۔ ایک طرف ماریا کی زندگی تھی اور دوسری طرف سلطانہ کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا معاملہ تھا۔

بھرت نامی اس کھتری نوجوان نے بتایا۔ ''رات گیارہ بجے کے قریب ہی یہ خبر ہر طرف

کل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اسپتال کے اندر حملہ آوروں میں جو لڑکی ہے، وہ مختار راجپوت کی بیٹی ہے۔ اب علاقے کے ہندوؤں...... میں بہت جوش پایا جاتا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ مختار کی بیٹی کو کسی صورت بھی نل پانی کی طرف جانے کی آ گیا نہیں دینی چاہئے۔ اسے نہیں پکڑ لینا چاہئے اور اس کو اس کے کرموں کی سزا ملنی چاہئے لیکن کچھ لوگن یہ بھی کہوت ہیں کہ ایسا ناہیں ہو سکے گا۔ حکم جی انگریزوں کی مرضی کے خلاف ناہیں چل سکتا اور انگریز بالکل بھی ناہیں چاہیں گے کہ سلطانہ کو مار دینے کے چکر میں اسٹیل گورا صاحب کی پتنی ماریا بھی ماری جاوے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا خیال ہے...... کیا ہونا چاہئے؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نئی نسل کے ان لوگن سے ہوں جو دھرم کے کٹڑپن کو اچھا ناہیں سمجھتے۔ اگر سلطانہ نے زرگاں میں چار لوگن کو مار کر اپرادھ کیا تو حکم اور جارج نے بھی دھرم کی آڑ میں سلطانہ کو پری بنانے اور رکھیل بنانے کی کوشش کر کے اپرادھ کیا تھا۔ سب کو پتا ہے کہ اب تک ساتویں کے جشن کے نام پر راجواڑے کی سیکڑوں لڑکیاں ''پری'' بن کر عزت گنوا چکی ہیں۔ حکم اور اس کے غیر ملکی دوست ان پریوں کے پر نوچ کر انہیں ہمیشہ کے لئے راج بھون کی غلام گردشوں اور تہ خانوں میں سسکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دکھ سہہ سہہ کر مر جاوت ہیں اور کچھ پرانی ہو کر نچلے درجے کے عہدیداروں کا کھلونا بن جاوت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سلطانہ نے اس انجام سے بچنے کی کوشش کی تو کچھ غلط ناہیں کیا۔ اگر اس کے اس اپرادھ کے کارن کچھ لوگن اسے زندہ جلانا چاہت ہیں تو وہ خود بہت بڑے اپرادھی ہیں۔''

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں ہمیں یقین ہو گیا کہ بھرت نامی یہ نوجوان، نئی پیڑھی کے ان لوگوں میں سے ہے جو دھرم کو موم کی ناک بنانے والے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی سے پیدا ہونے والی تمام خرافات کو دل سے برا جانتے ہیں۔ یہ نوجوان ہمیں اپنے لئے بالکل بے ضرر محسوس ہو رہا تھا۔

بھرت ہمیں مسلسل کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھیں، میں نے آپ کو اپنے بارے میں ساری جانکاری دے دی ہے لیکن آپ نے ابھی تلک کچھ ناہیں بتایا۔ مم...... میرا مطلب ہے کہ آپ ہیں کون؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کون ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کھیت مزدور ناہیں

ہو اور نہ ہی آپ کا تعلق اس علاقے سے ہے۔ شش..... شاید آپ تل پانی سے آئے ہیں اور..... کسی خاص کام سے یہاں پر ہیں۔"

"کس قسم کا خاص کام؟" عمران نے دریافت کیا۔

"کہیں آپ کا تعلق چھوٹے سرکار کے سپاہیوں سے تو ناہیں؟ میرا مطلب ہے، کچھ لوگن خفیہ جانکاریاں لینے کے لئے بھی تو تل پانی سے یہاں آوت ہیں۔"

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری پہلی بات تو درست ہے کہ ہمارا تعلق تل پانی سے ہے لیکن اگر تم ہمیں جاسوس وغیرہ سمجھ رہے ہو تو یہ غلط ہے۔ تمہاری طرح ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس خون خرابے کو برا سمجھتے ہیں۔ ہمیں کل دوپہر یہ اڑتی سی خبر ملی تھی کہ "نونم پور" کے مندر میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ ہم اسی بارے میں جاننے کے لئے اس علاقے میں آئے تھے کہ یہاں اس گاؤں میں بھی ہنگامے کا پتا چلا۔"

بھرت نے کہا۔ "بھائی صاحب! یہ سارا علاقہ بڑا شانتی والا تھا۔ کوئی ہلچل ناہیں تھی کیونکہ یہ تل پانی سے دور ہے اور زرگاں سے بھی۔ یہاں کسی کا بھی زیادہ اثر رسوخ ناہیں ہے لیکن زرگاں چونکہ ذرا کم دور ہے، اس لئے حکم کے سپاہی یہاں نظر آتے رہوت ہیں۔ گڑبڑ اس وقت سے ہوئی ہے جب سے زرگاں میں سامبر والا مقابلہ ہوا ہے۔ آپ لوگن کو بھی پتا ہووے گا، اس مقابلے کی گونج پورے راجواڑے میں سنائی دی ہے..... سلطانہ کے پاکستانی پتی سے جارج گورا کے ہارنے اور پھر مارے جانے کی اطلاع نے سب کو ہکا بکا کر ڈالا ہے۔ اب کچھ لوگن کا کہنا ہے کہ سلطانہ کا پتی اور اس کا پاکستانی ساتھی جیت تو گئے تھے مگر حکم جی وغیرہ انہیں چھوڑنا ناہیں چاہت تھے۔ صرف دھرم کی مانگ پوری کرنے کے لئے انہیں عارضی طور پر چھوڑا گیا تھا..... انہوں نے اس عارضی چھوٹ کا زبردست فائدہ اٹھایا اور چکما دے کر نکل بھاگے۔ اب زیادہ لوگن کا خیال یہی ہے کہ وہ ابھی تل پانی واپس ناہیں پہنچے اور اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ جیپ سوار فوجی ان کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرتے رہوت ہیں۔ اب یہ دوسرا واقعہ مختار راجپوت کی بیٹی والا ہو گیا ہے۔ خون خرابا ہوا ہے اور ابھی لوگن کو اور زیادہ خون خرابے کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بھرت! تمہاری کیا رائے ہے..... اس معاملے کا انجام کیا ہونا چاہئے؟" اب میں اور عمران پہلے کی طرح بھرت سے مقامی لہجے میں بات نہیں کر رہے تھے۔

بھرت نے بے تکلفی سے عمران کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اس کے دو کش لئے اور

بھرپور سوچ نظروں سے گاؤں کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مدھم خدوخال دیکھ سکتے تھے۔ اوس سے بھیگے ہوئے کھیت میں خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد بھرت نے کہا۔ "میری تو بھگوان، اللہ اور واہگرو سے یہی پرارتھنا ہے کہ یہ معاملہ شانتی سے حل ہو جاوے۔ سلطانہ اور میم (ماریا) دونوں کا جیون بچ جاوے۔ حملہ آور جو بندہ مانگ رہے ہیں، انہیں دے دیا جاوے، اس طرح میم بھی مرنے سے بچ جاوے گی اور سلطانہ بھی زندہ سلامت یہاں سے نکل جاوے گی۔ پر پتا ناہیں کیوں لگت ہے کہ کچھ لوگن ایسا ناہیں ہونے دیویں گے۔ وہ چاہت ہیں کہ ایسا نہ ہو۔"

"وہ لوگ کون ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"حکم کے ارد گرد کے کچھ لوگ ہی ہیں۔ اس کے چند فوجی افسر، کچھ مذہبی سوچ رکھنے والے رشتے دار، پنڈت مہاراج اور اس کے کچھ ساتھی..... اور ایک بڑی کڑک بڑھیا بھی۔"

بڑھیا کے ذکر پر میں اور عمران چونکے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا دھیان سید حامالا کی دادی ساس پر گیا۔ "تم کس بڑھیا کی بات کر رہے ہو؟" میں نے بھرت سے پوچھا۔

"ہے ایک ..... اس نے آج کل بڑا اودھم مچایا ہوا ہے زرگاں میں۔ بے شمار بے وقوف اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ پتا ناہیں اسے کس کس دیوی کا نیا روپ قرار دے رہے ہیں۔ زرگاں میں اس بڑھیا کی ضد تھی کہ سلطانہ کے پاکستانی پتی کو جارج گورے سے مقابلے کی آ گیا نہ دی جاوے بلکہ اس سے ایک بڑے اپرادھی کا سلوک ہو اور اس کو مار پیٹ کر اس سے اس کی اپرادھن پتنی کا پتا ٹھکانا پوچھا جاوے لیکن پنڈتوں نے کہا کہ سلطانہ کا پتی چونکہ جارج گورے کو سامبر کی دعوت دے چکا ہے، اس لئے اسے قید میں ناہیں رکھا جا سکتا۔ تقریباً سارے پنڈتوں کا خیال یہ تھا کہ سلطانہ کا پتی سامبر مقابلہ ہار جاوے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پتنی کا کھوج دینے پر بھی مجبور ہو جاوے گا لیکن ہو گیا، اس کے الٹ۔ اس پر اس بڑھیا نے زبردست واویلا مچایا تھا اور مرن برت رکھ لیا تھا۔ اس مرن برت میں بھوک پیاس کی وجہ سے یہ بڑھیا دم پخت ہو گئی۔ لوگن نے سمجھا کہ یہ بھگوان کو پیاری ہو گئی ہے۔ انہوں نے مشتعل ہو کر خوفناک ہنگامہ کر دیا۔ اس ہنگامے میں قریباً تیس زرو ش مسلمان زندہ جل گئے لیکن بعد میں اسپتال جا کر پتا چلا کہ فساد کی جڑ ابھی جوں کی توں موجود ہے۔ بڑھیا زندہ تھی۔ لوگن نے اس کو بھی چمتکار قرار دیا۔ اس کو چاندی میں تولا گیا اور اب اسے "بڑی ماتا" کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ زرگاں کے ہزاروں لوگن اسے کسی سوامی کی سی عزت دے رہیں۔ یہ ہے ہم لوگن کی سمجھ بوجھ۔"

"یہ بڑی ماتا اب کیا فرماتی ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"اس کی بس ایک ہی ہٹ ہے۔ کہتی ہے کہ میں نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو سزا دلوانے کے لئے اپنا پورا پریوار قربان کر دیا ہے۔ اس کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ نہ ملے گی تو زرگاں پر تباہی اور بربادی آوے گی۔ یہاں کی گلیوں میں لوگن کی لاشوں پر کتے بلیاں منہ ماریں گے۔ بس اسی طرح کی پیش گوئیاں کرت ہے۔ یہ بڑی کٹر اور خرانٹ بڑھیا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانت ہوں۔ اس کی ایک قریبی رشتے دار ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ وہ آج کل بھی یہاں ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"اس بڑھیا کی بہو کی بہو۔ مالا نام ہے اس لڑکی کا۔ تھوڑا پڑھی لکھی بھی ہے۔ اچھے برے کی سمجھ بوجھ رکھتی ہے لیکن اس کی قسمت کہ بیاہ کر سخت کٹر گھرانے میں چلی گئی۔"

مالا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ وہ اجلے چہرے والی روشن خیال لڑکی جو اپنے کٹر سسرالی گھرانے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ جب [illegible] پور کے پرانے مندر میں بڑھیا کا ادھیڑ عمر بیٹا آزمائش میں ناکام ہوا اور اس [illegible] تیل میں جھلس گئے تو وہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد سے مالا اور اس کا شوہر ستیش غائب تھے۔ آج اتنے دنوں بعد مالا کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم بھرت نامی اس نوجوان سے مالا کے بارے میں کچھ اور پوچھتے، ایک بار پھر اسپتال میں سیون ایم ایم رائفل گرجی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں میں ہلچل نظر آئی......

اب رات کا اندھیرا کافی حد تک اجالے میں ڈھل چکا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ فائر کے فوراً بعد اسپتال کے اردگرد موجود سپاہیوں اور گارڈز نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا کہ یہ لوگ اسپتال پر ہلا بول دیں گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر پھر ایک دم قدرے ٹھہراؤ محسوس ہوا۔ ہم نے دو تین انگلش فوجی افسروں کو دیکھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور مقامی فوجیوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ ان کے حکم پر مقامی فوجی اور گارڈز وغیرہ رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ تھوڑا پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر وہی منظر دہرایا گیا جو ہم اس سے پہلے دو بار دیکھ چکے تھے۔ عورتوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ چار پانچ افراد ایک چارپائی لے کر احاطے میں گئے اور ایک لاش اُٹھا کر باہر لے آئے۔ اس بات میں کوئی

شبہ نہیں رہا تھا کہ سرپھرے آفتاب خاں نے اپنی خوفناک دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک اور یرغمالی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔

"کہیں ڈاکٹر لی وان ہی نہ ہو۔" عمران نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"لیکن جس طرح مقامی عورتیں رو پیٹ رہی ہیں، شاید کوئی مقامی ہی مرا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے بھرت کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا انداز سمجھ کر بولا۔ "اگر آپ کہو تو میں جا کر ٹھیک جانکاری لے آتا ہوں؟"

میری اور عمران کی نگاہیں ملیں۔ یقیناً ہم دونوں ہی بھرت کو بھروسے کے قابل سمجھ رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنا ہم خیال لگ رہا تھا اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عمران نے اس کا دیسی ریوالور بھی واپس کر دیا۔

اب اجالا پھیل گیا تھا۔قرب و جوار کی ہر شے روشن تر تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں بہت سی جیپیں اور فوجی گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اسپتال کے گرد مختلف جگہوں پر پوزیشنیں بھی لی ہوئی تھیں۔ عام لوگوں کو اسپتال کی عمارت سے بہت دور ہٹا کر راستوں کی ناکابندی کر دی گئی تھی۔ اسپتال کے اردگرد کے تمام مکانات خالی کرا لئے گئے تھے۔ ان گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں دوربینوں کے شیشے چمک رہے تھے اور رائفلوں کے بیرل صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ سلطانہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میں اب اسے کبھی اپنے سامنے زندہ سلامت نہیں دیکھ سکوں گا...... میرا وہ سپنا اب کبھی پورا نہیں ہو گا جس میں ایک خوش رنگ شام کو میں اور سلطانہ اکٹھے ہوتے اور سلطانہ کی بانہوں میں ہنستا مسکراتا بالو ہوتا۔

''وہ دیکھو تابی!'' عمران نے دور ایک طرف سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''میرے خیال میں گاؤں کا شمشان گھاٹ ہے۔کوئی لاش جلائی جا رہی ہے۔''

شمشان گھاٹ سے اُٹھتے ہوئے ارتھی کے دھوئیں نے ماحول کو کچھ اور بھی گھمبیر کر دیا۔ اسپتال سے کچھ فاصلے پر تازہ لاش کے گرد بَین کرتی عورتوں کی دل خراش آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا کے دوش پر یہ آوازیں کبھی بلند اور کبھی دھیمی محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جو آخری چیز ہم نے لی، وہ بے مزہ سی چائے کا ایک کپ تھا۔ یہ کپ ہم نے تب پیا تھا جب آفتاب خاں سائیکل مرمت کی دُکان پر سائیکل ٹھیک کروا رہا تھا اور سلطانہ مندر میں جا چکی تھی۔ ہم نے چائے خانے میں بیٹھ کر آفتاب پر

آگاہ رکھی تھی۔ ان واقعات کو اب چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ بہرحال، بھوک کی جتنی شدت محسوس ہونی چاہئے تھی، وہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی وجہ موجودہ تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ یہ اور بات ہے کہ خالی پیٹ ہونے کے سبب ایک نقاہت سی رگ و پے میں اُتری ہوئی تھی۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم تناؤ محسوس کرنے لگے۔ بار بار ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہمارا بھروسا غلط تو نہیں۔ اس نے آدھ پون گھنٹے میں آنے کا کہا تھا مگر اب ڈیڑھ گھنٹا ہو چلا تھا۔ اس کی واپسی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ ''اگر یہ بھرت اکیلا آنے کے بجائے بیس پچیس مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے آیا تو پھر؟''

''پھر میں تمہیں یرغمال بنا لوں گا اور کہوں گا کہ اگر ان میں سے کوئی آگے آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' وہ بولا۔

''تو پھر کیا ہو گا؟ وہ کہیں گے کر دو شوٹ۔ تمہارا ہی ساتھی ہے۔''

''میں انہیں ساری حقیقت بتاؤں گا جگر! انہیں بتاؤں گا کہ اپنے اس ساتھی کے قیمتی مشوروں کی وجہ سے ان لوگوں کا کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نالائق دوست سے عقل مند دشمن کے بہتر ہونے والا مقولہ حکم کے سپاہیوں نے بھی سن رکھا ہو گا۔''

''میں نے کون سا بے عقلی کا مشورہ دیا ہے تمہیں؟''

''بہت سے ہیں۔ تازہ ترین مثال تو یہی ہے کہ تم نے گنے کے کھیت میں گھسنے کا مشورہ دیا جبکہ میں مکئی کے کھیت میں گھسنا چاہتا تھا۔ مکئی کا کھیت ہوتا تو ہم بھوک سے یوں تو نہ بلکتے...... دو چار بھٹے توڑتے اور بھون کر کھا لیتے۔''

''بھٹے بھوننے کے لئے آگ درکار ہوتی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''آہ......'' اس نے لمبی آہ بھری۔ ''آگ کی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ آگ تو عاشق کے دل کے اندر بھی موجود ہوتی ہے۔ وہ سنا نہیں تم نے...... خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں...... میں نے تم سے ریما جی کا ذکر کیا تھا نا۔ انہوں نے سینے میں ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ دو چار بھٹے تو کیا دو چار بکرے بھی روسٹ ہو سکتے ہیں لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ ایک طرفہ معاملہ ہے۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ تمہیں بتایا تھا نا کہ شوٹنگ میں موٹر سائیکل کا کرتب دکھاتے ہوئے میں اور ریما جی گر گئے تھے۔ بس اسی وقت سے یہ محبت شروع ہو گئی...... بلکہ میرے خیال میں موٹر سائیکل بعد میں گری، محبت پہلے شروع ہو گئی تھی...... اب تم پوچھو گے کہ اگر آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے تو پھر شادی میں اڑچن کیا ہے۔ پوچھو

گے نا؟"

"نہیں پوچھوں گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بڑے شرارتی ہو...... اصل میں اڑچن یہ ہے کہ ریما جی شادی کے بعد بھی فلموں میں کام کرانا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ وہ شان اور معمر رانا جیسے گرم اور خطرناک ہیروز کے ساتھ ہیروئن آئیں۔ اس کا جواب وہ یہ دیتی ہیں کہ ان کی خاطر میں خود بھی فلم لائن میں آ جاؤں۔ انہیں پتا ہے کہ میں بنا بنایا ہیرو ہوں، فوراً ہٹ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ صرف ان فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائیں گی جن میں، مَیں ہیرو ہوں گا۔ اب یہاں پھر ایک مسئلہ ہے۔ میں اداکاری کر کر کے تنگ آ چکا ہوں بلکہ مجھے اس شعبے سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ اب یقیناً تم پوچھو گے کہ میں نے کہاں اداکاری کی ہے...... پوچھو گے نا؟"

"فرماؤ...... کہاں کی ہے؟"

"یہ بالکل بیکار سوال ہے اور اسی لئے تم نے کیا ہے۔ میرے بھائی! یہ نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن ہونا اداکاری ہی تو ہے۔ خاص طور سے نیوز کاسٹری تو اداکاری کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں اداکاری کا جتنا مارجن ہے، دیوداس اور بیجو باورا فلموں میں بھی نہیں ہے۔ تم دیکھنا، عنقریب نانا پاٹیکر اور نصیر الدین شاہ جیسے لوگ خبریں پڑھا کریں گے......"

اس کی طولانی گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچتی مگر اسی دوران میں ہمیں دور سے بھرت کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے...... کھیتوں کے قریب پہنچ کر بھرت نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ دو منٹ بعد وہ کماد کے نہایت گھنے اور بلند کھیت کے اندر ہمارے سامنے تھا۔

"بڑی دیر لگا دی۔" عمران نے کہا۔

"شما چاہت ہوں۔ میں پہلے گھر چلا گیا تھا۔ اصل میں مجھے لگ رہا تھا کہ آپ دونوں کو بھوک لگی ہووے گی۔ یہ کچھ بھوجن لایا ہوں آپ کے لئے۔" اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں مکھن، روٹی سالن اور ایک بوتل میں چھاچھ تھی۔

"اس کے لئے بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں گاؤں کی خبر دو۔ گولی کس کو ماری گئی ہے؟"

بھرت بولا۔ "ڈاکٹر لی وان کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کی دوسری نرس مالتی کو مارا گیا ہے۔ میرے خیال میں مالتی کا چناؤ اس لئے ہوا ہے کہ

اس نے بال تراشے ہوئے تھے، انگریزی بھی بول لیوت تھی اور کھلے ڈلے انداز میں بات کرت تھی۔ یہ زرگاں سے یہاں آئی ہوئی تھی۔"

یہ افسوس ناک صورتِ حال تھی۔ ہم نے کبھی مالتی کو دیکھا نہیں تھا، اس کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تھے پھر بھی رنج ہوا۔ یقیناً یہ جو کچھ ہو رہا تھا، آفتاب ہی کر رہا تھا۔ اس میں سلطانہ کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔ میں نے بھرت سے پوچھا۔ "اب اسپتال کی صورتِ حال کیا ہے؟"

بھرت نے کہا۔ "مالتی کو گولی لگنے کے بعد ایک دم ہلچل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ سپاہی ایک دم اسپتال پر دھاوا بول دیویں گے مگر انگریز افسروں اور پانڈے صاحب وغیرہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔"

پانڈے کا نام سن کر ہم دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ عمران نے کہا۔ "یہ پانڈے وہی...... رنجت پانڈے ہے نا جو حکم کا خاص آدمی ہے؟"

بھرت نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اب انگریز افسر اینڈرسن صاحب اور حملہ آوروں کے درمیان بات ہوئی ہے۔ اینڈرسن صاحب نے کل سہ پہر چار بجے تک کا سمے مانگا ہے اور کہا ہے کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا کر دیا جاوے گا۔"

"یعنی ہاشم کو یہاں پہنچا دیا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... اور یہاں سے نل پانی جانے کے لئے ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور چار گھوڑے بھی دے دیئے جاویں گے۔ پٹھان حملہ آور نے یہ سمے دے دیا ہے اور کہا ہے کہ کل چار بجے تک وہ مزید کسی شخص کی ہتھیا نا ہیں کریں گے۔ اس بات چیت کے بعد مسلح فوجی اسپتال کے پھاٹک سے کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اینڈرسن صاحب نے باہر سے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی اندر بھیجا تھا لیکن حملہ آوروں نے وہ واپس کر دیا ہے۔ شاید ان کو اس بارے میں کوئی شک ہووے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے پاس کھانے پینے کو بہت کچھ ہے۔"

میں نے اور عمران نے دیکھا۔ بھرت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زرگاں کے مسلح کمانڈوز جو کچھ دیر پہلے اسپتال کے گیٹ کے عین سامنے پوزیشنیں سنبھال چکے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے، اب ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی اضافی تشویش کا باعث تھی۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین پولیس افسر تھا اور یہ جہاں بھی موجود ہوتا تھا، وہاں خطرات کے بادل منڈلانے لگتے تھے۔

بھرت نے بڑی اپنائیت سے ہمیں ناشتا وغیرہ کرایا۔ وہ میرا لباس دیکھ کر حیران ہو رہا

تھا۔ میں سوئٹر یا کوٹ کے بغیر تھا۔ گرم چادر کی بھی خاص ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بھرت نے کہا۔ ''بھائی جی! آپ کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گھر سے آپ کے لئے کچھ لے آؤں؟''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

عمران فوراً بولا۔ ''یہ انڈین فوج میں رہا ہے اور سیاچن پر ڈیوٹی دیتا رہا ہے۔ اس میں سردی محسوس کرنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ جون، جولائی میں تو اسے برف کے بلاک پر لیٹنا پڑتا ہے۔''

بھرت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی کڑی مشقوں اور سینڈ بیگ کے مسلسل استعمال سے ہاتھ پاؤں کی کھال موٹی ہو کر رنگ بدل چکی تھی۔

بھرت بولا۔ ''لگتا ہے فوج میں آپ نے لڑائی بھڑائی کی بھی خاصی ٹریننگ کی ہے؟''

''ہاں، ہمیں ایک خاص آپریشن کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ بڑی سخت ٹریننگ ہوئی تھی لیکن بعد میں ایک شرابی افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میں فوج سے بھاگ آیا...... اور یہاں پہنچ گیا۔'' میں نے گول مول بات کی۔

عمران نے بھی بھرت کو اس سے ملتی جلتی کہانی سنائی۔ اس نے اپنا نام شیام اور میرا کرشن بتایا۔ ہم ایک دوسرے پر کافی حد تک بھروسا کرنے لگے تھے۔ ہم نے بھرت کو بتایا کہ اس سارے معاملے کے انجام تک ہم یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ فراخ دلی سے بولا۔ ''آپ میرے گھر پر آ جاویں۔ بڑے بھیا زرگاں گئے ہوئے ہیں۔ باپو کی طبیعت ٹھیک ناہیں، وہ اپنے کمرے تک ہی رہت ہیں۔ میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہراؤں گا۔ کوئی اس طرف ناہیں آوے گا...... میں ملازموں کو بھی منع کر دوں گا۔''

عمران نے کہا۔ ''اچھا اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔'' پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا خیال ہے، رات تک تو یہیں ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک تو ہے لیکن اگر کھیت کا مالک یا کام کرنے والے مزدور اس طرف آ نکلے تو پھر؟''

بھرت مسکرایا۔ ''ایسا کوئی خطرہ ناہیں۔ یہ کھیت میرا ہے۔ آپ دونوں بے فکر ہو کر بیٹھو اور من چاہے تو گنا وغیرہ بھی چوسو۔ جس مزدور نے اس کھیت کو دیکھنا تھا، میں اسے کسی دوسری طرف بھیج دوں گا۔''

''زبردست۔'' عمران نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم ستانے کے لئے لیٹ گئے۔ اب ہر طرف خوش گوار دھوپ پھیل گئی تھی۔ اوس تیزی کے ساتھ پتوں اور گھاس پر سے غائب ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈک کا احساس بھی کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی طرف اب سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً کل تک کی مہلت کے بعد دونوں فریق ہی کم تناؤ محسوس کر رہے تھے۔ ہم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہی گزارا تھا۔ اب نرم دھوپ کا لمس محسوس ہوا تو اونگھ آنے لگی۔ رائفل بالکل تیار حالت میں عمران کے سینے پر دھری تھی۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزرا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ عمران اُٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں بھی اُٹھ بیٹھا۔ کسی خطرے کے وقت عمران کی تمام حسیں برق رفتاری سے بیدار ہو جاتی تھیں۔ اب بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ نہ صرف ہمہ تن گوش تھا بلکہ ہوا میں بھی کچھ سونگھ رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' میں نے مدھم سرگوشی کی۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

چند لمحے بعد مجھے بھی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ عمران نے رائفل ہاتھ میں لے لی۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ کوئی دشمن یا پھر کوئی عام دیہاتی جو اپنی ضرورت کے تحت کھیت میں گھسا تھا یا پھر کوئی جانور وغیرہ؟ یہ بھرت تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ہوتا تو سامنے سے آتا اور ہمیں دکھائی بھی دیتا۔

چند سیکنڈ سخت تناؤ میں گزرے۔ آواز قریب آتی گئی۔ آخر آنے والا سامنے آ گیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا آوارہ کتا تھا۔ یہ عام حالت میں بھی بندے کو خوف زدہ کر سکتا تھا مگر اب وہ جس حالت میں تھا، وہ بڑی دہشت ناک تھی۔ اس کتے کی تھوتھنی پر ایک گہرا زخم تھا...... اس کے گلے میں ایک رسّی اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کا منہ سوج کر اصل سائز سے تقریباً دُگنا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ کتے کی آواز گھمبیر اور لرزا دینے والی تھی۔ یوں لگا کہ وہ کسی بھی لمحے ہم پر حملہ کر دے گا۔

عمران نے پہلے تو رائفل اس کی طرف سیدھی کی لیکن پھر اسے نیچے کر لیا۔ وہ گہری نظروں سے جانور کی طرف دیکھتا رہا، تب منہ سے پچ پچ کی آواز نکالی اور اسے پچکارا۔ میں نے دیکھا، حیران کن طور پر کتے کا اشتعال کم ہو گیا۔ عمران کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور بغیر کسی کراہٹ کے کتے کے سر کو ہاتھ سے سہلایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میری

طرف بڑھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاقو مانگ رہا ہے۔ میں نے چاقو اسے تھما دیا۔ کتا اضطراب کے عالم میں کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتا، کبھی ایک قدم آگے آتا تھا۔ رسّی اس کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے پہلے اس رسّی کو چاقو کی دھار سے کمزور کیا پھر توڑ دیا۔ گردن کا آزاد ہونا اس جانور کے لئے موت سے زندگی کی طرف...... آنے کی طرح تھا...... اس نے ہمارے گرد ایک چکر کاٹا پھر تیزی سے فصل میں گم ہو گیا۔

آج مجھے عمران میں اسی عمو کی جھلک نظر آئی تھی جو چند سال پہلے تک سرکس کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا تھا اور شیر، بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ غالباً اس میں وہ پہلے جیسی صلاحیت تو موجود نہیں تھی لیکن اب بھی تھوڑے بہت اثرات اس میں پائے جاتے تھے۔

''زبردست۔'' میں نے تعریفی انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کہ جانوروں کے حوالے سے اب بھی کچھ نہ کچھ بات تم میں موجود ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے کیونکہ تم جیسے سرکش کو اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔'' اس نے فوراً چوٹ کی۔

میں نے کہا۔ ''فضول بحث شروع کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنے تعریفی الفاظ واپس لے لوں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بس یہی سرکشی ہے تمہاری۔ فوراً جواب دینے لگے ہو۔ بڑوں کا احترام ختم ہوتا جا رہا ہے تمہارے اندر۔''

میں نے کہا۔ ''ایک طرف بزرگ بنتے ہو، دوسری طرف یہ بتاتے ہو کہ ریما سے تمہارا عشق زوروں پر ہے۔''

''عشق کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ پکی عمر کا عشق پرانی شراب کی طرح زیادہ نشے والا ہوتا ہے لیکن میں یہاں عمر کی بات نہیں کر رہا۔ میں ''عقل'' کے لحاظ سے تمہارا بزرگ ہوں بلکہ اس لحاظ سے تم مجھے اپنا پڑدادا کہہ سکتے ہو۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر اس عقل کو سات پردوں میں چھپا کر کیوں رکھتے ہو؟ میں نے تو کبھی اس کی جھلک نہیں دیکھی۔'' میں بھی بحث کے موڈ میں آ گیا۔

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس عقل مندی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کبھی ٹی وی پر میرا ٹاک شو دیکھنا...... چار چار گنجے دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کرتا ہوں...... اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کو ایک ساتھ بولنے پر مجبور کرتا

ہوں۔ ایک گھنٹے کے شو میں اگر ان کی ایک بات بھی کسی کی سمجھ میں آ جائے تو میں اپنا نام بدل دوں۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ ان کی بات کا سمجھ میں نہ آنا کوئی قابلِ تعریف چیز ہے؟''

''اوئے گھامڑ...... یہی تو قابلِ تعریف چیز ہے۔ ان کی بودی باتیں اور پیش گوئیاں سننے والوں کی سمجھ میں آ جائیں تو بھٹا بیٹھ گیا ناٹاک شو کا۔ اینکر پرسن کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ ''دانشور'' بس بولتے ''نظر'' آئیں، سنائی نہ دیں اور اگر سنائی دینے لگیں تو اینکر پرسن مزید شور و غوغے کے لئے خود بھی بحث میں کود پڑے......''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، تم ہر وقت طنزیہ انداز میں بات کرتے ہو اور تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہو۔ میڈیا کی بہت سی اچھی باتیں بھی تو ہیں۔''

''بہت سی اچھی باتیں نہیں، میڈیا میں ہیں ہی اچھی باتیں تم مجھے ورغلانے کی کوشش نہ کرو۔''

''میں کیا ورغلاؤں گا، تم پہلے ہی ورغل شدہ ہو بلکہ ورغل ہو۔ اب دیکھو...... میڈیا ریاست کا ایک اہم ستون بن کر سامنے آیا ہے۔ کیمرے کی آنکھ دور دور تک اور گہرائی تک دیکھ رہی ہے۔ غیر قانونی کاموں پر، حکومتی غفلتوں اور قدرتی آفتوں وغیرہ پر اتنا شور مچایا جاتا ہے کہ بچہ بچہ باخبر ہو جاتا ہے۔ نقب زن جس طرح روشنی سے ڈرتا ہے، اسی طرح قانون شکن میڈیا سے ڈر رہا ہے۔''

''اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری قدر کرو۔ وہ کیا شعر ہے، ڈھونڈو گے ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔''

''مگر تم یہ سب کچھ طنز کے انداز میں کہتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کی شرارت سو میل دور سے نظر آتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں اپنے ہی ساتھ شرارت کرتا ہوں۔ یعنی ہاتھ پیچھے کر کے خود کو ہی پتھر مارتا ہوں اور خود ہی حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں۔''

''ایسا ہی کرتے ہو...... تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ مشکل ترین حالات میں کام کر رہے ہیں۔ خطرناک ترین جگہوں پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بدترین لوگوں کی دشمنیاں مول لیتے ہیں۔ بے شک ان سے بھی غلطیاں کوتاہیاں ہوتی ہیں، پر غلطیاں کوتاہیاں تو ہر شعبے میں ہیں۔''

''تو پھر سلام کرو نا مجھے۔''

''میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سلام کروں لیکن دور ہی سے۔''

''یعنی تم اپنا راستہ الگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں سچ مچ زبان لگ گئی ہے اب تم ہر بات پر میچ ڈالنے کے موڈ میں آتے جا رہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ملاؤ ہاتھ۔'' اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس میں بھی شرارت کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہی ہاتھ تم نے پانچ منٹ پہلے بدبودار کتے کو لگایا ہے۔ ویری سوری۔''

''بڑے کھوچل ہو گئے ہو تم۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہو گئی۔ کماد کا یہ کھیت ایک بار پھر تاریکی اور سردی میں ڈوبتا چلا گیا۔ گاؤں کے اندر گاڑیوں، اسلحے اور گارڈز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تا۔ ایک بڑا جنریٹر بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس جنریٹر کی گھوں گھوں مسلسل ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ جنریٹر کی مدد سے چلنے والی روشنیوں نے اسپتال اور اس کے تین اطراف کی گلیوں کو پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ یقیناً یہ معاملہ زرگاں کے لئے بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا اور اس کی وجہ ماریا اور سلطانہ کا ایک اسپتال کے اندر موجود ہونا تھا۔

بھرت نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد ہمیں لینے آئے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہاں سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات گزارنے کے بجائے اس کی آرام دہ حویلی میں قیام کریں۔ وہ ہمیں ہر طرح کی سہولت اور حفاظت کا یقین دلا رہا تھا لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں تھا۔ شاید پھر کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ اچانک میں نے عمران کو پھر چونکا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اس کی غیر معمولی حسیات اسے کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے بھی یہ احساس ہو گیا۔ ہمارے آس پاس کھیت کے اندر یا ساتھ والے کھیت میں کوئی موجود تھا۔ عمران نے سگریٹ فوراً بجھا دیا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور جھکے جھکے انداز میں اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً ہمیں ساتھ والے کھیت میں کچھ سائے نظر آئے۔ مکئی کے اس کھیت میں پُراسرار انداز میں حرکت کرنے والے سایوں کی تعداد سات کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھاپا مار کارروائی کرنے والے سپاہیوں کی طرح جھک کر چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا بھرت کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط نکلا ہے؟ عمران نے رائفل تیار حالت میں کر لی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور تہ بند کی ڈب سے نکال لیا اور بالکل چوکس ہو گیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ اپنی پوزیشن پر رہیں اور اگر وہ ہم پر فائر کھولیں تو ہم جوابی فائر کر کے انہیں مارنے یا بھگانے کی کوشش کریں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم اپنی یہ پوزیشن چھوڑ کر بھاگ نکلیں

اور روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ دونوں صورتوں میں خطرات موجود تھے۔ ان لمحوں میں، مَیں عمران کی اعصابی مضبوطی اور ان معاملوں میں اس کی مہارت کا اندازہ ہوا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید ان لوگوں کے قریب آنے پر فائر کرتا یا پھر بھاگ کر دوسرے کھیت میں گھسنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی آنکھ وہ دیکھ چکی تھی جو میری آنکھ نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری کلائی پر رکھ کر مجھے یہ اشارہ دیا کہ میں فائر وغیرہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت اور جامد بیٹھا تھا۔ آنے والے ہماری طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کے قدموں کی چاپ چند میٹر کی دوری پر محسوس ہوئی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ہماری طرف نہیں آ رہے۔ وہ ہم سے قریباً دس قدم کے فاصلے سے اور بالکل سامنے سے گزرے۔ ہم نے اپنے سانس تک روک لئے تھے۔ رنجیت پانڈے کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''اور کتنی دور ہے؟'' اس نے کہا۔

''بس پہنچ گئے جی۔ وہ سامنے کیکر کے پیڑوں کے پاس۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی۔

وہ ہمارے پاس سے گزر کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ وہ اندھیرے میں بغیر کسی لالٹین یا ٹارچ کے جا رہے تھے۔ انداز سخت محتاط تھا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''دیکھنا پڑے گا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ کتا پانڈے بھی ساتھ ہے۔''

ہم نے دیکھا، درختوں کے قریب جا کر وہ سائے رک گئے پھر غائب ہو گئے۔ وہ نشیب میں اُتر گئے تھے۔ ''تم ادھر رکو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ساتھ چلنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

عمران پہلے تو انکار کے موڈ میں نظر آیا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہر موقع پر وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے خطرے سے بچانا بھی چاہتا تھا، دوسری طرف خطروں کا خوگر بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بے حد احتیاط سے اس نشیب کی طرف بڑھے جہاں رنجیت اور اس کے ساتھی اوجھل ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر ہم اوندھے لیٹ گئے اور سن گن لینے لگے۔ اندازہ ہوا کہ رنجیت اور اس کے ساتھی جھنڈ کے بالکل قریب نشیبی جگہ پر موجود ہیں۔ ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

اب زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے گئے۔ ہماری انگلیاں اپنے

ہتھیاروں کے ٹریگرز پر تھیں اور ہم کسی بھی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ درختوں کی طویل قطار کے آگے زمین کا کٹاؤ نظر آیا۔ یہاں ایک وسیع جوہڑ کی سی شکل بن گئی تھی مگر یہ جوہڑ تقریباً خشک تھا۔ متحرک سائے اس نشیب میں موجود تھے۔ اب انہوں نے دو ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور کسی خاص چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رنجیت کی مدھم لیکن کرخت آواز اُبھری۔ ”پائپ تو یہی لگتا ہے لیکن پتا ناہیں کب سے بند پڑا ہے۔ پہلے اسے کھولنا پڑے گا۔“

”بس مٹی وغیرہ سے بند ہو گیا ہے۔ ابھی کھل جاوت ہے جی۔“ دوسری آواز اُبھری۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کدال چلنا شروع ہو گئی۔ کدال چلانے والا کوئی مزدور ٹائپ شخص تھا۔ وہ وردی کے بجائے ہماری طرح دھوتی اور پگڑی میں نظر آ رہا تھا۔ رنجیت پانڈے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اوئے بہن کے چھکنے! دھیان سے کدال چلا۔ کہیں پائپ پر نہ مارنا۔“

ایک دو منٹ بعد کدال واقعی پائپ پر لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ پانڈے پھنکارا۔ ”تجھے کہا بھی تھا کہ اس ماں کو دھیان سے چلا۔“ اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز آئی۔ یقیناً شعلہ مزاج پانڈے نے مزدور کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ پھر وہ پھنکارتی آواز میں کسی سپاہی سے بولا۔ ”رامو! تو پکڑ کدال اور خبردار آواز پیدا ناہیں ہونی چاہیئے۔“

دوسرا شخص کدال چلانے لگا۔ ایک ٹارچ کا روشن دائرہ مسلسل کھدائی والی جگہ پر مرکوز تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک پرانے سیوریج پائپ کا دہانہ نظر آنے لگا۔ سیمنٹ کا یہ پائپ قریباً تین فٹ قطر کا ہو گا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کا خطرناک ترین کمانڈو رنجیت پانڈے اپنے ایک سفید فام ساتھی کے ہمراہ پائپ میں داخل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ سفید فام بھی کوئی تربیت یافتہ کمانڈو ہی تھا۔ یہ دونوں افراد پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ ہمیں یہ شک بھی پڑا کہ یہ شاید دو کے بجائے تین افراد ہیں۔ یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ سب کچھ تقریباً واضح ہو چکا تھا۔ یہ پرانا سیوریج پائپ اسپتال کی عمارت کے اندر تک جا رہا تھا۔ اسپتال میں موجود آفتاب خاں اور سلطانہ کو زبردست قسم کا ”شاک“ پہنچنے والا تھا۔

عمران نے میرا بازو دبایا۔ ہم تیزی سے واپس مڑے۔ رینگتے ہوئے بیس پچیس میٹر کی دوری تک گئے کھیت میں داخل ہوتے ہی ہم کھڑے ہو گئے اور جھک کر بھاگتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھے۔ آفتاب یہاں اسپتال میں جو کچھ کر رہا تھا، ہم ہرگز اس کے حق میں

نہیں تھے لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اور سلطانہ...... پانڈے جیسے شخص کے ہاتھوں بے موت مارے جائیں۔

گنے کے کھیت میں اپنے ٹھکانے تک پہنچتے ہی عمران نے واکی ٹاکی اُٹھایا اور اس پر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بار بار بیپ دینے والا بٹن دبایا۔ انٹینا کو گھمایا۔ پاور کو آن آف کیا لیکن حسبِ معمول رابطہ نہیں ہو سکا۔ واکی ٹاکی بے جان پڑا تھا۔ دو تین منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد عمران نے سخت جھلاہٹ میں واکی ٹاکی کو ایک طرف پٹخ دیا۔ وہ جاگ اُٹھا۔ سبز اور سرخ روشنیاں جل اُٹھیں۔ بیپ کی مدھم آواز پیدا ہونے لگی۔ یہ بیپ دوسری طرف آفتاب والے سیٹ پر جا رہی تھی۔ ہم ہمہ تن گوش تھے۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے آفتاب کی بھاری آواز اُبھری۔ ”ہیلو۔“

عمران بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ”آفتاب! تم پر حملہ ہو رہا ہے۔ پانڈے اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ آفتاب کی چونکی ہوئی آواز اُبھری۔

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔ سوال نہ کرنا۔ ابھی چار پانچ منٹ پہلے ہم نے پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو کھیتوں میں دیکھا ہے۔ یہاں ایک پرانا سیوریج پائپ ہے۔ یقیناً اس کا دوسرا سرا اسپتال کے احاطے یا پھر پچھلے صحن میں کہیں ہو گا۔ ان لوگوں نے اس پائپ کو کھولا ہے۔ پانڈے اور اس کا ایک انگریز ساتھی اس پائپ میں گھسے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے اندر پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں ہیں۔ تم دیکھ لو، تم نے اپنا بچاؤ کیسے کرنا ہے......“

”ٹھیک ہے۔ ام دیکھتا ہے۔“ آفتاب نے جلدی سے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔

ہم جو کچھ کر سکتے تھے، ہم نے کر دیا تھا۔ اب آگے آفتاب اور سلطانہ کی قسمت تھی۔

پندرہ بیس منٹ سخت بے چینی کے عالم میں گزرے، تب اسپتال کی عمارت کی طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ پہلے یکے بعد دیگرے رائفل کے تین فائر ہوئے۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ عمران نے بتایا کہ یہ ایل ایم جی کا برسٹ ہے۔ اس برسٹ کے بعد دوطرفہ گولیاں چلیں۔ یہ سلسلہ بمشکل ایک منٹ جاری رہا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ عمارت کے ادرگرد درجنوں ٹارچیں گردش کر رہی تھیں۔ جیپوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں۔ ایک چھکڑا ایمبولینس کی گول گھومتی سرخ بتی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ بہت سے امکانات ذہن پر یورش کر رہے تھے۔ کیا

آفتاب اور سلطانہ مارے گئے ہیں؟ کیا پانڈے اور اس کا ساتھی ناکام ہوئے ہیں؟ کیا وہ اب بھی اندر موجود ہیں؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے۔ دس پندرہ منٹ اسی شدید کشمکش میں گزرے پھر ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف حرکت کے آثار نظر آئے۔ نشیب میں سے دو ٹارچوں کے روشن دائرے اوپر آئے اور گنے کے کھیتوں کی طرف آنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اور ان کے ساتھ کوئی زخمی بھی ہے۔'' عمران نے اپنی تیز نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دو منٹ بعد پانڈے اور اس کے ساتھی ہمارے قریب سے گزرے۔ پانڈے کا انگریز ساتھی زخمی ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس کی کرب ناک کراہیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ تب پانڈے کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جلدی کرو۔ خون تیجی (تیزی) سے بہہ رہا ہے۔'' وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس کے بعد اس نے کسی کو گالی دی اور کہا کہ وہ زخمی کی ٹانگیں اوپر اُٹھا کر رکھے۔ پچیس تیس سیکنڈ میں وہ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اطمینان کی ایک طویل سانس عمران کے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے پانڈے کا آپریشن پی جی ناکام ہوا ہے۔''

''آپریشن پی جی کیا مطلب؟''

''آپریشن براستہ پائپ اور گٹر۔'' اس نے روانی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، عمارت کے اندر سے پھر سیون ایم ایم کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بولا۔'' مجھے تو لگتا ہے سر پھرے آفتاب نے پھر کسی کو لڑھکا دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یرغمالی کو؟''

عمران نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ صورتِ حال بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار پھر عمارت کے اردگرد شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے درجنوں فوجی اور مشتعل دیہاتی اپنی برداشت کھو کر عمارت کے اندر گھس جائیں گے اور اس ڈرامے کا خونی ڈراپ سین سامنے آ جائے گا۔ مگر انگریز افسروں کو پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ماریا بھی ماری جائے گی اور یہ انہیں کسی طور قبول نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں لالٹینوں اور ٹارچوں کی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ تین چار افراد

ایک چارپائی کے ساتھ اندر گئے ہیں اور تازہ لاش لے کر باہر آ گئے ہیں۔ ایک بار پھر رونے پیٹنے کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ ایک بار ٹارچ کی ایک روشنی اسپتال کی چھت پر پانی والی گول ٹینکی کے قریب بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ آفتاب خاں ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چھت پر سے حکم کے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ بھی رہا ہو مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہم کچھ سن نہیں سکتے تھے۔

عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ آفتاب نے ''پاور آف'' کر رکھا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہماری بائیں طرف سے ایک ہیولا کھیتوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چال ڈھال سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھرت ہی ہے۔ بھرت محتاط انداز سے کھیت میں داخل ہوا اور ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ بولا۔ ''شما چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہوئی۔ وہاں اسپتال کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فائرنگ کی آواز تو آپ دونوں نے بھی سنی ہووے گی۔''

''ہاں، آواز تو سنی ہے، پر ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے گھر پہنچتے ہیں پھر میں سب کچھ بتاوت ہوں۔'' بھرت نے کہا۔

ہم بھرت کے ساتھ چلنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ یخ بستہ ٹھنڈ نے ہڈیوں میں اُترنا شروع کر دیا تھا۔ منہ سے بھاپ خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں ماریں، پگڑیاں اس طرح لپیٹیں کہ چہرے بھی کافی حد تک چھپ گئے۔ ہمارا واحد سامان کسّیاں ہی تھیں۔ یہ ''کسّیاں'' ہم نے کھیت مزدوروں کی طرح کندھوں پر رکھیں اور بھرت کے ساتھ گاؤں کی روشنیوں کی طرف چل دیئے۔

بھرت کا حویلی نما مکان گاؤں کی شمالی جانب تھا۔ یہ جگہ اسپتال کی عمارت سے قریباً آدھا فرلانگ کے فاصلے پر ہو گی۔ ہم دو بڑی گھوڑا گاڑیوں کے قریب سے گزرے۔ یہ دونوں گاڑیاں باوردی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ مسلح پہرے دار بھی نظر آئے۔ چونکہ بھرت ہمارے ساتھ تھا، اس لئے کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی جانور کھیتوں میں سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ یہ وہی بڑے سائز کا کتا تھا جس کے گلے میں دھنسی ہوئی رسّی عمران نے کاٹی تھی۔ وہ یقیناً ابھی تک ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ اس کا ہمارے پیچھے پیچھے آنا ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمران کے اچھے سلوک کی وجہ سے اسے ہمارے ساتھ وابستگی پیدا ہو

گئی ہو۔ عموماً جانور اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی تھی اور یہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ عمران کی طویل رُوداد میں، مَیں نے اس کی اس خاص صلاحیت کے بارے میں جانا تھا جو وہ جانوروں کے حوالے سے رکھتا تھا...... یہ بظاہر ناقابلِ یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ عمران کے حوالے سے کچھ بھی ناقابلِ یقین نہیں ہوسکتا۔ وہ بے پناہ مقناطیسی کشش کا مالک تھا۔ یہ کشش انسانوں پر اثر کرتی تھی تو دیگر جانداروں کو بھی متاثر کر سکتی تھی۔

عمران نے بھی کتے کو اپنے ساتھ ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ کتے کے چہرے کی غیر معمولی سوجن اب بہت کم رہ گئی تھی۔ وہ ذرا لنگڑاتا ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ بھرت نے ایک دو بار اسے شُشکارا۔ وہ ٹھٹکا ضرور لیکن ہم سے دور نہیں گیا۔

ہم جلد ہی بھرت کے نیم پختہ مکان میں پہنچ گئے۔ بھرت نے ہمیں مکان کے بیرونی حصے میں ٹھہرایا۔ یہ ایک لمبا برآمدہ تھا جس کے ساتھ دو تین بیٹھک نما کمرے تھے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی کھاتے پیتے ہندو زمیندار کی رہائش گاہ ہے۔ بھرت کا بڑا بھائی زرگاں میں تھا۔ والد دمے کی تکلیف کی وجہ سے [illegible]رے تک محدود تھے۔ گھر میں کئی نوکر چاکر تھے۔ ان میں گندمی رنگت والی وہ لڑکی بھی شامل تھی جس کا نام ہمیں چمپی معلوم ہوا تھا اور جس نے گنے کے کھیت میں بھرت سے محبت بھری ملاقات کی تھی۔ چمپی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی اسی گھر میں خدمت گار تھی۔ مکان کے وسیع احاطے میں ایک طرف بھینسوں اور بکریوں وغیرہ کا باڑا تھا۔

یخ بستہ کھیت میں سے اس آرام دہ گھر میں منتقل ہونا ہمیں کافی اچھا لگا۔ بھرت نے دیسی مرغی کے سالن، تندروی روٹی اور حلوے سے ہماری تواضع کی۔ ہندو گھرانوں میں عام طور پر گوشت نہیں پکتا لیکن بھرت نے ہمارے لئے پکوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں رازداری کے انداز میں بتایا کہ اسپتال میں سخت گڑبڑ ہوئی ہے۔ حملہ آوروں نے طیش میں آ کر چھوٹے ڈاکٹر راج کو مار ڈالا ہے اور لاش اسپتال کے احاطے میں پھینک دی ہے۔

طیش کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے معلوم تو ناہیں بھیا لیکن لگت ہے کہ حکم کے سپاہیوں نے خفیہ طور پر اسپتال کے اندر گھسنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اس خیال کا ایک کارن یہ بھی ہے کہ پانڈے صاحب یہاں موجود ہے اور جہاں پانڈے صاحب موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی ہلچل والا کام تو ہوتا ہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسپتال میں گھسنے کی یہ کوشش ناکام ہوگئی ہے اور ایک گورے افسر پیٹر صاحب کو ٹانگوں پر گولیاں بھی لگی ہیں۔ اس

واقعے کے فوراً بعد ہی اندر موجود پٹھان حملہ آور نے بے دردی سے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو گولی سے اڑا دیا...... اور چھت پر چڑھ کر دھمکی دی کہ اگر سپاہیوں کی طرف سے کوئی اور چال چلی گئی تو وہ سب کچھ ختم کر ڈالیں گے۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹے ڈاکٹر صاحب کی ہتھیا کے بعد تو ایسا لگت تھا کہ لوگن اسپتال پر چڑھ دوڑیں گے مگر انگریز افسر مسٹر اینڈرسن نے لوگن کو روکا۔ اب مجھے لگت ہے کہ گورے افسروں نے حملہ آوروں کی ''مانگیں'' ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہوسکت ہے کہ مہلت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ہاشم رازی رہا ہو کر یہاں پہنچ جائے۔''

''کیا ہندو برداری کو اس کی رہائی قبول ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''بھیا! یہ ہے تو بڑا مشکل۔ سنا ہے کہ سب سے زیادہ شور وہی بڑی بی مچا رہی ہے۔ زرگاں کا بہت سا لوگن اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہ نئی نئی پیش گوئیاں کر رہی ہے۔ دوسرے شبدوں میں اس نے حکم جی کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ حکم کے لئے ممکن ہی ناہیں کہ وہ اپنے انگریز دوستوں کے خلاف چل سکے۔ اسے ہر حال میں وہی کرنا ہووے گا جو انگریز افسر اور مسٹر اسٹیل وغیرہ کہیں گے۔ چاہے اس کے لئے اسے بڑی بی اور اس کے خاص حمایتیوں کو جیل میں ڈالنا یا انہیں سورگ باشی کرنا پڑے۔''

وہ رات ہم نے بھرت کے آرام دہ گھر میں گزاری۔ اگلا سارا دن بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ ہم بھرت کے مکان کی چھت سے اسپتال اور اس کے اردگرد کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو چکی تھی۔ اسپتال گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے وسیع احاطے اور برآمدوں میں کسی طرح کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔

رات قریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم بھرت کے ہمراہ اس کے گھر کی چھت پر تھے، اچانک گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ کل تین جیپیں تھیں۔ یہ اسپتال کے عین سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی۔ بھرت نے کہا۔ ''میں دیکھ کر آوت ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔''

وہ گیا اور دس پندرہ منٹ بعد اس نے آ کر بتایا کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا ہوگیا ہے۔ ہاشم رازی زرگاں سے رہا ہو کر یہاں پہنچ گیا ہے۔ بھرت نے بتایا۔ ''حملہ آوروں کو ایک گھوڑا گاڑی دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے تاکہ وہ یہاں سے روانہ ہوسکیں۔''

"اور ماریا کا کیا بنے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"جب ہاشم رازی کو اندر بھیج دیا جاوے گا تو ماریا باہر آ جاوے گی۔ ماریا کے ساتھ ہی اندر موجود کچھ عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ دیا جاوے گا۔ باقی لوگن یرغمالی کے طور پر حملہ آوروں کے پاس رہیں گے۔ ان میں ایک انگریز بھی شامل ہے۔ یہ لوگن گھوڑا گاڑی پر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ نل پانی کی حد پر پہنچ کر جب حملہ آوروں کو پورا وشواس ہو جاوے گا کہ اب وہ محفوظ ہیں تو باقی یرغمالیوں کو چھوڑ دیا جاوے گا۔"

"یرغمالیوں میں انگریز کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اصل میں پانڈے کے ساتھ ایک ناہیں دو گورے کمانڈو اندر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ٹانگوں میں تو گولیاں لگی ہیں لیکن دوسرے کو زخمی حالت میں قیدی بنا لیا گیا ہے۔"

ہمارا یہ شک درست نکلا تھا کہ پانڈے کے ساتھ دو گورے پائپ لائن میں گھسے تھے...... عمران نے بھرت سے پوچھا۔ "ماریا اور ہاشم رازی کا تبادلہ کب ہوگا؟"

"آج رات ہی کسی وقت ہو جاوے گا۔ اس سلسلے میں زرگاں کی بڑی جامع مسجد کے امام قادر بخش صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ اصل میں یہ سارا معاملہ انہوں نے ہی طے کراویا ہے۔ انہوں نے دونوں طرف وعدے کی پاسداری کی ضمانت دی ہے۔ حکم کے افسروں کی طرف سے بھی وچن دیا گیا ہے کہ وہ نل پانی کے راستے میں کسی طرح کی کوئی کارروائی ناہیں کریں گے اور حملہ آوروں کو ہاشم رازی سمیت نل پانی میں داخل ہونے دیویں گے۔"

آدھ پون گھنٹے بعد بھرت دوبارہ سن گن لینے کے لئے اسپتال کی طرف چلا گیا۔ ہمارے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ کمرے میں گھس کر ہم نے واکی ٹاکی آن کیا اور ایک بار پھر آفتاب سے رابطے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے رابطہ ہو گیا۔ آفتاب خاں اب قدرے پُرسکون محسوس ہوتا تھا۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ ہاشم رازی یہاں آ چکا ہے اور اب کسی بھی وقت ماریا کے ساتھ اس کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو ڈاکٹر لی وان اور دیگر یرغمالیوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ میرے کہنے پر وہ نیچے گیا اور اس نے سلطانہ سے بھی میری بات کروائی۔ سلطانہ کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی ہے تاہم اس کا اعصابی تناؤ اب کم محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ! تم لوگ کب تک یہاں سے نکلو گے؟"

"آفتاب کہہ رہا ہے، ابھی دو ڈھائی گھنٹے تو لگیں گے۔ شاید...... ہم کل شام تک نل پانی پہنچ سکیں اگر سب کچھ ٹیغ (ٹھیک) رہا تو۔" اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ مت...... اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ کل رات ہم نل پانی کے دیوان میں ملیں گے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بالو، وہیں ہے نا؟" میں نے اس کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ کہنے لگی۔ "میں اسے بہت پیار کرنا چاہتی ہوں مہروج۔ میں نے اس معصوم کو بہت دکھ دیا ہے۔ بڑا انتجار کرایا ہے اسے۔ میں بہت اِچ بری ماں ہوں مہروج۔ میرا اللہ مجھے ماف کر دے گا نا؟"

"اگر سچے دل سے معافی مانگی جائے تو وہ ضرور معاف کرتا ہے۔"

"اور...... آپ بھی کر دیں گے نا؟"

"مجھے کوئی گلہ نہیں ہے سلطانہ۔"

"لیکن میں نے آپ کو رنج تو دیئے ہیں نا۔ اگر آپ......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ واکی ٹاکی پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر دو افراد بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سلطانہ نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے ہاشم صاحب اندر آ گئے ہیں...... ہاں، یہ ہاشم صاحب ہی ہیں۔ امام صاحب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آفتاب انہیں لے کر اندر آ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اب ہمیں یہاں سے نکلنے میں جیادہ سمے ناہیں لگے گا لیکن آپ کہاں ہیں مہروج؟"

"میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ بےفکر رہو۔"

"مجھے یخین ناہیں ہو رہا مہروج کہ سب کچھ ٹھیغ ہوتا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی آشا بس ختم اِچ کر چکی تھی۔ اچھا اب میں بند کرتی ہوں۔ آفتاب اور ہاشم صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔" میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بھرت ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، وہ زخمی کتا ابھی تک گلی میں گھوم رہا تھا جس سے کماد کے کھیت میں ملاقات ہوئی تھی۔ عمران نے بھی اسے دیکھا مگر تبصرہ نہیں کیا۔ تبصرے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

بھرت کے بوڑھے پتا جی صحن میں گھوم رہے تھے اور مسلسل کھانس رہے تھے۔ بھرت نے ابھی تک انہیں ہماری موجودگی سے بےخبر رکھا ہوا تھا۔ ہم چھت کی تاریکی میں سے انہیں دیکھتے رہے۔ وہ بمشکل چل پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتے

ہوئے کسی کمرے میں چلے گئے...... تاہم ان کی کھانسی کی آواز آتی رہی۔ ہمیں ابھی تک یہ اندیشہ تھا کہ یہاں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ خاص طور سے بھرت کے بڑے بھائی کی فکر تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھومنے پھرنے والا شخص ہے۔ وہ اب بھی زرگاں میں تھا۔ اگر اس نے زرگاں میں ہمیں دیکھا ہوتا تو اس کی واپسی کے فوراً بعد ہمارے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

بھرت کی واپسی میں دیر ہوئی تو ایک بار پھر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی تھی؟ بھرت نے واپس آنے میں آدھ گھنٹا مزید لگا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی واضح نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر گڑبڑ ہو گئی...... اور اس دفعہ بڑی سخت ہوئی ہے۔ پتا ناہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔''

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ہمارے پوچھنے پر بھرت نے بتایا۔ ''ہاشم رازی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ بہت ہی سخت اور کٹر بندہ ہے...... بلکہ کچھ لوگن اس کو جنونی کہوت ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ اس نے اندر پہنچ کر صاف کہا ہے کہ وہ ابھی ماریا کو ناہیں چھوڑے گا۔ ماریا کو اس سے رہائی ملے گی جب وہ نل پانی کی حد تک پہنچ جاویں گے۔ اس کی وجہ سے امام قادر بخش سخت مصیبت میں آ گئے ہیں۔ وہ اس سمجھوتے کے ضامن تھے اور وہی ہاشم رازی کو اندر لے گئے تھے۔ انگریز افسروں اور پانڈے وغیرہ نے امام صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر ماریا کو کچھ ہوا تو وہ بھی برابر کے جرم وار ٹھہریں گے۔ ان بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔''

یہ بس کچھ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس ہاشم رازی کے بارے میں پہلے بھی ہمارے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ہم نے حکم کے دربار میں اسے جنونیوں کی طرح چنگھاڑتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جو اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیالوں کے سوا ہر شخص کو کافر یا منافق قرار دیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کا نقصان پہنچانا جائز سمجھتے ہیں۔ حکم کے دربار میں ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہاشم نے اپنے ہیجانی خیالات کے زیر اثر کئی مسلمانوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جب سب کچھ طے تھا تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اندر جا کر ہاشم کو کل رات والے واقعے کی جانکاری ملی ہے۔''

''کون سا واقعہ؟''

''وہی پانڈے اور دو گورے چھاپا ماروں کے اندر گھسنے والا واقعہ۔ اس کے بعد ہی وہ بھپرا ہے اور اس نے کہا ہے کہ یہ لوگن پھر دھوکا دیں گے۔ حالانکہ میری سمجھ کے مطابق اس کا یہ وچار بالکل غلط ہے۔ اس کو کسی اور پر ناہیں تو بڑے امام صاحب پر تو وشواس کرنا چاہئے اور پھر اتنے یرغمالی بھی ہیں اس کے پاس جن میں ڈاکٹر لی وان کے علاوہ وہ زخمی انگریز افسر بھی ہے۔''

اسی دوران میں اسپتال کی چھت کی جانب سے کسی کے غصیلے انداز میں دہاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بھرت بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ ہاشم بول رہا ہے۔ انگریز افسر اینڈرسن صاحب نے اسے بات چیت کرنے کے لئے بیٹری سے چلنے والا لاؤڈ اسپیکر بھجوایا ہے۔''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آئے۔ یہ واقعی ہاشم رازی تھا۔ وہ اسپتال کی چھت پر موجود تھا مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میگافون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیر کر اس کی مشتعل آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ''...... بکواس مت کرو۔ تم لوگن خود دغاباز ہو، فریبی ہو۔ اب ہم تمہارا فریب ناہیں چلنے دیں گے۔ وہی کچھ ہووے گا جو ہم چاہیں گے۔ میم تب چھوٹے گی جب ہم نل پانی پہنچ جاویں گے۔''

ایک قریبی گھر کی چھت سے ایک دوسری آواز آئی۔ یہ بھی میگافون کے ذریعے آئی تھی۔ بولنے والا حکم کا کوئی افسر تھا۔ اس نے انگریز افسر اینڈرسن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب کہوت ہیں، تم زبان دے کر پھر رہے ہو۔ کیا تمہارا دھرم تمہیں اس کی اجازت دیوت ہے؟ یہ سراسر جھوٹ اور مکاری ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور کس بات پر وشواس کیا جا سکتا ہے؟''

''یہ جھوٹ اور مکاری ناہیں۔'' ہاشم دہاڑا۔ ''یہ سب کچھ لڑائی کا حصہ ہے اور تم لوگن خود کہوت ہو کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہووت ہے......''

حکم کے افسر نے کہا۔ ''اچھا...... یہ ایک منٹ، امام صاحب سے بات کرو۔''

چند سیکنڈ بعد میگافون پر امام قادر بخش صاحب کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ ''ہاشم! تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح وعدے سے پھرنا ٹھیک ناہیں۔ اس سے فساد ہو گا...... اور اس فساد میں اگر کچھ جانیں گئیں تو اس کا بوجھ بھی تم پر آئے گا۔ میں نے تمہیں ضمانت دی ہے اور ایک بار پھر پوری ذمے داری کے ساتھ یہ ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت

نل پانے جانے کی اجازت دی جائے گی......"

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں امام صاحب! لیکن آپ ایک سیدھے سادے شخص ہو۔ آپ کی دوڑ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک ہے۔ آپ ان گوروں کے چلتر ناہیں جانتے۔ جب ہم ان کے نشانے پر آ گئے تو یہ طوطے کی طرح آپ کی طرف سے آنکھیں پھیریں گے۔ ایک ناہیں سنیں گے آپ کی۔ آپ اس معاملے سے ایک طرف ہو جائیں۔"

"میں کس طرح ایک طرف ہو جاؤں ہاشم؟ میں ضامن ہوں تمہارا۔ یہ مجھے بھی تمہارا ساتھی کہنے لگے ہیں۔ مجھے اور میرے سارے خاندان کو جیل میں سڑا دیں گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟"

"ایسا کچھ ناہیں ہوگا مولانا! یہ حرامجادے آپ پر صرف دباؤ ڈال رہے ہیں اور اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی بات ہو بھی تو آپ کی طرف سے اس کارِ خیر میں حصہ ڈلے گا۔ یہ سچ اور جھوٹ کی لڑائی ہے۔"

"لیکن اس لڑائی میں بے گناہوں کا خون بہے گا ہاشم۔ ان بیمار بچوں اور عورتوں کا کیا قصور ہے جنہیں تم لوگوں نے قیدی بنایا ہوا ہے؟ ان کا لہو کس کی گردن پر ہوگا؟"

"یہ کھلی جنگ ہے مولانا...... اور جنگوں میں فوجیوں کے ساتھ شہری بھی مرتے ہیں لیکن جو بے گناہ مریں گے، ان کو صلہ ملے گا۔ ان کی بخشش ہووے گی......" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر دہاڑتی آواز میں بولا۔ "اور میں ایک بار پھر سب کو وارننگ دیوت ہوں۔ اگر کل سویرے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو ہم ناپاک لوگن کی لاشوں کو صحن میں پھینکنا شروع کر دیویں گے اور سب سے پہلے مرے گا یہ بڈھالی وان......"

بڈھالی وان...... اس کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر لی وان وہ شخص تھا جو اپنی خداداد قابلیت کے ساتھ مقامی لوگوں کی بے لوث خدمت کر رہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے جسم کو گھسیٹتا ہوا اس دور دراز علاقے میں اپنے کسی ذاتی مطلب سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ایک موقع پر آفتاب نے اسے اسپتال سے بحفاظت نکال دینے کی آفر کی تھی لیکن اس نے اپنے عملے اور اپنے مریضوں کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اکثر قابلِ ترین لوگوں کی طرح کچھ سنکی اور موڈی تھا مگر اس کی ان کیفیات میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی اور اب چھوٹے ڈاکٹر راج کی طرح ڈاکٹر لی وان بھی موت کے دہانے پر تھا۔ صورتِ حال ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ گھمبیر ہو چکی تھی۔

میگا فون پر ہونے والی بات چیت ختم ہو چکی تھی۔ ہم بھی چھت سے نیچے آ گئے۔ گھر کے اندر خوش گوار حرارت موجود تھی۔ چمپی نے ہمارے بستر لگا دیئے تھے اور انگیٹھی وغیرہ دہکا دی تھی۔ وہ پُرکشش صورت اور جسم کی مالک تھی۔ بھرت کے اردگرد وہ یوں رہتی تھی جیسے کوئی داسی، دیوتا کے گرد پروانہ وار منڈلاتی ہے۔ اس کی نگاہیں جیسے ہر وقت اپنے دیوتا کے چرن چھوتی رہتی ہیں۔ بھرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اپنے پتا کی طرح وہ بھی چکنی مٹی اور چونے وغیرہ سے بڑے خوب صورت مجسمے بنا لیتی ہے۔ اس کا پتا ان مجسموں کو بیچ دیتا ہے اور اس رقم سے چمپی کا جہیز بناتا ہے۔

مجسموں کی بات چلی تو بھرت نے ہمیں چمپی کے بنائے ہوئے چند Statue دکھائے۔ جوتیاں گانٹھتا ہوا موچی، کھیت میں ہل چلاتا ہوا کسان، پن گھٹ سے پانی لاتی ہوئی عورت...... یہ واقعی خوب صورت کام تھا۔ بھرت نے یہ مجسمے ایک چوبی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ عمران کی عقابی نظر نے دیکھ لیا کہ الماری میں ایک چور خانہ بھی ہے اور غالباً اس میں بھی مجسمے رکھے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھرت بھیا! کیا وہاں کچھ خاص نمونے ہیں؟"

بھرت نے دو لمحے توقف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ "اب آپ دونوں سب کچھ جان ہی چکے ہیں تو یہ بھی دیکھ لیں۔"

اس نے ایک چابی سے چور خانہ کھولا۔ اس میں وہ مجسمے تھے جو غالباً چمپی نے جذبات میں ڈوب کر بنائے تھے۔ یہ ایک دیوتا کے لئے ایک داسی کی بے مثال محبت اور خودسپردگی کی تصویر پیش کرتے تھے۔ شاید یہ مجسمے بناتے ہوئے چمپی خود بھی شرمائی تھی اور اس کی یہ شرم داسی کے خوب صورت چہرے پر بھی نقش ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرت نے اصرار کر کے چمپی سے یہ مجسمے بنوائے ہوں۔ تین چار مجسمے Couple STatues کی شکل میں تھے۔ ان میں داسی قریباً عریاں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دیوتا کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ کہیں اسے اپنے پُرکشش جسم کی نذر پیش کر رہی تھی۔ کہیں اس کی آغوش میں تھی۔

غالباً ایسے ہی خیالات عملی زندگی میں بھی چمپی کے رہے ہوں گے۔ ہم اس کی ایک جھلک رات کے وقت گنے کے کھیت میں دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنی ماں کی نگاہ بچا کر وہاں پہنچی تھی اور بھرت سے ہم آغوش ہوئی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر بھرت چاہے تو وہ اپنی اس شودر خادمہ کو کسی بھی وقت اپنی "بھرپور خدمت" پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا چاہتا نہیں تھا۔ وہ اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پوری عزت کے ساتھ بیاہ کرا ایک

اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔

کچھ اور مجسمے بھی چور خانے میں موجود تھے لیکن یہ جذبات انگیز مجسمے نہیں تھے۔ یہ تو سیدھے سادے دیوی دیوتاؤں کے Statue تھے۔ درگا دیوی، لکشمی دیوی، کرشن، لکشمن، ہنومان وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ''ان بے ضرر مجسموں کو کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''اس لئے کہ یہ چھپی نے بنائے ہیں۔ وہ نچلی ذات کی ہے۔ دھرم کے ٹھیکے داراسے یہ آگیا ناہیں دیتے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو ہاتھ لگائے۔ وہ شوق پورا کرنے کے لئے چوری چھپے ایسا کام کرت ہے۔''

باہر کسی تاریک گلی سے کتے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ وہی کتا تھا۔ عمران نے بھرت سے کہا۔ ''یار! یہ کتا زخمی ہے۔ اس کے گلے میں شاید شرارتی لڑکوں نے بہت کس کر رسّی باندھ دی تھی۔ یہ مرنے کے قریب تھا۔ ہم نے کھیت میں اس کی رسّی کھولی تھی۔ اگر ہو سکے تو کسی نوکر کو بھیج کر اسے اندر باندھ دو اور اس کی مرہم پٹی کرادو۔ یہ بڑا اپُن کا کام ہے۔''

بھرت نے کہا۔ ''ہاں، میں نے بھی کل اسے دیکھا تھا۔ چلو میں کسی نوکر سے کہوت ہوں۔ ویسے لگت ہے کہ تم کو جانوروں سے کافی پریم ہے؟''

''ہاں...... کچھ ایسا ہی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بے پر کی بھی اڑاتے ہیں کہ میں پہلے ایک جانور تھا یعنی بندر...... پھر ڈھائی تین کروڑ سال میں آہستہ آہستہ بندہ بن گیا۔ یعنی بندر کی ''ر'' اڑ گئی اور ''ہ'' لگ گئی۔ غور کریں تو اب بھی بندے کے لفظ میں تین چوتھائی حصہ بندر کا ہی ہے...... اور کچھ لوگوں میں تین چوتھائی صفتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔'' اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا، شاید بحث کے موڈ میں تھا۔ بہر حال میں نے اسے نظر انداز کیا۔

بھرت مسکرایا۔ ''تمہاری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں شیام بھائی۔''

بھرت کے باہر جانے کے بعد میں اور عمران ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ جو کچھ اسپتال میں ہو رہا تھا، بہت تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک سلطانہ مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید تین رات پہلے فتح پور کے پرانے مندر سے سنگین واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اب رک جائے گا اور موت کے گھیرے سے نکل کر پھر آزاد فضاؤں میں پہنچ سکے گی۔ اس ہٹ دھرم ہاشم عرف ہاشو نے ایک بار پھر صورتِ حال کو ریورس گیئر لگا دیا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ کیا مسٹر اینڈرسن اور پاٹے وغیرہ

ہاشم کی یہ بات مان لیں گے کہ وہ ماریا سمیت یہاں سے نکل جائے؟''

''نہیں...... لگتا ہے کہ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر ہاشم رازی اتنے سخت گھیرے میں بھی ان کی بات نہیں مان رہا تو پھر وہ نل پانی کی سرحد پر پہنچ کر بھی نہیں مانے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ خون خرابا ہوگا؟'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''آثار تو ایسے ہی ہیں۔''

''اس کو روکنے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں عمران؟ کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟''

''نہیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

ہم رات کو بہت تھوڑی دیر کے لئے سوئے۔ صبح سویرے بھرت کی زبانی ایک خبر ملی جو بڑی اندوہناک تھی۔ معلوم ہوا کہ شعلہ صفت ہاشم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے اور ڈاکٹر لی وان کے سر میں دو گولیاں اُتار کر اس کی لاش چھت پر سے صحن میں پھینک دی ہے۔ وہ شخص اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا جس نے بے لوث جذبے کے ساتھ اس راجواڑے کے بے شمار لوگوں کی جانیں بچائی تھیں۔ ہمارے دل غم سے لبریز ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جب عمران ڈاکٹر کو نل پانی سے زبردستی فتح پور لے کر آیا تھا تا کہ وہ میری گردن میں سے الیکٹرانک چپ نکال سکے۔ شروع میں ڈاکٹر بے حد سیخ پا رہا تھا اور اس نے کمرے سے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر عمران کو مارنا شروع کر دی تھیں۔ مگر جب عمران نے بڑے اسٹائل سے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی تھی تو وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی تمام توجہ اور مہارت میری گردن کے آپریشن پر صرف کر دی تھی۔

ہم کتنی ہی دیر خاموش اور آزردہ بیٹھے رہے۔ یہ کیفیت اس بوڑھے ناتواں شخص کے لئے تھی جس نے دلیری سے موت کو گلے لگایا تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کے کپتان کی طرح اس نے شدید خطرے کے وقت اپنا اسپتال اور اپنے مریض چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور موت کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔ بھرت کے مطابق وہ پورے دو دن سے بھوکا پیاسا اپنے مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں اس نے فوزیہ نامی ایک کم سن بچی کے گلے کا آپریشن اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اب وہ ہم میں نہیں تھا۔ اس کی لاش گاؤں کے مکھیا بلرام کی حویلی میں پڑی تھی اور سیکڑوں لوگ اس کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

بھرت نے ہمیں چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بارے میں بھی تفصیل بتائی۔ چھوٹے

ڈاکٹر راج سنہا کو کل رات مارا گیا تھا۔ بھرت نے بتایا کہ اب بہت سی باتیں کھل گئی ہیں۔ میم ماریا یہاں ڈاکٹر لی وان پر ڈورے ڈالنے آئی تھی۔ وہ اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتی تھی لیکن لی وان کی طرف سے ناکام ہو کر اس نے چھوٹے ڈاکٹر راج کو اس کام کے لئے چنا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم کس خاص کام کی بات کر رہے ہو؟“

بھرت گہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک سے تو پتا ناہیں لیکن جو لوگن اندر کی بات جانت ہیں، وہ کہوت ہیں کہ ڈاکٹر لی وان کو سلطانہ کے پتی کے ٹھکانے کے بارے میں پتا تھا اور شاید چھوٹا ڈاکٹر راج بھی جانتا تھا۔ میم ماریا بھی اس کا ٹھکانا ہی جاننا چاہت تھی۔ سامبر مقابلے میں اپنے سوتیلے بھائی جارج کی موت کے بعد سے وہ دیوانوں کی طرح سلطانہ کے پتی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہاں آ کر ماریا کو جلد ہی پتا چل گیا ہوگا کہ ڈاکٹر لی وان اور طرز کا بندہ ہے اور اس کے ڈھب پر ناہیں آوے گا۔ اس نے نوجوان ڈاکٹر راج پر اپنے حسن کا جال پھینکا اور کسی حد تک اسے گھیرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسپتال کے ایک ملازم نے جانکاری دی ہے کہ یہ میم صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے تک چھوٹے ڈاکٹر راج کے کمرے میں رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر پھر اور ہی چکر چل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا جو آپ کے اور میرے سامنے ہے۔ چھاپا مار وں نے اسپتال کو یرغمال بنا لیا۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت شاید اسی کارن ہوئی کہ وہ میم ماریا کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ عمران نے پوچھا۔

”چھوٹے ڈاکٹر نے ماریا کی مدد کرنے کے لئے احمقانہ بہادری دکھائی اور رات پٹھان چھاپا مار سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ سب کو وشواس ہے کہ اسی ناکام کوشش کی وجہ سے کل اسے گولی مارنے کے لئے چنا گیا تھا۔“

بھرت کی بات ختم ہوئی تو عمران نے کرتے کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر بھرت کو دیا۔ ”بھرت! یہ ایک بہت ضروری کام کرو۔ کسی طرح یہ پیغام انگریز افسر مسٹر اینڈرسن تک پہنچا دو۔“

”مسٹر اینڈرسن؟ کیا وہ تم کو جانت ہے؟“ بھرت نے پوچھا۔

”نہیں لیکن اس رقعے کو وہ ضرور اہمیت دے گا۔“ عمران نے کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ بھرت بھی کچھ ٹھٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

عمران بھرت کو ایک طرف لے گیا۔ دھیمی آواز میں اسے کچھ سمجھایا۔ بھرت کی تشویش قدرے کم ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

”یہ سب کیا ہے عمران؟ تم کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کندھے اچکائے۔

”رقعے میں کیا لکھا ہے تم نے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے۔ میں اس کا داماد بن جاؤں گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ یہاں کے ہندوؤں سے تو پہلے ہی گوروں کی بنتی ہے، زیادہ دشمنی مسلمانوں سے ہی ہے۔ اس رشتے داری سے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے گی اور میری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی کہ کسی گوری چمڑی والی حسینہ کو...... سمجھ گئے ہو نا تم؟“ اس نے ایک آنکھ میچی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم مسخرے ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے حس بھی ہو۔ وہاں اسپتال میں لاشیں گر رہی ہیں اور تم اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔“

”تم بھی تو سوال پر سوال کرتے ہو۔ کبھی اپنا دماغ بھی استعمال کیا کرو...... بلکہ میرے خیال میں تو یہ بات تمہارے دماغ شریف میں بھی آنی چاہئے تھی کہ اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا عمران! کہیں ہم کسی مصیبت کو دعوت نہ دے لیں۔ کیا تم نے اینڈرسن کو یہاں اپنی موجودگی کے بارے میں بتایا ہے؟“

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”میں نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں بتا بھی دیتا تو کوئی زیادہ خطرے والی بات نہیں تھی۔ تم ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”حکم اور اس کے انگریز دوستوں میں بڑا بھائی چارہ ہے لیکن فی الوقت دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ ہندو افسر اور سپاہی ہر صورت دھرم دشمن سلطانہ کو پکڑنا یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں اور انگریز افسروں کے نزدیک سب سے اہم بات ماریا کی زندگی بچانا ہے اور میں نے اینڈرسن کو جو رقعہ لکھا ہے، وہ اسی حوالے سے ہے اور اس کی تحریر اینڈرسن کے دل کو ضرور لگے گی۔“

”کیا کہا ہے تم نے؟“

”فی الحال بس اتنا بتایا ہے کہ وہ کسی بھی ہندو فوجی افسر یا سپاہی کو بتائے بغیر مجھ سے ملاقات کرے۔ میرے پاس اس کے لئے ایک بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کا تعلق سلطانہ کے پتی تابش اور اس کے ساتھی عمران سے ہے۔“

"اوہ گاڈ...... یہ کیا کر رہے ہو تم۔ یہ تو بڑا رسک والا کام کر دیا ہے تم نے۔" میں کراہا۔

"رسک والا کام ہی تو ہم کرتے ہیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھولے سے دوسرے پر بغیر جال کے چھلانگ لگانا، سر پر سیب رکھ کر چاقو سے نشانہ لینا، ریوالور کے چیمبر کو گھما کر تین چھ کا کھیل کھیلنا...... یہ سب کچھ رسک ہی تو ہے جگر! اور رسک ہی اپنی زندگی ہے۔ کیونکہ رسک سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔" اس نے عجیب کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا اور اس کھیل میں اس کی خوش قسمتی اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کس موڈ میں تھا کہ انچارج انگریز افسر کو خط لکھ مارا تھا۔

عمران نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ میری توقع کے خلاف اور عمران کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد بھرت ہانپا ہوا نمودار ہوا اور اس نے عمران سے کہا کہ مسٹر اینڈرسن اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

حویلی کی ڈیوڑھی کے پاس بھرت کی ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ بھرت نے خود کوچبان کی نشست سنبھالی اور گھوڑا گاڑی حویلی نما مکان کے پھاٹک سے نکل کر ایک طرف روانہ ہوگئی۔ دن چڑھ آیا تھا مگر ابھی گلیوں میں آمد ورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اِکا دُکا افراد خالی ہاتھ یا لوٹے وغیرہ لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ مویشیوں کے ایک دو ریوڑ بھی کھیتوں کی جانب جاتے دکھائی دیئے۔ ان کی گھنٹیاں اس ٹھٹھری ہوئی دھند آلود صبح میں ارتعاش پیدا کرتی تھیں...... کہیں کہیں حکم کا کوئی باوردی فوجی بھی ٹہلتا نظر آ جاتا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک چھوٹے سیم نالے کے ساتھ چلتی چلتی کوئی نصف میل باہر آ گئی۔ کماد کی ایک فصل کے پیچھے جوار کے کٹے ہوئے کھیت میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی۔ اس کو لوڈر نما گاڑی کہا جا سکتا تھا...... ترپال کے ذریعے اسے چاروں طرف سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سفید فام ڈرائیور بیٹھا تھا۔ بھرت ہم دونوں کو اس کیچڑ آلود گاڑی میں لے گیا۔

ہم اندر چلے گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ اس لوڈر کے اندر ایک چھوٹا سا آرام دہ صوفہ پڑا تھا۔ دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفے پر پینتالیس اڑتالیس سال کا ایک بارعب فوجی افسر بیٹھا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں چمک دار پستول لگا ہوا تھا اور منہ میں سگار تھا۔

اس نے ہمیں دھیان سے دیکھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں تحیر کے آثار اُبھرے۔ اس نے یقیناً ہم دونوں کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "ہیلو مسٹر

آمران اور ہیلو مسٹر تابش۔" اس نے ہم دونوں کے نام بگاڑتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مسٹر اینڈرسن۔" عمران نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ "ویل ڈن...... ویل ڈن...... بہت آچھا کیا کہ تم نے ام سے رابٹا (رابطہ) کر لیا اور اس سے بھی زیادہ آچھا یہ کیا کہ ہام کو اکیلے میں بلایا۔ آئی ایم رئیلی امپریسڈ۔"

"اس میں خطرہ موجود تھا مسٹر اینڈرسن...... لیکن ہمیں آپ کی فہم وفراست پر یقین بھی تھا۔ ہمیں امید تھی کہ آپ کا رویہ ہمارے لئے نرم ہوگا اور ہم اس سنگین سچویشن میں ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے۔"

"وائی ناٹ...... وائی ناٹ۔ ہام کو خوشی ہوا کہ تم نے ایسا دلیری کا فیصلہ بنایا...... اور ہام کا خیال ہے کہ ہام تینوں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہوئیں گا۔"

"بالکل جی! اس میں ہم تینوں کو آسانی رہے گی۔" عمران نے انگلش میں کہا۔

اب گفتگو انگریزی میں ہونے لگی۔ عمران نے کہا۔ "جناب! زرگاں کے سامبر مقابلے میں جو کچھ ہوا، وہ کھیل کا حصہ تھا۔ اس خونی کھیل میں کسی ایک کو تو ہارنا تھا۔ پھر بھی ان واقعات کا رنج ہے۔"

"چھوڑو...... ان باتوں کو اب چھوڑ دو۔ وہ سب ماضی کا حصہ ہے۔" اینڈرسن نے تیزی سے کہا۔ "اب ہمیں موجودہ صورتِ حال کو دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس میں سے کیسے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "آپ نے ہندوؤں کا رویہ تو ملاحظہ فرما لیا ہوگا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ہر صورت سلطانہ کی موت چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کچھ قیمت بھی دینی پڑے۔ یہاں آ کر ہمارا اور آپ کا مفاد ایک ہو گیا ہے۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے ہیں اور آپ مس ماریا کو...... اور انگلش آفیسر کو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس معاملے کو ہینڈل کرنے کا موقع دیں۔"

"تم کس طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتے ہو؟"

"بات چیت کے ذریعے اور اگر یہ طریقہ کام نہ آیا تو پھر کسی بھی طریقے سے...... تابش کا خیال ہے کہ سلطانہ اب شاید خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اگر اسے کسی طرح پتا چل جائے کہ تابش یہاں موجود ہے اور اس معاملے کے حل کی کوشش کر رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اندر سے کوئی ایسی کوشش کرے جس سے بازی ہمارے حق میں پلٹ جائے۔"

''تم اندر کے لوگوں سے کس طرح رابطہ کرو گے؟'' اینڈرسن نے اپنی بارعب آواز میں دریافت کیا۔

''آپ ہمیں اسپتال کے آس پاس کی کسی قریبی چھت تک رسائی دلا دیں۔ باقی ہم خود سنبھال لیں گے۔'' عمران نے کہا۔ اس نے اینڈرسن کو یہ بات نہیں بتائی کہ اسپتال کے اندر رابطہ کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک واکی ٹاکی کا برا بھلا سہارا بھی موجود ہے۔ ہمارے اور مسٹر اینڈرسن کے درمیان یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس دوران میں بھرت اور انگریز ڈرائیور باہر دھوپ میں بیٹھے رہے۔ اگر کوئی اس طرف آ بھی جاتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کوئی صاحب بہادر رفع حاجت فرمانے کے لئے اس طرف آیا ہوا ہے۔

مسٹر اینڈرسن یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ ہم جو کچھ بھی کریں گے، اس میں ماریا کی زندگی کے لئے کسی طرح کا خطرہ موجود نہیں ہو گا۔ عمران نے اپنی بے مثال مدلل گفتگو کے ذریعے اینڈرسن کا یہ اندیشہ کافی حد تک کم کر دیا۔ دوسری طرف ہمیں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ مسٹر اینڈرسن یا اس کے دو چار قریبی انگریز ساتھیوں کے سوا کسی کو ہماری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہوگا۔ اینڈرسن نے ہمیں یقین دہانی کرا دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ اگر یہ معاملہ خیریت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے اور ماریا باہر آ جاتی ہے تو وہ ہماری اور سلطانہ کی نل پانی واپسی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ کسی اور کو بھی نہیں ڈالنے دے گا۔ دراصل سلطانہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا اصل خبط تو کٹر ہندوؤں پر ہی سوار تھا۔

گفتگو کے انجام تک اینڈرسن اچھے موڈ میں آ چکا تھا۔ اس نے مجھے اور عمران کو سگار پیش کئے۔ عمران نے شکریے کے ساتھ سگار قبول کر لی۔ اینڈرسن پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''ہمارے دور میں برصغیر کے اندر جو کچھ بھی ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے وعدہ خلافیاں نہیں کیں۔ ہم نے کسی کو دوست بنایا تو اس کا ساتھ نبھایا۔ کسی کو جان کی امان دی تو اس کی حفاظت کی۔ اس کی ایک مثال آخری تاج دار بدر شے ظافر (بہادر شاہ ظفر) بھی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ وہ اپنے جرنیل بخت کے بلند بانگ دعوؤں سے متاثر ہو گیا اور اس کے ساتھ مل کر برٹش فوج کو دلی سے دور رکھنے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن ہم نے چونکہ اس کی بیوی زیناٹ محل (زینت محل) اور بچے کو جان کی امانت دی ہوئی تھی، اس لئے سخت مشکلوں کے باوجود ان کی حفاظت کی اور انہیں ہندوستان کے بھڑکتے شعلوں سے نکال کر رنگون پہنچایا...... اور برادرز! یہ تو بس ایک مثال ہے......''

''ہم جانتے ہیں جی، آپ ایسی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں۔'' عمران نے نیازمندی

سے کہا۔ ''آپ پر ہمارا یہ بھروسا ہی ہے جس نے ہمیں اپنی جان خطرے میں ڈالنے اور آپ سے رابطہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔''

اینڈرسن نے عمران کو گہری نظروں سے دیکھا...... جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے لہجے کی تہ میں کوئی طنز وغیرہ تو نہیں لیکن وہ عمران ہی کیا تھا جس کے اندر جھانکا جا سکتا۔ ہمارے اور اینڈرسن کے درمیان کئی تفصیلات طے ہوئیں۔ آخر یہ ملاقات ختم ہوئی۔ میں نے اس گفتگو میں بہت تھوڑا حصہ لیا تھا۔ اینڈرسن ہم دونوں سے تھوڑا تھوڑا متاثر ہوا تھا۔ عمران کی گفتگو اور حاضر جوابی نے اسے متاثر کیا تھا جبکہ میرے کریڈٹ میں میری جسمانی فٹنس تھی اور وہ تاریخی مقابلہ تھا جس نے جارج جیسے فائٹر کو خاک چٹوائی تھی۔ بہرحال، ہمارے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو کے دوران میں اینڈرسن کی آنکھوں میں احساسِ برتری کی وہی چمک نظر آئی تھی جو ہمارے جیسے محکوم ملکوں میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نگاہوں میں سما جاتی ہے۔

شام سے پہلے ہی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ پھر بادل چھا گئے اور سردی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم نے بھرت کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا...... یہ جان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو سلطانہ کا شوہر کہلاتا ہوں اور میں نے ہی زرگاں کے مقابلے میں راجواڑے کے شکتی دیوتا کو خاک و خون میں لوٹایا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس آگاہی کے بعد وہ ہم دونوں سے اور خصوصاً مجھ سے بہت مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سیدھا سچا شخص تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر معذرت کے انداز میں کہا۔ ''اگر میں نے بے خبری میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی ہو تو مجھے شما کیجئے۔ مجھے ہرگز معلوم نا ہیں تھا کہ اتنا بڑا شخص ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ہمارا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ راجواڑے کے ہزاروں لوگن ہوں گے جو آپ کی صرف ایک جھلک دیکھنا چاہت ہوں گے۔''

میں نے بھرت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں کچھ خاص نہیں بھرت! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ یہاں کے لوگوں کی بددعائیں اور آہیں تھیں جو جارج کو لے ڈوبی ہیں۔''

''کچھ بھی ہے تابش صاحب! آپ نے ایک مہان کام کیا ہے۔ یہ راجواڑہ آپ کی اس جیت کو مدتوں یاد رکھے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''یار! تعریف کے دو بول میری طرف بھی پھینک دو۔ آخر میں نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔''

جواب میں بھرت نے کہا کہ آپ دونوں ہی تعریف کے قابل ہیں۔ عمران بولا۔ ''ہاں اب کچھ بیلنس ہوا ہے۔''

پروگرام کے مطابق ہم نے شام سات بجے تک تیاری کر لی۔ ہم نے اپنے کپڑے بدل لئے تھے۔ بھرت نے ہمارے لئے اپنے دو جوڑے فراہم کر دیئے۔ سائزوں میں تھوڑا بہت فرق تھا لیکن گزارا ہو گیا۔ ان شلواروں قمیصوں کے ساتھ جوتوں کا انتظام بھی بھرت کو کرنا پڑا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ایک بند گھوڑا گاڑی بڑی خاموشی کے ساتھ آئی اور ہمیں لے کر ایک جانب روانہ ہو گئی۔ اس میں ایک انگریز فوجی افسر موجود تھا۔ ہم رات کی تاریکی میں ایک مکان کے پچھواڑے رکے اور گاڑی سے اُتر گئے۔ مکان کے عقبی دروازے کے ذریعے ہم گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دو تین روز پہلے ہی مکینوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ گرد آلود سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہم اسپتال کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اسپتال کی چھت اور اس گھر کی چھت کے درمیان محض ایک پچیس تیس فٹ چوڑا راستہ ہی تھا۔ ہم ایک برساتی نما کمرے میں آ گئے۔

عمران نے انگریز افسر منیارڈ سے انگریزی میں کہا۔ ''یہ بہت اچھا کام ہے۔ ہم کافی نزدیک آ گئے ہیں۔''

''لیکن بہت احتیاط بھی کرنا ہو گی۔'' منیارڈ نے کہا۔ ''یہ دیکھو۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں کھڑکی میں گولیوں کے تین چار سوراخ نظر آئے۔ منیارڈ نے بتایا کہ پرسوں ذرا سے شک کی بنیاد پر پٹھان حملہ آور نے اس طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ شاید کوئی اس طرف حرکت کر رہا ہے۔

''وہ اب بھی چھت پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایک بندہ تو ہر وقت چھت پر رہتا ہے۔ وہ گول ٹینکی دیکھ رہے ہو نا؟'' اس کے پیچھے پوزیشن ہے اس کی۔ چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور زبردست نشانہ ہے باسٹرڈ کا۔''

منیارڈ اپنے ساتھ جو سامان لایا تھا، اس میں دو رائفلیں، ایک ٹیلی اسکوپ، ایک بڑی ٹارچ اور ایمونیشن وغیرہ تھا۔ منیارڈ دو منٹ کے لئے نیچے گیا تو ہمیں آپس میں بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''حیرت ہے، یہاں ڈھائی تین سو فوجی موجود ہیں لیکن وہ دو دن تک اکیلے آفتاب کے خلاف کچھ کر نہیں پائے؟''

عمران نے کہا۔ ''اس کی بڑی وجہ تو ماریا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے آفتاب کی ہوا باندھ دی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ اندر آفتاب کے ساتھی موجود ہیں اور انہوں نے

دھماکا خیز مواد نصب کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن...... یہ سب کچھ یہاں نہیں ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں پتا ہے اور دوسروں کو نہیں۔ آفتاب کے پاس کوئی دھماکا خیز مواد تھا ہی نہیں اور یہی حقیقت ہمارے لئے آسانیاں پیدا کر سکتی ہے۔''

اچانک مجھے اور عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ کام اتنی جلدی شروع ہو جائے گا۔ یکا یک پانی کی گول ٹینکی کے پیچھے سے کسی لڑکے یا جوان لڑکی کے رونے سسکنے کی صدا آئی۔ اس کے ساتھ ہی ہاشم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔ ''نو بج گئے ہیں۔ ایک اور بکرے کی قربانی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اس بکرے کا کھوپڑا توڑ کر نیچے پھینک رہا ہوں۔ تم اپنی ضد نا ہیں چھوڑو گے تو ایسے ہی اپنے چہیتوں کی لاشیں گنو گے۔'' وہ میگافون پر بول رہا تھا...... اسپتال کے اردگرد ہر طرف ہلچل نظر آئی۔

○......❖......○

میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر نظر آیا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا تنومند ہاشم کی گرفت میں تھا۔ ہاشم نے اس کی دبلی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ رکھی تھی اور اس کے سر سے رائفل کی نال لگا رکھی تھیں لڑکا کسی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا اور غالباً جان بخشی کے لئے منت سماجت بھی کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال نے مجھے مزید چونکایا، وہ مقامی نہیں تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ شاید جاپانی ہے اور آج صبح قتل ہونے والے ڈاکٹر لی وان سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاشم میگافون پر پھر دہاڑا۔ اس نے گھیرا ڈالنے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ جس کی لاش نیچے آ رہی ہے، یہ لی وان کا پوتا ہے۔ امید ہے کہ پوتے کو دیکھ کر دادا خوش ہو جاوے گا۔ اس کے بعد اس انگریز کی باری آوے گی......''

ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ آنجہانی ڈاکٹر لی وان کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بھی یہاں اسپتال میں پھنسا ہوا ہے۔ اب اس لڑکے کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چل رہا تھا۔ روتا بلکتا لڑکا انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ ہاشم رازی کو انکل کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس سے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یقیناً اس سے پہلے اس نے خونچکاں لاشیں دیکھی تھیں جن میں اس کے دادا کی لاش بھی شامل تھی۔ موت کا خوف اس لڑکے کو پوری طرح جکڑے ہوئے تھا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ سر پر پی کیپ تھی اور اس نے دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا۔

عمران نے بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے یہ منظر دیکھا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ دوسری کئی لاشوں کی طرح یہ بچہ بھی لاش میں تبدیل ہو کر چھت سے احاطے میں گرنے والا تھا۔ ہاشم رازی کی آواز کی وحشت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت بچے کے سر میں گولی مار دے گا۔

میگافون پر انگریز افسر اینڈرسن کی آواز گونجی۔ وہ گلابی اردو بول رہا تھا۔ اس نے ہاشم کو اس عمل سے باز کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں ہاشم نے کہا کہ وہ لوگ انہیں ماریا سمیت یہاں سے نکلنے کا راستہ دیں۔ اینڈرسن نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہیں پہلے ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ تاہم اس دوٹوک مؤقف کے ساتھ ساتھ اینڈرسن نے ہاشم سے صبح تک کی مہلت بھی مانگی تا کہ مزید مشورہ کیا جا سکے۔

مشورے کی بات پر ہاشم رازی ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ وہ دہاڑا۔ ''تم ذلیل دھوکے باز ہو۔ تمہارا مشورہ ہمیں صرف دھوکا دینے کے لئے ہے۔ تم اپنی چالیں چلنے کے لئے وقت چاہ رہے ہو اور یہ وقت میں تمہیں نا ہیں دوں گا۔ بالکل نا ہیں دوں گا۔''

وہ روتے چلاتے بچے کو کھینچ کر منڈیر کے قریب لے آیا۔ تاہم وہ دونوں ابھی تک پانی والی ٹینکی کی اوٹ میں تھے۔ ہاشم اور اینڈرسن کے درمیان ہونے والے مکالمے کے دوران میں ہی عمران نے اسنیپر گن کے بیرل کو گن کے ساتھ اٹیچ کر لیا تھا۔ اس نے گن کو کھڑکی کی درز میں رکھا۔ ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور آنکھ گن کی ٹیلی اسکوپ سے لگا دی۔ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ غالباً اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس قدم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اب یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اگر ہم لڑکے کی جان بچانا چاہتے تھے تو پھر فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اس ایکشن کے لئے ہم سب سے نزدیک اور مناسب ترین جگہ پر موجود تھے۔ سوال بس ایک ہی تھا۔ ہمیں ہاشم پر حملہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ یقینی بات تھی کہ عمران نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہو گا۔ سنگین صورتِ حال میں وہ بہت تیزی سے فیصلہ کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین چار سیکنڈ کے اندر وہ اپنے اردگرد سے یکسر بے خبر ہو گیا۔ اسنیپر گن جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور آنکھ دوربین سے لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین نشانہ لینے جا رہا ہے۔

اسے اپنے ٹارگٹ یعنی ہاشم کا بہت تھوڑا حصہ نظر آ رہا تھا اور جو آ رہا تھا، وہ بھی تین چوتھائی لڑکے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے والی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ لڑکے کے سر کے پیچھے ہاشم کے سر کے بال اور نصف پیشانی ہی دکھائی دے پا رہی تھی۔

''غلطی کی گنجائش نہیں ہے عمران۔'' میں نے سرگوشی کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی سوچ لینا کہ اس کے بعد کیا ہو گا؟''

اس نے سر کو موہوم سی حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سوچ لیا ہے۔

ہاشم چنگھاڑا۔ ''یہ لو سنبھال لو اس کو بھی۔'' اس کے ساتھ ہی شاید اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے عمران لبلبی دبا چکا تھا اور یہ کسی عام شخص کا فائر نہیں تھا۔ یہ وہ ماہر نشانہ باز تھا جو ہر شام سیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا اور انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا اور قسمت کی دیوی اس کے کندھوں پر سوار رہتی تھی۔

ٹیلی اسکوپ میری آنکھوں پر تھی۔ میں نے ہاشم رازی کو اچھل کر لڑکے سے الگ ہوتے اور پھر ٹینکی کے قریب گرتے دیکھا۔ لڑکا چلاتا ہوا چھت پر چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ غالباً چند لمحوں کے لئے اس نے یہ بھی سوچا کہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے لیکن چھت بہت اونچی تھی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے آفتاب خاں لپک کر آیا اور وحشت زدہ لڑکے کو دبوچ کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ہاشم مر گیا ہے۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کہیں آفتاب خان مریضوں پر برسٹ نہ چلا دے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن اگر باہر سے کوئی حرکت ہوئی تو پھر وہ ضرور وحشی ہو جائے گا۔''

اسی دوران میں منیارڈ جھک کر دوڑتا ہوا اس برساتی نما کمرے میں آ گیا۔ اس کے گلے میں بھی ٹیلی اسکوپ جھول رہی تھی۔ وہ ہانپی ہوئی لرزاں آواز میں بولا۔ ''بہت خوب! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری گولی نے ہاشم کو ہٹ کیا ہے۔ وہ گرا پڑا ہے۔''

''لیکن تم لوگوں نے باہر سے کسی طرح کی کارروائی نہیں کرنی۔ ورنہ یہ لوگ سب کچھ بارود سے اڑا دیں گے۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔'' عمران نے کہا۔ منیارڈ اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ یقیناً وہ عمران کا یہ پیغام اینڈرسن تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

صرف دو تین منٹ بعد مسٹر اینڈرسن خود بھی ہمارے پاس چھت پر چلا آیا۔ وہ بھی ہانپا ہوا تھا۔ جوش کے سبب اس کا سرخ چہرہ تمتما رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''جناب! ہم یہ سمجھتے ہیں

کہ جس شخص کی وجہ سے یہ کام زیادہ بگڑ گیا تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے پرانی شرطوں پر بات ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں انہیں قائل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

اینڈرسن نے کہا۔ "میں خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بغیر کسی مزید خون خرابے کے حل ہو جائے۔ تم دونوں نے کہا تھا کہ تم ان لوگوں سے مذاکرات کر سکتے ہو۔ اگر تم تیار ہو تو میں تم دونوں کو اندر بھجوا سکتا ہوں لیکن...... لیکن...... یہ تمہارے لئے بہتر نہیں رہے گا۔ تم ہندو آفیسرز کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔" اس کی کشادہ پیشانی پر چند لمحے کے لئے سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ تیزی سے بولا۔ "میں ایک واکی ٹاکی کا انتظام کرتا ہوں۔ ایک سیٹ اندر بھجواتا ہوں، دوسرا تمہیں دے دیتا ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔" عمران نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

ہم اینڈرسن وغیرہ کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہمارے درمیان پہلے سے وائرلیس رابطہ موجود ہے۔ ویسے یہ رابطہ زیادہ قابل بھروسا بھی نہیں تھا۔ ہمارا "سیٹ" کسی وقت اڑیل ٹٹو کی طرح کوئی بات بھی مان کر نہیں دیتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ کے اندر ایک اچھی حالت کا واکی ٹاکی ہمارے پاس آن موجود ہوا۔ اس کا دوسرا سیٹ اندر آفتاب خاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عمران نے مسٹر اینڈرسن سے کہا۔

"جناب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جلدی سے میرے لئے دو باتوں کی وضاحت فرما دیں۔"

"کہو۔" اینڈرسن نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔

"پہلی بات تو یہ جناب کہ آپ کا اور ہمارا مفاد اس وقت ایک ہی ہے۔ ہم اس معاملے کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں کہ محترمہ ماریا اور سلطانہ دونوں کی زندگی بچ جائے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس حوالے سے ہمارا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اندر موجود لوگوں میں سے بدترین شخص کو ہم نے شوٹ کر دیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے بات چیت نسبتاً آسان ہو گئی ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں یہ بات چیت تنہائی میں کرنے کی اجازت دیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں یا مسٹر ملیارڈ یہاں موجود نہ ہوں؟"

"بہت معذرت کے ساتھ میرا مطلب یہی ہے جناب! یوں ہمیں بات چیت کرنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔"

اینڈرسن چند لمحوں کے لئے متذبذب نظر آیا۔ پھر اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر ہامی بھر لی۔ عمران نے کہا۔ "بعد میں، میں آپ کو ساری بات چیت سے تفصیلاً آگاہ کر دوں گا جناب۔"

"او کے...... او کے! دوسری بات کیا ہے؟" اینڈرسن نے پوچھا۔

"ہم ان سے "کمٹمنٹ" کی بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کریں۔ باہر سے بھی پاسداری ہو گی۔ اگر وہ محترمہ ماریا کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں یہ رعایت دی جائے گی کہ وہ باقی یرغمالیوں کو نل پانی کی حدود میں پہنچنے کے بعد آزاد کریں۔ اور نل پانی پہنچنے تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔"

"بالکل...... تم لوگ ان سے اس "کمٹمنٹ" کی بات کر سکتے ہو۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک بار پھر گارنٹی دیتا ہوں کہ اگر وہ مس ماریا کو رہا کر دیں تو ہم بھی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ پاسداری ہم پہلے بھی کر رہے تھے۔ جو کام بھی خراب ہوا ہے، وہ ہماری طرف سے نہیں ان کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش امام صاحب کو زبان دے کر اس سے رُوگردانی کی۔ ان کے لئے شرمندگی کا باعث بنے۔"

میں نے کہا۔ "جناب! اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار وہ اکیلا شخص تھا جو ابھی دس منٹ پہلے مارا گیا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اینڈرسن نے کہا۔ "ہماری اور تم دونوں کی توقعات ٹھیک ثابت ہوں۔ میری اور محترم حکم جی کی طرف سے تم انہیں معاہدے کی پاسداری کی پوری ضمانت دے سکتے ہو۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق اینڈرسن نیچے چلا گیا۔ تاہم اس کا ماتحت آفیسر ملیارڈ اور دو انگریز رائفل مین چھت پر ہی رہے لیکن وہ برساتی نما کمرے کے اندر نہیں تھے۔ یوں ہم اپنی مرضی سے آفتاب اور سلطانہ وغیرہ سے بات کر سکتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ کسی ذریعے سے اینڈرسن وغیرہ ہماری بات چیت سن نہ لیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے، اپنی طرف سے آفتاب کو مسٹر اینڈرسن وغیرہ کی ضمانت دی جا سکتی ہے؟"

"اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ویسے سنا تو یہی تھا کہ یہ گورا اینڈرسن وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ شاید تم ہی نے بتایا تھا۔"

"اور مجھے گیتا مکھی نے بتایا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اور رات رات

کا مزہ لیا ہوا ہے۔ شاید اس نے اپنا کوئی ذاتی تجربہ بیان کیا ہو۔"

"عمران! میرے خیال میں ہمیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ تم بات کرو آفتاب سے۔"

عمران نے واکی ٹاکی آن کیا۔ پہلی ہی کوشش میں آفتاب سے رابطہ ہو گیا۔ اس کی دہاڑتی آواز سنائی دی۔ "تم لوگوں نے اپنی موت پر خود مہر لگایا ہے۔ اب ام کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کتے کا موت مارے گا سب کو اور سب سے پہلے یہ پھنسنے کے منہ والا تمہارا گورا افسر مرے گا......"

عمران نے کہا۔ "میں عمران بول رہا ہوں آفتاب...... مجھے افسوس ہے کہ......"

"ام اب کسی کا بکواس سننا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو شہید کر دیا ہے۔ اب ان کو بھی موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ ام ان کو صرف ایک گھنٹے کا مہلت دیتا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے امارے جانے کا انتظام کرے۔ ورنہ چارپائی لے کر آئے اور احاطے میں سے اپنے ذلیل افسر کا لاش اٹھا کر لے جائے۔ صرف ایک گھنٹا...... پورے ساٹھ منٹ۔" مہلت کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاشم کی نسبت آفتاب خاں میں لچک موجود ہے۔

عمران نے دھیمے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "آفتاب خاں! میری بات کا برا نہ ماننا۔ ہاشم صاحب کا رویہ ایک دم بہت سخت ہو گیا تھا۔ شاید ان کی جان جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے امام صاحب کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ اپنی طرف سے پوری گارنٹی دے رہے تھے۔"

آفتاب گرجا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ام اس میم کو چھوڑ دے گا تو یہ ام پر حملہ نہیں کرے گا؟ یہ ایک سیکنڈ کا دیر نہیں لگائے گا اور امارا تکا بوٹی کر دے گا۔ اس گورے افسر کا زیادہ اہمیت نہیں ہے ان لوگوں کی نظروں میں۔"

"اہمیت ہے آفتاب...... اہمیت ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں کے انچارج افسر اینڈرسن سے ہماری بات ہوئی ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس بندے کو بچانا چاہتے ہیں۔ پھر بہت سے دوسرے لوگ تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ ان لوگوں کے بے شمار وارث یہاں دھرنا دیئے بیٹھے ہیں۔ ان کو ہر صورت اپنے عزیز زندہ چاہئے ہیں۔ وہ افسروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لی وان کا پوتا بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ ماریا کو چھوڑنے کے بعد بھی تمہیں کچھ خاص گھاٹا نہیں ہونے والا ہے۔"

عمران بولا۔ "اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے مسٹر اینڈرسن کے ذہن کو

پوری طرح ٹٹولا ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ اگر ماریہ کو یہاں رہا کر دیا جائے اور باقی لوگوں کو نل پانی کے اندر جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

"ام کیسے یقین کر لے اس بات پر؟ اس انگریز کے دماغ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

آفتاب کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

میں نے کہا۔ "تم ہماری بات پر اس لئے یقین کرو کہ یہ مسئلہ جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ میں سلطانہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے، میرے بچے کو اس کی ضرورت ہے۔"

"کچھ بھی ہے۔ ام یہاں سے نکلنے سے پہلے اس سفید کتیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی صورت نہیں۔" اس کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں تھوڑا سا ڈھیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم سلطانہ سے مشورہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی خون خرابا نہیں چاہے گی۔ کیا تم اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ وہ نیچے ہے۔ وہاں سے ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ہل سکتا۔" آفتاب نے کہا۔

میرے، عمران اور آفتاب کے درمیان یہ گفتگو قریباً آدھ گھنٹا جاری رہی۔ ہاشم رازی کی اچانک موت کے غم نے آفتاب کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہاشم رازی کا رویہ غیر معمولی طور پر سخت تھا۔ غالباً یہ رویہ آفتاب اور سلطانہ کے لئے بھی اچنبھے کا باعث بنا تھا۔ آفتاب یقیناً ہاشم رازی کی موت کی وجہ انگریز اور ہندو فوجیوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اسے اسپتال کے ساتھ والی چھت سے ہم نے شوٹ کیا ہے۔

ہاشم اس سارے "سین" میں آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح رخصت ہو گیا تھا۔ اب اس ساری صورتِ حال میں فیصلے کی طاقت ایک بار پھر آفتاب کے پاس تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے والا فیصلہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی ماریا کو چھوڑنا اور باقی یرغمالیوں کے ساتھ روانہ ہونا۔

قریباً دس منٹ بعد آفتاب نے ہم سے واکی ٹاکی پر رابطہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود رابطہ کیا تھا۔ ایک بار پھر ہمارے اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ سمجھوتے کے مطابق ماریا کو چھوڑنے پر رضامند تو تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط بھی کچھ اتنی زیادہ سخت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کے احاطے سے نکلتے وقت اپنے

ساتھ دس یرغمالی بٹھائے گا، ان میں زخمی انگریز اور لی وان کا پوتا بھی شامل ہوں گے۔ ان میں کوئی عورت نہیں ہوگی۔ یہ سب کچھ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ نئی شرط یہ تھی کہ احاطے سے نکلتے ہوئے ماریا بھی ان کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگی۔ بہرحال، گاؤں سے باہر نکلنے کے فوراً بعد وہ ماریا کو گاڑی سے اتار دے گا۔

آفتاب کی یہ نئی شرط فوری طور پر قابلِ قبول نہیں تھی تو اسے ناقابلِ قبول بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں انگریز افسروں سے بات کی جا سکتی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ یہ شرط مان بھی جائیں گے۔

غالباً آفتاب خاں کو اندیشہ تھا کہ یرغمالیوں کے ساتھ اسپتال کے اندر سے نکل کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا مرحلہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ اچانک حملے کے خطرے سے دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد جب وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں کی گلیوں سے گزریں گے تو تب بھی خطرے میں ہوں گے۔ لیکن گاؤں سے نکل کر کھلے راستے پر پہنچنے کے بعد وہ نسبتاً محفوظ ہو جائیں گے۔ تب وہ ماریا کو اتار دے گا۔

ہم نے آفتاب خاں سے پندرہ منٹ کا وقت لیا اور واکی ٹاکی پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہم نے آفیسر مَیارڈ سے کہا کہ وہ اینڈرسن صاحب کو یہاں بلائے۔ مَیارڈ گیا اور پانچ منٹ میں اینڈرسن کو لے آیا۔ اینڈرسن اور مَیارڈ وغیرہ کی یہ ساری آمدورفت بڑی رازداری ہو رہی تھی۔ ہندو آفیسر اور فوجی اس سارے معاملے سے بے خبر تھے۔ عام لوگوں کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی کہ اس رہائشی مکان کی چھت پر کون موجود ہے اور یہاں کس طرح کے مذاکرات چل رہے ہیں۔

عمران نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ''جناب اینڈرسن صاحب! ہمارا خیال ہے کہ یہ معاملہ حل کے قریب آ گیا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے۔ ہاشم کی موت کے بعد اس کے ساتھیوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کے حوالے سے زیادہ محتاط ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ محترمہ ماریا کو اسپتال میں نہیں بلکہ گاؤں سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر چھوڑیں گے۔''

''کھلی جگہ سے کیا مطلب ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ گاؤں کی آبادی سے نکلنے کے فوراً بعد۔'' میں نے جواب دیا۔

اینڈرسن نے سگار کے دو طویل کش لئے پھر بولا۔ ''تم دونوں کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی چکر بازی تو نہیں ہوگی؟''

''میں نے تفصیلی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ہاشم کی موت کے بعد وہ لوگ کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہے کہ گاڑی میں منتقل ہونے کے دوران میں ان پر حملہ نہ ہو جائے۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر اینڈرسن! آپ ان معاملوں میں زیادہ بہتر فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن جو چیز مجھ جیسے بندے کو بھی نظر آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ پورا گاؤں فورس کے گھیرے میں ہے۔ عمارت کے اندر کی نسبت گھوڑا گاڑی میں ان لوگوں کی پوزیشن کہیں زیادہ کمزور ہو گی۔ اگر وہ گاؤں سے نکلتے ہی محترمہ ماریا کو رہا کرنے کی بات کر رہے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔''

اس معاملے میں ہمارے درمیان چند منٹ بات ہوئی۔ دو چار منٹ کے لئے سیکنڈ آفیسر مَیارڈ بھی اس میں شامل ہوا۔ آخر طے ہوا کہ اگر حملہ آور باقی ساری شرائط مان رہے ہیں تو ان کو یہ گنجائش دے دی جائے۔ اینڈرسن وغیرہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دو سے زیادہ حملہ آور موجود ہیں۔

اینڈرسن کی موجودگی میں ہی ہم نے واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطہ کیا۔ اس رابطے میں ساری تفصیلات طے ہو گئیں۔ ہم نے آفتاب کو بتایا کہ دو گھوڑوں والی بڑی گھوڑا گاڑی تیار ہے۔ دو اضافی گھوڑے بھی موجود ہیں۔ راستے کے لئے راشن وغیرہ بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

آفتاب بولا۔ ''ٹھیک ہے، ام آدھ گھنٹے کے اندر اندر تیس عورتوں اور مردوں کو چھوڑ دے گا۔ دس بندہ امارے ساتھ رہے گا۔ ام ایک بار پھر سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی حرکت ہوا تو ان سب میں سے کوئی ایک بھی زندہ حالت میں نہیں ملے گا۔''

اینڈرسن کے اشارے پر عمران نے اس سے پوچھا۔ ''کیا ماریا یا آفیسر ٹام سے بات کرا سکتے ہو؟''

''نہیں، ابھی کسی سے نہیں ہو سکتا۔'' اس نے بھڑک کر کہا۔ ''ابھی تم فوجیوں سے کہو کہ وہ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں لے کر آئیں اور برآمدے کے پاس بائیں طرف کھڑا کر کے باہر نکل جائیں۔ پھاٹک کے سامنے اور آس پاس کوئی کالا گورا فوجی نہیں ہونا چاہئے۔ پوری تسلی ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں کو چھوڑے گا۔''

آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ آفتاب نے ایک بار پھر چھت پر چڑھ کر

اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ہمیں واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پانی والی گول ٹینکی کے پیچھے بس اس کے ہیولے کی جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہاشم کی اچانک موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہاشم کی لاش بھی ابھی تک ٹینکی کے آس پاس ہی پڑی تھی۔

آفتاب نیچے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ دیکھا کہ اسپتال کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور ایک قطار میں کچھ لوگ باہر نکلے۔ ان میں چھ سات عورتیں اور تین بچے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کل تعداد تیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ ان میں سے کچھ افراد زخمی بھی تھے۔ ایک مریض کی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور وہ بیساکھی کے سہارے باہر آ رہا تھا۔ قریباً بہتّر گھنٹے کے اعصاب شکن دباؤ کے بعد ان لوگوں کو کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ وہ احاطے میں پہنچے اور باہر نکل آئے۔ پھاٹک سے پچیس تیس میٹر کی دوری پر ان کے لواحقین موجود تھے۔ وہاں رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایک فاقہ زدہ یرغمالی عورت جس کا شوہر آفتاب خاں کی گولی کا شکار ہو کر مر گیا تھا، باہر آ کر بے ہوش ہوگئی اور لوگ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔

آفتاب خاں نے واکی ٹاکی پر بتایا۔ ''ام لوگوں کو لے کر باہر نکل رہا ہے۔ ام ایک بار پھر کہہ رہا ہے کہ احاطے کے آس پاس اور پھاٹک کے قریب کسی کو موجود نہیں ہونا چاہئے۔''

''کوئی موجود نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور تم سے بھی گزارش ہے کہ خود کو پُرسکون رکھو۔ اب جو کچھ ہونا ہے، وہ سب طے ہے۔ کوئی چکر، کوئی چالبازی اب یہاں نہیں ہے۔''

چند منٹ بعد ہم نے چھت پر سے اسپتال کے برآمدے کا منظر دیکھا۔ منیارڈ بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اندرونی دروازہ کھلا اور یرغمالیوں کی قطار باہر نکلی۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر لی وان کا سہما ہوا پوتا بھی نظر آیا۔ سب سے آخر میں ماریا تھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر کسے گئے تھے۔ آفتاب نے اپنی طاقتور سیون ایم ایم کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ یقیناً اس رائفل کے دو تین برسٹ چند سیکنڈ میں ان دس گیارہ یرغمالیوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر ہم نے سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چادر میں اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال کی

رائفل تھی۔ اس کا رائفل تھامنے کا انداز اور اس کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور بوقت ضرورت اسے بے دریغ استعمال بھی کر سکتی ہے۔ وہ یرغمالیوں کی قطار کی بائیں جانب تھی۔ صرف زخمی انگریز آفیسر ٹام وہ شخص تھا جس کے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے کی طرف باندھے گئے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کندھے پر گہرا زخم ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بہ مشکل چل پا رہا تھا۔

یرغمالیوں کی قطار احاطے میں کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ بے تناؤ بھرے لمحے تھے۔ اسپتال کے اردگرد گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر سیکڑوں سپاہی اور گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے براہِ راست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ابھی پہلا یرغمالی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ میں نے آفتاب کو ایک دم لڑکھڑاتے اور جھکتے دیکھا...... اس کے ساتھ ہی آفتاب نے اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز گونجی۔ کئی گولیاں ماریا کے جسم کے آر پار ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ نے بھی اوپر تلے فائر کئے۔ میں نے یرغمالیوں میں سے کم از کم دو افراد کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔

ایک دم کہرام مچ گیا اور شب کا سناٹا چنگھاڑتی آوازوں سے چکنا چُور ہو گیا۔ کئی طرف سے فائر ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ زخمی آفتاب تیزی سے رینگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا ہے۔ رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلطانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی اوٹ میں ہوگئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دفعتاً میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چھت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لپکا ہے۔ چھت کی منڈیر تک پہنچ کر اس نے ہوا میں جست لگائی۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی پیراک سوئمنگ پول میں کودنے کے لئے لگاتے ہیں لیکن عمران کے نیچے سوئمنگ پول نہیں تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پرالی کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا ہے اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر آ گیا ہے۔ اٹھ کر وہ پھر کسی کے پیچھے لپکا۔ اب میں نے بھاگنے والے کا سایہ بھی دیکھ لیا۔ وہ برق رفتاری سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔

ایک دم میری سمجھ میں آ گیا کہ عمران کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ جن دو فائرز کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوا، وہ ہماری دائیں جانب والی دو تین چھتوں میں سے کسی ایک چھت پر سے ہوئے تھے۔ غالباً عمران نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور اب اس کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اس

شخص نے بھاگتے بھاگتے ایک دم پلٹ کر عمران پر گولی چلائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ عمران نے نیچے گر کر خود کو بچایا تاہم اس وقت یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ عمران نے نیچے لیٹے لیٹے دو جوابی فائر کئے لیکن یہ فائر مدِمقابل کو لگے نہیں۔ میں نے اسے برق رفتاری سے گنے کے کھیتوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

جونہی عمران کھڑا ہوا، میں نے ایک اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک جانب سے ایک اور لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اس کا ارادہ عیاں تھا، وہ عقب سے عمران کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ پھینک کر رائفل پکڑی۔ ابھی مجھے رائفل سیدھی کرنے اور نشانہ لینے میں تین چار سیکنڈ لگنے تھے اور میرا نشانہ بہت اچھا بھی نہیں تھا لیکن یہ تین چار سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ قریبی کھیت میں سے ایک ہیولا سا نکلا اور برق رفتاری سے رائفل بردار پر جا پڑا۔ یہ ایک کتا تھا۔ اس کی آواز کھیتوں کے درمیان دور تک گونجی۔ میں نے کتے اور رائفل بردار کو اوپر نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ ان کے درمیان فائر کا شعلہ لپکا...... یہ وہ وقت تھا جب عمران کو اندازہ ہوا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہے...... عمران پلٹا۔ مگر تب تک کھیل ختم ہو گیا۔ تنومند کتے نے ایک دم رائفل بردار کو چھوڑا اور کھیتوں میں اوجھل ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فائر کی خوفناک آواز سے بدک گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، کتا اپنا کام کر گزرا تھا۔ رائفل بردار بے سدھ پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دیوہیکل کتے کی اچانک جست کے سبب اس کی رائفل سے گولی چل گئی تھی۔ رائفل کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لئے گولی نے رائفل بردار کو ہی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ پگھلا ہوا قریباً بیس گرام سیسہ رائفل بردار کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں داخل ہوا تھا اور اس کا تالو پھاڑ کر کھوپڑی میں گھس گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اور نہیں، وہی کتا ہے جو پچھلے دو تین دن سے ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

آفتاب کو گولی لگنے سے لے کر، کتے کے نمودار ہونے اور پھر نامعلوم رائفل بردار کی ہلاکت تک کے سارے واقعات صرف آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ہی رُونما ہوئے۔ عمران دوڑتا ہوا دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر پھر چھت پر آ گیا۔ اسپتال کے احاطے کے اندر قیامت برپا تھی۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمیں احاطے میں کم از کم پانچ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح طور پر ماریا کی تھی۔ وہ اوندھی پڑی تھی، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”اب یہ لوگ سلطانہ اور آفتاب کو نہیں چھوڑیں گے۔“ عمران نے سرسراتی آواز میں

کہا۔

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اس کی کرچیاں پورے جسم میں پھیل گئیں۔

”ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

عمران نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں احاطے پر جمی تھیں۔ جنریٹر چل رہا تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کمانڈوز نے ایک دم تین اطراف سے اسپتال پر ہلا بول دیا تھا۔ وہ بارش کی طرح گولیاں برساتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں گھس گئے اور مختلف چیزوں کی آڑ لے لی۔ کمانڈوز کی ایک ٹولی احاطے کا ایک بغلی دروازہ توڑ کر اندر گھس گئی۔ انہوں نے برآمدے کے بالکل قریب پوزیشن لے لی۔ ان کی اندھا دھند فائرنگ نے اسپتال کے سارے اندرونی شیشے توڑ ڈالے۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے اور دھواں پھیل گیا۔ میں ٹیلی اسکوپ سے دیکھ رہا تھا۔ تب اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور ہر امید دم توڑ گئی۔ یہ آفتاب خاں کی لاش تھی۔ وہ برآمدے کے ایک چوکور ستون کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا سارا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔ اس کی لمبے بیرل والی سیون ایم ایم رائفل بھی اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! سلطانہ اکیلی رہ گئی ہے شاید۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی اسکوپ عمران کی طرف بڑھائی اور برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے دیکھا اور اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔

”اس کا مطلب ہے کہ جوابی فائر صرف سلطانہ کر رہی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ...... دو تین منٹ سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔“ میری آواز رندھ گئی۔

احاطے کے اندر اور برآمدے کے آس پاس کمانڈوز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں سفید فام کمانڈوز بھی تھے۔ ماریا کی موت نے گھیرا ڈالنے والوں کو جیسے وحشی کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ آفتاب اور سلطانہ کو قیمہ کر دینا چاہتے ہیں۔

”کیا خیال ہے عمران...... اسے بچانے کی کوشش کریں؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”کوشش کرنی چاہئے لیکن اس کے لئے ہمیں نیچے جانا ہوگا۔ سب کے سامنے آنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو......؟“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

عمران ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترے پھر ایک گلی سے گزر کر اسپتال کی طرف آ گئے۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہر طرف دہشت برس رہی تھی۔ ہم پھاٹک پر پہنچے۔ ہندو گارڈز نے ہمیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت نظر آئی۔ پانڈے کے ایک ماتحت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑا۔ یہی وقت تھا جب عمران کی نظر منیارڈ پر پڑ گئی۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''مسٹر منیارڈ بات سنیے۔''

منیارڈ بھی ہمیں کھلے عام سب کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران اسے ایک طرف لے گیا۔ ان دونوں کے درمیان بس چار پانچ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ احاطے میں ہونے والی فائرنگ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے کہیں اچھی پوزیشن لی ہوئی ہے اور بھرپور جواب دے رہی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ عمران نے منیارڈ سے کیا کہا ہے۔ یقیناً اس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسے آگے جانے کا موقع دیا جائے۔ وہ سلطانہ کو ہتھیار ڈالنے اور گرفتاری دینے پر آمادہ کر دے گا۔ منیارڈ کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ عمران کی بات کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے۔ وہ تیزی سے پیچھے گیا۔ غالباً آپریشن انچارج مسٹر اینڈرسن سے اجازت لینے گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا تھا، دوڑتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس دوران میں ہندو سپاہی ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ واپس آتے ہی منیارڈ نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور چکر کاٹ کر احاطے کے اس بغلی دروازے پر پہنچا جسے توڑ کر کمانڈوز چار پانچ منٹ پہلے اندر گھسے تھے۔

احاطے میں داخل ہونے سے پہلے منیارڈ نے میری اور عمران کی رائفلیں لے کر اپنے ساتھیوں کو تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ کچھ دیر کے لئے فائرنگ روک دیں...... فائرنگ مدھم ہوئی اور پھر رک گئی۔ تاہم کمانڈوز نے اپنی پوزیشنیں برقرار رکھیں۔ رائفلوں کے کندے ان کے شانوں سے لگے رہے اور نگاہیں ٹارگٹ پر جمی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ سلطانہ اسٹور روم کے قریب ایک دس فٹ اونچی گیلری میں موجود ہے...... اور اس کے اندر سے جوابی فائر کر رہی ہے...... قیامت خیز فائرنگ میں وقفہ آیا تو دبی ہوئی آوازیں ابھر آئیں۔ ایک آواز کسی شدید زخمی کی تھی جو برآمدے کے اندرونی حصے میں پڑا تھا اور مدد کے لئے تڑپ رہا تھا...... دوسری آواز احاطے میں تڑپتے پھڑکتے زخمی گھوڑے کی تھی۔ اس کے علاوہ احاطے کے باہر اور اردگرد کی چھتوں پر گونجنے

والی صدائیں تھیں۔ مسلح فوجی اور کمانڈوز ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ہدایات دے رہے تھے یا لے رہے تھے۔

''آ جاؤ اندر۔'' منیارڈ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے منیارڈ کے پیچھے، برآمدے تک پہنچے اور ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ آفتاب خاں کی لاش بس آٹھ دس قدم کے فاصلے پر چوکور ستون کے پیچھے پڑی تھی۔ لگتا تھا کہ کمانڈوز نے وحشت میں اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی ہیں۔ چوکور ستون کی اوٹ میں کھڑے ایک انگریز نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تو گیلری کی طرف سے فوراً رائفل کا فائر ہوا۔ کمانڈو بال بال بچا۔

منیارڈ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگافون میری طرف بڑھایا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور خود بھی باہر آ جاؤ۔ منیارڈ صاحب نے وعدہ کیا ہے، تم پر فائر نہیں کیا جائے گا۔''

کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اندر سے چلا کر کچھ کہا گیا۔ یہ سلطانہ ہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن آواز واضح طور پر پہنچ رہی تھی۔ میں نے میگافون ایک طرف رکھ دیا اور بلند آواز میں کہا۔ ''سلطانہ! یہ لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔ تم فوراً رائفل باہر پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر نکل آؤ۔''

جواب میں سلطانہ نے پھر چلا کر کچھ کہا۔ اس مرتبہ الفاظ بھی ہماری سمجھ میں آئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''نا ہیں مہروج...... میں بندوخ نہیں پھینکوں گی۔ میں...... آخری دم تک لڑوں گی......'' اس کی آواز میں زخمی شیرنی جیسا درد موجود تھا اور طنطنہ بھی۔ یہ اسی راجپوت لڑکی کی آواز تھی جو سر جھکانے سے سر کٹانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی...... ''ہوا'' کو زنجیریں کون پہنا سکتا ہے اور میں گھنے جنگلوں کی مست ''ہوا'' ہوں۔ اور سمندر کو قید کون کر سکتا ہے؟ میں ساحلوں کے گھیرے میں نہ رہنے والا سمندر ہوں اور حق کی آواز کو کوئی ''حکم'' کیسے دبا سکتا ہے اور میں حق کی وہی سرکش آواز ہوں۔ میں نے ہر دور میں ظلم کو للکارا ہے۔ میں ہر دور میں لہولہان ہوئی ہوں اور ہر آنے والے دور میں نئی طاقت اور نئے جوش کے ساتھ ابھری ہوں۔

میں نے اور عمران نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ موت کے گھیرے میں ہے۔ کسی بھی وقت اس کی جان جا سکتی ہے۔ یہ گھنٹوں یا منٹوں کی نہیں، سیکنڈوں کی بات تھی۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ وہ زندہ گرفتار ہو جاتی تو پھر شاید اس کی

زندگی کے لئے کوئی راستہ بھی نکل آتا، کوئی وسیلہ بھی پیدا ہو جاتا۔ انہونیوں کی گنجائش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ امید کی آنکھیں ہمیشہ کرشموں کی راہ دیکھتی ہیں اور کبھی کبھی یہ انتظار رنگ بھی لاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس موجودہ واقعے میں سلطانہ کا کردار، سنگینی میں سب سے کم تھا۔ خون خرابے کے اصل ذمے دار آفتاب اور پھر ہاشم رازی تھے۔ ممکن تھا کہ سلطانہ کے گرفتار ہو جانے کی صورت میں مسٹر اینڈرسن اور دوسرے انگریز عہدیداروں کے دلوں میں اس کے لئے رحم کی کوئی رمق پیدا ہو جاتی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مسٹر اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

سلطانہ کا انکار سننے کے بعد کمانڈوز نے پھر گیلری کا نشانہ لے لیا تھا۔ اب مسٹر اینڈرسن خود بھی وہاں آن موجود ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی جدید ماؤزر تھا۔ اس کے صرف ایک اشارے پر ایک بار پھر سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ میں مسٹر اینڈرسن کے سامنے آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ کوئی فائر نہ کرے۔ میں سلطانہ سے بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ گرفتاری دے دے گی۔''

''جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔'' مسٹر اینڈرسن کا لہجہ سخت تھا۔

میں کمانڈو اور مسٹر منیارڈ کی ہدایات کو نظر انداز کرتا ہوا تھوڑا سا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں...... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ انکار نہ کرنا سلطانہ...... بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن مان لو۔ رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دو اور خود بھی نکل آؤ......''

چند سیکنڈ بعد سلطانہ کی گلوگیر آواز ابھری۔ ''مہروج...... خدا کے لئے...... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں ناہیں ڈالو۔ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔''

''سخت امتحانوں میں سے ہی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے سلطانہ...... اور مجھے امید ہے نکلے گا۔ میری اور بالو کی خاطر بات مان لو۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے بڑے صاحب سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ تم بس کھڑکی کھول کر رائفل باہر پھینک دو۔''

وہ خاموش رہی۔ یوں لگا کہ وہ فیصلے کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ مسٹر اینڈرسن نے دیوار کی اوٹ سے دہاڑ کر کہا۔ ''میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اسے کہو باہر نکل آئے۔''

کمانڈوز اب آگے بڑھتے ہوئے گیلری کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''سلطانہ...... باہر آ جاؤ...... میری خاطر۔''

پندرہ بیس سیکنڈ...... پندرہ بیس گھنٹوں کی طرح گزر رے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ گیلری کا دروازہ کھلا۔ سلطانہ باہر نکلی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں پونم پور کے مندر میں گئی تھی۔ اس کے جسم پر لہریے دار ساڑی تھی، کانوں میں چاندی کے جھمکے، کلائیوں میں وہی پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں جو اسے آفتاب نے لا کر دی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ہندو ناری کا روپ دھارنے کے لئے تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ساڑھی کندھے پر سے خون آلود ہے۔ یقیناً وہ زخمی تھی۔ اس کے ہر وقت قندھاری اناروں کی طرح دہکنے والے رخسار زرد نظر آتے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے رائفل پھینک دی۔ رائفل پُرشور انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ یہی وقت تھا جب میری نظر سیکنڈ آفیسر مینارڈ پر پڑی۔ اس نے کمانڈوز کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ ایک ساتھ تین چار رائفلوں سے تڑتڑ کی خوفناک آواز بلند ہوئی۔ سلطانہ کا جسم اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ گیلری کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔

''سلطانہ!'' میرے سینے کی گہرائی سے پکار بلند ہوئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

میں اس کے اوپر گر گیا۔ ان حشر خیز لمحوں میں شاید میرے دماغ کے اندر یہ آیا تھا کہ میں اس کے اوپر گر جاؤں گا تو وہ مزید گولیوں کی زد سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اسے مزید گولیوں کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کے آخری دو تین سیکنڈ تھے۔ ''مہروج'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی...... وہ مر چکی تھی۔ میرے زخموں پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھنے والی، میرے رستے کے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے والی، میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی مر چکی تھی اور اس کا سر میری بانہوں میں تھا۔

...... میں پلٹا...... مجھے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک سرخ چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی۔ اس چادر کے اندر سے کمانڈوز کے منحوس چہرے پرچھائیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں دہاڑا۔ مجھے نہیں معلوم کیا کہا اور کس کو کہا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اس آواز کی گونج مجھے اپنے پورے جسم میں اور سارے در و دیوار میں محسوس ہوئی۔ میں اپنے قریب

ترین انگریز کمانڈو کی طرف بڑھا۔ یہ انہی میں سے تھا جنہوں نے میری نہتی سلطانہ پر گولی چلائی تھی۔ اس کے جسم کو چھلنی کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو نے میری طرف رائفل سیدھی کی ہے۔ اس وقت یہ قاتل رائفل مجھے دنیا کی حقیر ترین چیز محسوس ہوئی۔ میں کمانڈو سے ٹکرایا اور اسے اپنے نیچے لیتا ہوا دور جا گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے منیارڈ کو دیکھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ ایک طرف سے عمران عقاب کی طرح جھپٹا اور منیارڈ کی رائفل کی نال اوپر اٹھا دی۔

اچانک میرے سر پر کوئی بہت وزنی چیز لگی۔ اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا کہ درجنوں ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوئی وزنی شے سر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنی ہوئی سرخ چادر کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ وہ بتدریج سیاہ ہوتی چلی گئی۔

O.....❖.....O

پتا نہیں کتنی دیر بے ہوش رہا اور کس حال میں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میرے اردگرد لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میں کچھ دیر تک بالکل خالی ذہن کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر کیا قیامت بیت چکی ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ لیکن شاید اس سے دس گنا زیادہ درد بھی ہوتا تو مجھے وہ کرنے سے نہ روک سکتا جو میں نے کیا۔ میں اٹھا اور نیم دیوانگی کی سی کیفیت میں ''سلطانہ...... سلطانہ......'' پکارنے لگا۔ پھر میں کمرے کے بند دروازے پر پل پڑا۔ میں نے دو ہتڑ چلائے، اسے ٹھوکریں رسید کیں۔ میری آواز نے در و دیوار کو لرزا دیا۔ میں چلا رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو حرام زادو...... تم نے اسے مار دیا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ میں سب کو راکھ کر دوں گا۔ میرا کچھ نہیں بچا۔ کان کھول کر سن لو۔ کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کسی کا نہیں بچے گا۔'' میں پھر دروازے پر حملہ آور ہوا۔ چوبی دروازہ بہت مضبوط تھا پھر بھی چٹخنے لگا۔

ایک طرف سے عمران نمودار ہوا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''ہوش کرو تابی! اس طرح کچھ نہیں ہوگا۔ جانے والی جا چکی ہے...... اب صبر اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔''

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ ''تم لو صبر اور ہمت سے کام، میں نہیں لوں گا۔ میں مر جاؤں گا اور ان سب کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے میری نہتی سلطانہ کو مارا ہے۔ وہ میرے کہنے پر باہر آئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے خود کو حوالے کیا تھا۔ اس سفید سؤر منیارڈ اور

اینڈرسن نے مروایا اسے۔ انہوں نے دھوکا دیا۔''

عمران نے ایک بار پھر مجھے بازوؤں میں بھرا۔ ''نہیں تابی! موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ہوا ایسے ہی ہونا تھا۔ اور کیا پتا...... یہ اچھا ہی ہوا ہو۔ وہ پکڑی جاتی تو اس کی موت مشکل ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اسے معاف تو نہیں کرنا تھا نا۔ یہ تو اس کی بوٹیاں نوچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب اسے خدا کی رضا سمجھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو تابی۔''

درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں کراہا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مر جانے دو مجھے۔ اس کے پاس چلے جانے دو۔''

میں نے خود کو چھڑانے کے لئے زور لگایا۔ عمران نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے زوردار جھٹکے دیئے۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے گرفت میں نہ رکھ سکتا مگر اس کے فولادی بازوؤں نے مجھے گھیرے رکھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر زور لگایا۔ اس کی گردن پیچھے مڑ گئی مگر بازوؤں کی گرفت برقرار رہی۔ میں پھنکارا۔

''تم نے کیا کیا...... تم نے بھی بس تماشا دیکھا؟ میری طرح تم نے بھی اسے مرنے دیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چھلنی ہوگئی۔ مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے پورا زور لگایا۔ ہم دونوں دیوار سے ٹکرائے پھر پختہ فرش پر گر گئے لیکن عمران نے مجھے چھوڑا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں پھر دروازے پر پل پڑوں گا۔ اسے توڑ دوں گا یا خود کو شدید زخمی کر لوں گا۔ اس کی مضبوط گرفت اس کی دوستی ہی کی طرح ناقابلِ شکست تھی۔

کچھ دیر بعد میری وحشت ایک دم شدید غم واندوہ میں ڈھل گئی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم اسی طرح فرش پر گرے رہے۔ میں روتا رہا، وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچتا رہا، میرا سر چومتا رہا۔ مجھے لگا میرے جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے نچڑ جائے گا۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے کے وہ مناظر تھے جب مندر کے تہ خانے میں وہ میرے ساتھ تھی۔ شب کے اندھیرے میں وہ اپنی تمام تر نسوانیت اور حلاوت کے ساتھ میرے اندر سما جاتی تھی۔ وہ ہولے ہولے میرا نام پکارتی تھی۔ میں اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ وہ نل پانی کی ان سہانی شاموں کا سپنا دیکھتی تھی جب ہم دیوان کے وسیع احاطے میں گیندے اور موتیے کے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے چلے جاتے۔ ہمارا ہالو ہماری بانہوں میں ہوتا اور ہم باری باری اس کے گال چومتے۔ وہ اب اپنے اس سپنے

سمیت مٹی کے نیچے سو رہی تھی، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ وہ بس تین چار دن کے اندر ہی سوکھی ریت کی طرح میری مٹھی میں سے پھسل گئی تھی۔

میں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ میں نے جسم کا درد سہنا تو کسی حد تک سیکھ لیا تھا لیکن دل کا درد سہنا مجھے کہاں آتا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر نیم جان ہو گیا تو عمران کے ساتھ ہی چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شاید یہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو بدستور اندھیرا تھا۔ لالٹین روشن تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بالکل بند جگہ ہے۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، کوئی درز کچھ بھی نہیں۔ بس وزنی چوبی دروازے کے اندر ایک چوکور خانہ سا تھا اور وہ بھی بند تھا۔ یہاں رات اور دن کی تمیز مشکل تھی۔ عمران میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میرے سر کے زخم سے رسنے والے خون کو روئی سے پونچھ رہا تھا۔

”ہم کہاں ہیں عمران؟“ میں نے پوچھا۔

”زرگاں میں۔“

میں نے ارد گرد دیکھ کر کہا۔ ”زرگاں کی جیل میں؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب پہنچے ہم یہاں؟“

”کل رات۔“

”اور سلطانہ؟“ میری آواز دکھ کے بوجھ سے بیٹھ گئی۔

”وہ بھی آ گئی تھی۔ اسے کل رات دفن کیا گیا۔ یہاں زرگاں میں اس کے کچھ عزیز موجود ہیں۔ اس کی میت انہیں دے دی گئی تھی۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے تازہ گرم آنسو رسنے لگے۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ”اس کا جنازہ کڑے پہرے میں پڑھا گیا۔ شاید پندرہ بیس لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن پتا چلا کہ آج دوپہر زرگاں میں ہزاروں لوگوں نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔“

اسپتال میں سلطانہ کے آخری لمحات میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا اندازہ غلط نکلا عمران! ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ گورے اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خود اس سفید سؤر منیارڈ کو اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے اشارے پر ہی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔“

عمران نے طویل سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان چٹی چمڑی والوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ سلطانہ والا معاملہ وہیں پر ختم کر دینا چاہیے۔ اپنے

حساب سے انہوں نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطانہ کو زندہ پکڑا گیا تو اسے مارنے اور نہ مارنے کا مسئلہ بہت بڑا ایشو بن جائے گا۔ بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ راجواڑے کے حالات تو پہلے ہی سے بہت خراب ہیں۔“

میں نے سسک کر کہا۔ ”عمران! یہ سب کیوں ہوا؟ سب کچھ تو ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ وہ گولی کس نے چلائی جس نے آفتاب کو زخمی کیا اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔“

عمران نے کہا۔ ”وہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس بندے نے چلوائیں جو اس راجواڑے میں ہمارا سب سے کمینہ اور خطرناک دشمن ہے...... وہ پانڈے نے چلوائیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سلطانہ بچ کر یہاں سے نکل جائے۔“

میرا لہو کھول گیا۔ میں نے کہا۔ ”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پانڈے نے چلوائیں؟“

”یہ گولیاں ہمارے پیچھے والی ایک چھت سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے اس بندے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ چھت سے کودا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ ایک پاؤں ذرا دبا کر بھاگ رہا تھا۔ پانڈے کا ایک چوڑی ناک والا ماتحت بھی ایک پاؤں دبا کر چلتا ہے۔ سریش نام ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ...... ماریا کی جان جانے کے علاوہ اور بھی جو جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار یہی رنجیت پانڈے ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اپنے دوسرے ساتھی کیپٹن ٹام اور باقی یرغمالیوں کی جان بچانے کے لئے ان گوروں نے سلطانہ اور آفتاب کو نل پانی میں داخل ہونے دینا تھا۔“

ایک جاں گسل افسوس اور دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ واقعی اگر وہ دو گولیاں نہ چلتیں تو حالات اس وقت کتنے مختلف ہوتے۔ ہو سکتا تھا کہ اب سلطانہ کے علاوہ ہم دونوں بھی نل پانی کے خوبصورت دیوان میں ہوتے۔ وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر نہال ہو رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکتے۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ناقابلِ تلافی دکھ تھا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور میرے تن بدن کو بار بار بھسم کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔''عمران! وہ دوسرا بندہ کون تھا جس پر کتے نے حملہ کیا؟''

''وہ یقیناً سریش کمار کا کوئی ساتھی ہوگا۔''

میری نگاہ میں سارا منظر پھر سے گھوم گیا۔ اس شخص کا عقب سے عمران کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کھیت میں سے اچانک جسیم کتے کا نکلنا اور اس پر جا پڑنا۔ کتے کی لرزہ خیز آوازیں، اس شخص کی دردناک چنگھاڑ، پھر گولی کا چلنا اور کتے کا پلک جھپکتے میں اوجھل ہونا......

میں خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔''عمران! یہ کتا وہی تھا نا جس کی رسّی تم نے کھیتوں میں کھولی تھی؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔''کتا بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، وہ تب سے ہمارے آس پاس ہی تھا۔'' عمران نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ عمران کچھ اور بھی کہے گا......اس نے کچھ نہیں کہا......لیکن میرے ذہن میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے جو عمران نے اپنی رُوداد بیان کرتے ہوئے کہے تھے......اس نے جانوروں کے ساتھ اپنے خصوصی اور حیرت انگیز تعلق کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ خاص کشش جس کی وجہ سے وہ پہلے جان صاحب کی مردم شناس نظر میں آیا اور پھر اسٹار سرکس میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بعدازاں امریکن پروفیسر رچرڈ رچی نے عمران کی اس انوکھی صلاحیت کو ''اسپیشل اینیمل ماسٹری'' کا نام دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وقتی طور پر یہ صلاحیت عمران کے اندر دب گئی ہے یا کہہ لیا جائے کہ زائل ہوگئی ہے لیکن امکان ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد پھر بحال ہوجائے گی۔

تو کیا وہ صلاحیت بحال ہورہی تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''یہی کہ اگر وہ کتا اچانک نمودار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟''

''یہ ''اگر'' بڑا عجیب لفظ ہے تابی! اس کے بارے میں زیادہ غور نہیں کرنا چاہئے۔ جو ہو گیا وہ ہوگیا۔ اب آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہئے۔''

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ واضح طور پر کوئی بڑا بارودی دھماکا تھا۔ درودیوار لرز گئے۔ اس کے فوراً بعد رائفلوں کی گرج سنائی دی۔ جیل کے آس پاس کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ زرگاں میں گڑبڑ چل رہی ہے۔ رات کو تم تو سوئے پڑے تھے، پر میں

گولیوں کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔ رات تین بجے کے قریب دستی بموں کے کئی دھماکے بھی ہوئے تھے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ گڑبڑ تو یہاں پہلے سے ہی چل رہی تھی۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوٹھڑی کے وزنی چوبی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور دروازے میں موجود چوکور خانہ کھل گیا۔ اس ڈیڑھ فٹ مربع خانے میں اب ایک موٹی آہنی سلاخ نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف ایک باوردی گارڈ موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک دوسرا گارڈ مسلح کھڑا تھا۔ پہلے گارڈ نے چوکور خانے میں سے کھانے کے برتن اندر پہنچا دیئے۔ ایک قہر آلود نگاہ ہم پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے چوکور خانہ پھر سے بند کردیا۔ کوٹھڑی میں ایک بار پھر صرف لالٹین کی روشنی رہ گئی۔

عمران نے مجھے کھانا کھلانا چاہا مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کے اندر تین دن تک بھوکی پیاسی رہی اور پھر آزاد فضا میں سانس لینے سے پہلے ہی گولیوں سے چھلنی ہوگئی۔ اس کا زرد چہرہ، اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اس کے سوکھے ہونٹ، سب کچھ میری نگاہوں میں گھوما۔ میں ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ماں کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو میں نے جھیلا تھا اور اس نے مجھے اندر سے جھلسا ڈالا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ سارے گہنے پہنے آنکھوں میں کاجل لگائے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے کانوں میں جیسے اس کی جیتی جاگتی آواز گونجی۔

''مہروج! آپ نے کھانا کیوں ناہیں کھایا؟ آپ کو پتا اِچ ہے کہ آپ ناہیں کھائیں گے تو میں بھی ناہیں کھاؤں گی۔ بھوکی اِچ رہوں گی۔''

میں تصور میں کراہا۔''سلطانہ کہاں چلی گئی ہو تم؟ میں تو ٹوٹا پھوٹا برباد سا پردیسی تھا۔ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھایا۔ مجھے پھر سے زندگی دی...... میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ میرے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے لی لیکن مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اب کیوں چھوڑ گئی ہو مجھے؟ تم نے کہا تھا...... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے...... وہ معصوم تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔ ایک بار آجاؤ سلطانہ...... پھر میں تمہیں اپنی بانہوں میں چھپالوں گا۔ تمہیں اتنی دور لے جاؤں گا کہ اس آگ کی گرم ہوا بھی تمہیں چھو نہ

سکے۔"

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں سنہری جھمکے ہلتے رہے۔ اس کے سینے پر طلائی ہار چمکتا رہا۔ وہ بولی۔ "مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا مہروج...... میں اب آ نا ہیں سکتی۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی...... میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی...... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں...... اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی...... جب سردیوں کی نرم دھوپ آپ کے شہر میں پھولوں اور بچوں کے منہ چومے گی تو میں آپ کے آس پاس ہی ہوں گی...... ہاں، میں آپ کو اور اپنے بالو کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہوں۔"

اس کا ہیولا مدھم ہوتا چلا گیا...... پھر اوجھل ہو گیا۔ میری جلتی آنکھوں میں نمی تھی...... اس کا تصور آنکھوں میں بسائے بسائے میں سو گیا۔

دوبارہ میں زوردار آوازوں کی وجہ سے جاگا۔ گارڈ چلا رہے تھے۔ کسی قریبی کوٹھڑی کا دروازہ زور سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ تب ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔ مسلح گارڈز نے دو افراد کو اندر دھکیلا، پھر ایک تیسرے شخص کو اٹھا کر بیدردی سے کوٹھڑی کے پختہ فرش پر پھینکا اور دروازہ دوبارہ باہر سے لاک کر دیا۔

میری طرح عمران بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس شخص کو اٹھا کر فرش پر پٹخا گیا تھا، وہ بے ہوش تھا۔ وہ حلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ اس کی کھچڑی داڑھی خون سے رنگین تھیں باقی افراد میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں اور عمران بری طرح چونکے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اسے یہاں دیکھیں گے اور وہ بھی اس حالت میں۔ وہ بھرت تھا۔ اس کے نفیس کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ضربوں کے نیلگوں نشان تھے۔ بھرت بھی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید اسے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس جیل کے اندر ہماری ہی کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا۔ ہم کچھ دیر تک ساکت و جامد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ "یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا بھرت؟" عمران نے پوچھا۔

"جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ زرگاں میں بہت سے لوگن کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان میں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ زرگاں میں گوروں اور حکم جی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔" بھرت کا لہجہ انکشاف انگیز تھا۔

"یہ بغاوت نہیں، یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہم جیتیں گے۔" بھرت کے ساتھ کوٹھڑی ئیں بند کیا جانے والا دوسرا شخص جوش سے بولا۔

اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر کسی کند آلے کا زخم تھا۔ رائفل کی ایک گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی

ہوئی گزر گئی تھی۔ اس زخم پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی نام نہیں۔ میں بس مسلمان ہوں اور ان سؤر خور گوروں کو اپنے شہر سے نکالنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا خون چوسنے والے درندے ہیں، یہ ہماری عزتوں کے قاتل ہیں۔ یہ مٹھی بھر پلید جانور ہمارے راجواڑے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں یہاں سے مار بھگائیں گے۔''

ہم نے دیکھا کہ جس بے ہوش شخص کو بیدردی سے فرش پر پھینکا گیا تھا، وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ جو کھانا ہمارے لئے اندر آیا تھا، اس میں پانی بھی موجود تھا۔ عمران نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ ہم نے پہرے داروں کو آوازیں دیں لیکن کسی نے نہیں سنیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادھیڑ عمر شخص جان کی بازی ہار گیا۔ اس کے سینے پر تلوار کا گھاؤ تھا اور یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔ اس کے بازو پر امام ضامن بندھا ہوا تھا۔ یہ امام ضامن یقیناً اس کے کسی پیارے نے اسے باندھا تھا اور باندھ کر اس لڑائی میں بھیجا تھا جو گوروں کے خلاف لڑی جا رہی تھی یا لڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مسلح گارڈز نے دروازہ کھولا۔ کم از کم چار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور یہاں یہ اکیلے چار گارڈز ہی نہیں تھے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہاں ہر طرف باوردی گارڈز موجود ہیں۔ مر جانے والے شخص کی لاش گھسیٹ کر باہر نکالی گئی۔ بھرت کے ساتھ اندر آنے والا دوسرا شخص چلایا۔ ''تم گوروں کا ساتھ دے رہے ہو۔ تم کتوں کی موت مرو گے۔ تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا اس راجواڑے سے۔ تم نے......''

ابھی اس کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک ہندو گارڈ نے رائفل کا دستہ پورے زور سے گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو ہمیں یہ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی ختم ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ تین چار منٹ بعد وہ کسمسانے اور بڑبڑانے لگا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' عمران نے بھرت سے پوچھا۔

''ناہیں...... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان لوگن میں شامل ہے جو زرگاں کے اندر پچھلے دو دن سے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ شاید تم کو پتا نہ ہو، باغیوں نے جامع مسجد کے علاقے میں فوجیوں کا ایک بڑا ڈپو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ وہاں پندرہ بیس سپاہی زندہ جل مرے ہیں۔ ان میں تین چار گورے بھی شامل ہیں۔''

''ہاں، ایک بڑا دھماکا تو ہوا تھا آج آدھی رات کے وقت۔'' عمران نے کہا۔

''یہ وہی ڈپو والا دھماکا تھا۔ اس کے بعد زرگاں میں حکم کے سپاہیوں اور گورے فوجیوں پر کئی جگہ حملے ہوئے ہیں۔ گوروں کے کئی گھروں کو بھی آگ لگائی گئی ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پناہ کے لئے راج بھون کی طرف جا رہے ہیں۔''

''تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بے گناہی کے جرم میں۔'' وہ تاسف سے بولا اور اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھنے لگا۔

ہم کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ''کسی شک میں پکڑا گیا ہے تمہیں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''شک میں ناہیں، وشواس میں پکڑا گیا لیکن یہ بالکل جھوٹا وشواس تھا۔'' بھرت نے آہ بھری۔

''تمہارے گھر والے اور چمپی وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا؟''

''میرے آنے تک تو خیریت سے تھے، اب کا پتا ناہیں۔''

تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''سچ پوچھیں تو زرگاں شہر میں بہت خون خرابا ہو رہا ہے۔ [illegible]ائیوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی ہے۔ آپ کو آواز آ رہی ہو گی...... سنیں اب بھی گولیاں چل رہی ہیں۔''

واقعی کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔

بھرت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں فساد کی خبر [illegible] کر میں گاؤں سے یہاں پہنچا تھا۔ آپ کو پتا ہے نا، میرے بڑے بھیا یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی چنتا تھی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست مدن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ کل رات ایک انگریز فیملی مدن کے پاس پناہ کے لئے آئی۔ اس میں اٹھائیس تیس سال کی ایک جواں سال ناری اور اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کی عمر سات آٹھ سال ہووے گی، لڑکی چار پانچ برس کی تھی۔ یہ مدن دراصل سرکاری ملازم بھی ہے۔ یہ اسی انگریز عورت کرسٹی کے محلے میں رہتا ہے۔ اس عورت نے سوچا ہووے گا کہ یہاں وہ محفوظ ہو جاوے گی۔ لیکن اسے پتا ناہیں تھا کہ بغاوت پھوٹنے کے بعد بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پرائے اپنے بن گئے ہیں اور دوستوں نے دشمنوں کا روپ دھار لیا ہے۔ مدن نے کرسٹی کو پناہ تو دے دی لیکن اندر خانے اس کی

نیت خراب ہوگئی۔ اس نے اپنی پتنی سے کہا کہ کرسٹی اور اس کے بچے یہاں گھر میں محفوظ نا ہیں ہیں۔ بلوائیوں کو شک ہو گیا تو وہ انہیں گھسیٹ کر یہاں سے لے جاویں گے اور گلی میں جا کر ان کی ہتھیا کر دیویں گے۔ شاید میں نے بتایا نہیں، یہ کرسٹی محلے دار ہونے کے کارن مدن کی پتنی کی سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی ڈر گئی کہ کہیں کرسٹی اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ ہو نہ جاوے۔ مدن نے کہا کہ وہ کرسٹی کو اپنی باغ والی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے دو دوست بھی موجود تھے۔ تیسرا میں تھا۔ باغ والی حویلی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مدن کی نیت کیا ہے......"

میں نے بھرت کو روکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات کاٹ رہا ہوں...... کہیں یہ مدن وہ...... منیجر مدن تو نہیں جو لال بھون میں کام کرتا ہے؟"

بھرت نے کہا۔ "مجھے لال بھون کا تو پتا نا ہیں لیکن اتنا جانت ہوں کہ وہ منیجر ہے۔ اس کے بال جلدی سفید ہو گئے ہیں اس لئے کبھی کبھی خضاب بھی لگاوت ہے۔"

میں اور عمران جان گئے کہ وہ اسی منیجر مدن کی بات کر رہا ہے جو لال بھون میں "پریوں" کی تربیت کے کام میں میڈم صفورا کی مدد کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ جنٹل مین لگتا تھا لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آ رہی تھی، وہ کسی دوسری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے بھرت سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ بھرت نے تفصیل میں جاتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا لبِ لباب کچھ یوں ہے۔

مدن اور اس کے دونوں دوستوں کی نیت کرسٹی پر خراب ہو چکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کبھی عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ انہوں نے کبھی گوری عورت نہیں دیکھی تھی۔ جس طرح ٹکٹیں جمع کرنے کے شوقین ہر طرح کی ٹکٹیں اپنے البم میں جمع کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی عیاش لوگ ہر طرح کی اور ہر رنگ ڈھنگ کی عورت کے ساتھ شب بسری کی خواہش رکھتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مدن اور اس کے دوستوں کی تھی۔ وہ کسی انگریز میم کی قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جو سنسنی خیز اور خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اس نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایک میم کو اپنے تصرف میں لائیں۔ دوسری طرف میم کرسٹی بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے معصوم بچوں کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مدن کمار کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ مدن کمار نے اسے مجبور کیا کہ وہ نہا دھو کر ہندوستانی کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور ان سب کو شراب پلائے۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے طور پر یہ حتمی نتیجہ نکال چکے تھے کہ اگر انگریزوں اور ان

کے پٹھو حکم جی کے خلاف، یہ خونی ایجی ٹیشن کامیاب ہونا ہے اور کرسٹی اور اس جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت مالِ غنیمت سے زیادہ نہیں۔

بھرت فطرتاً اچھا آدمی تھا۔ جو کچھ مدن اور اس کے دوست کرنے جا رہے تھے وہ اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ اس نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے۔ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ نوبت گالم گلوچ تک آ گئی۔ بھرت نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، وہ جا کر چوکی میں اطلاع کرے گا۔ بھرت کے یہ تیور دیکھ کر مدن کمار اور اس کے دوستوں نے بھرت کو ایک اسٹور روم میں بند کر دیا۔ بھرت شور مچاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کرسٹی کے ساتھ عیاشی شروع کر دی۔ کرسٹی کے دونوں بچے بالائی منزل کے ایک کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کرسٹی کو امید تھی کہ وہ اپنی اور بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی "خدمات" کے عوض یہ ہندوستانی اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں گے لیکن جو کچھ ہوا، اس کا علم کرسٹی کو نہیں تھا اور مدن وغیرہ بھی بے خبر تھے۔ حکم کے وفادار سپاہیوں کی ایک گھوڑا گاڑی اس عمارت کے پاس سے گزری۔ ان سپاہیوں میں ایک گورا افسر بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سفید فام بچی کو روتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کرسٹی ہی کی بچی تھی۔ سپاہیوں نے حقیقت حال جاننے کے لئے عمارت کے اندر آنا چاہا...... مدن کے چوکیدار نے رنگ رلیوں میں مصروف مدن کمار کو اطلاع دی۔ اسی دوران میں سپاہیوں نے پھاٹک پھلانگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ مدن تو قدرے ڈرپوک بندہ تھا مگر اس کے ساتھیوں نے گولی چلا دی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر آئی اور کرسٹی کے سر کے سنہری بالوں میں سرخ پھول کھل گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں دم توڑ گئی۔ حکم کے سپاہیوں میں سے ایک کو عمارت کے احاطے میں گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاید انہیں اندر سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اب یقیناً وہ کمک لینے گئے تھے۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب انہیں فوراً یہاں سے کھسکنا ہو گا۔ تاہم جاتے جاتے انہوں نے بھرت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسٹور روم میں آئے، مدن تو بھرت سے گالم گلوچ کرتا رہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے اچانک عقب سے بھرت کو دبوچ لیا۔ اس کے منہ پر بڑی سختی سے ایک بدبودار رومال رکھ دیا گیا۔ چند سیکنڈ میں بھرت بے ہوش ہو گیا۔

جب آدھ پون گھنٹے بعد وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آیا اور اس نے بوجھل آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا تو خود کو عجیب حالت میں پایا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کرسٹی کی برہنہ لاش کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ کرسٹی کی برہنہ لاش کے اوپر چادر ڈال دی گئی تھی۔ ان کے اردگرد کئی گورے اور مقامی فوجی موجود تھے۔ گورے فوجیوں نے اسے ٹھوکریں ماریں اور گندی گالیاں دیں۔ اسے کرسٹی کے روتے ہوئے بچوں کے سامنے لایا گیا۔ بچوں نے بھی تصدیق کی کہ بھرت ان بندوں کا ساتھی ہے جنہوں نے ان کی مما کو پکڑا تھا۔ بھرت نے بہت دہائی دی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کی مدہوشی کو بھی شراب اور منشیات کی مدہوشی سے ہی تعبیر کیا گیا اور اب بھرت یہاں اس جیل میں تھا۔ پکڑ دھکڑ کی وجہ سے جیل میں گنجائش کم پڑ رہی تھی لہٰذا بھرت کو بھی دیگر دو قیدیوں کے ہمراہ ہماری کوٹھڑی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہم نے پوری توجہ سے بھرت کی رُوداد سنی اور بیچ میں سوالات بھی کئے۔ بھرت نے باہر کے حالات کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ماریا کی موت کا گورا جاتی کے لوگن (انگریز کمیونٹی) نے بہت سوگ منایا ہے۔ ماریا کو گورا قبرستان میں جارج کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سرجن اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ نے سوگند کھائی ہے کہ وہ ماریا کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کریں گے۔''

''اس زخمی افسر کیپٹن ٹام کا کیا بنا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ خبیث بچ گیا ہے۔ سنا ہے کہ اسے بچانے کے لئے پولیس افسر رنجیت پانڈے نے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ اسے برستی گولیوں میں اپنا ''کور'' دے کر احاطے سے باہر لے آیا تھا۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن ٹام کو اور باقی لوگوں کو خطرے میں ڈالنے والا بھی تو یہی کتا پانڈے تھا۔''

''کیا مطلب؟'' بھرت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' عمران بات گول کر گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آفتاب اور ہاشم کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''ان کی لاشیں کسی نے وصول ہی ناہیں کیں۔ ان کا جو کچھ کیا ہوگا، حکم کے سپاہیوں نے ہی کیا ہوگا یا پھر ہوسکت ہے کہ انہیں امام مسجد قادر بخش صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کچھ کٹر قسم کے لوگن یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ امام قادر بخش صاحب کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں اور ان کی بدعہدی کی وجہ سے ماریا کی جان گئی ہے۔ حالانکہ سب جانت ہیں

کہ امام صاحب نے معاملے کو سنبھالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ یہ ہاشم رازی کی ہٹ دھرمی تھی جس کے کارن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ بہرحال، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کچھ لوگن کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ دونوں یعنی آپ اور تابش، گورے افسروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور ماریا کے بدلے میں سلطانہ بی بی کا جیون بچانا چاہت تھے......''

عمران نے کہا۔ ''اب باہر کے حالات کیا ہیں بھرت؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ گوروں اور حکم کے وفادار سپاہیوں کے خلاف عام لوگوں کی یہ بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟''

بھرت نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ابھی وشواس سے کچھ ناہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت جو بھی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہی حصہ لے رہے ہیں۔ کہیں کہیں نچلی جاتیوں کے ہندو اور بودھ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گوروں اور حکم جی کے پاس جدید اسلحہ اور طاقت ہے۔ ایک باقاعدہ فوج ہے۔ جب تک نل پانی میں چھوٹے سرکار کی طرف سے کوئی حرکت ناہیں ہووے گی، اس لڑائی کا فوری نتیجہ نکلنا آسان ناہیں ہے......''

''غلط...... بالکل غلط۔'' اچانک فرش پر لیٹے زخمی نے دہاڑ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ''زرگاں کے جی داروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اکیلے ہی اس مٹھی بھر گوروں کو چیر کر چیل کوؤں کے آگے پھینک دیں۔ انور خاں ہمارا سالار ہے ...... اور اب وہ ہمارے درمیان ہے۔ اس شیر کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ انور خاں کا ایک ایک جاں نثار...... کرائے کے ان سو سو ٹٹوؤں پر بھاری ہے......''

انور خاں کا نام سن کر میں چونکا۔ اس کا روشن چہرہ، اس کی کشادہ پیشانی، اس کا چوڑا سینہ اور اس کا پُرجوش انداز...... سب کچھ ایک لمحے میں میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا زرگاں کے مسلمان انور خاں کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہ انور خاں ہی تھا جس نے سلطانہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد جارج گورا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا...... انور کی قیادت میں سیکڑوں پُرجوش لوگوں نے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہلا بولا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اب یہ زخمی شخص بتا رہا تھا کہ انور خاں پھر زرگاں میں ہے اور باغی گروہوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ حوصلہ افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے زخمی شخص سے پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ انور خاں یہاں ہے؟''

''بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ جو انگریزوں اور دیسی انگریزوں کی دم میں نمدہ فٹ ہو رہا ہے، یہ یونہی نہیں ہو رہا۔ لوگ جانتے ہیں کہ شیر بھیڑوں، میں گھس آیا ہے اور اب ان بھیڑوں کو

بھاگتے ہی بنے گی۔ تم دیکھنا چند دن کے اندر زرگاں کی گلیوں میں حکم کے بھاڑے کے ٹٹوؤں اوران گوروں کی لاشیں گھسیٹی جائیں گی۔"

بھرت نے کہا۔ "بے شک انور خاں دلیر شخص ہے۔ بہت سے لوگن اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ زرگاں میں ابھی تک کہیں نظر نا ہیں آیا۔ یہی کارن ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگن یہ وشواس نا ہیں کر رہے کہ وہ واقعی یہاں موجود ہے۔"

"وہ ہے...... وہ ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے اور باقی بھی جلد دیکھیں گے۔" زخمی شخص پورے اعتماد سے بولا۔ "کل جن جاں بازوں نے اسلحہ گودام میں آگ لگائی ہے، ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔"

اسی دوران میں ایک اور بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھماکا شہر کے وسط میں کہیں ہوا تھا۔ گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک بڑا دھماکا ہے...... اس کے ساتھ ہی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ بھی سنائی دینے لگی۔ زخمی شخص نے پُر جوش انداز میں ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے گلے میں موجود چاندی کے ایک چمکیلے تعویذ کو کئی بار چوما۔

ہم کچھ دیر تک کان لگا کر سنتے رہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد فائرنگ تھم گئی۔ زخمی شخص نے عمران اور بھرت کے پوچھنے پر اپنا نام ابراہیم بتایا۔ وہ بولا۔ "آج رات بارہ بجے تک پورے شہر میں کارروائیاں ہوں گی۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔"

"مبارک دن؟" میں نے پوچھا۔

"آج چاند کی سات تاریخ ہے اور بدھ کا دن ہے۔ چاند کی سات اور بدھ کا دن ان گوری چمڑی والوں کے لئے بہت منحوس ہے۔ اسی طرح اگر چاند کی پانچویں اور تیرہویں تاریخ کو بدھ کا دن آئے گا تو وہ بھی ان گوروں اور حکم ہرکاروں کے لئے بڑا نحس ہوگا۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اب آنے والا ہر دن ہی ان مردودوں کے لئے نحس ہوگا۔ بہت جلد ان کا بیڑا غرق ہونے والا ہے۔ ان کا ظلم ہی ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔"

"یہ چاند کی تاریخوں والی بات کس نے بتائی ہے؟" بھرت نے ابراہیم سے پوچھا۔

ابراہیم نے چاندی کے تعویذ کو چوما اور عقیدت سے بولا۔ "ہمارے حضرت صاحب نے۔ اور یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ نہ ہی تم ان کو وہم سمجھ سکتے ہو۔ ان گوری چمڑی والوں کے دن اس راجواڑے میں پورے ہو چکے ہیں۔ اب ان کو یہاں سے بھاگنا ہے یا کتے کی موت مرنا ہے۔" اس نے ایک بار پھر پُر جوش نعرہ لگایا۔

کوٹھڑی کے چوبی دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھلا اور ایک گارڈ نے شعلہ بار

نظروں سے ہمیں گھورا۔ وہ زخمی ابراہیم کو مخاطب کر کے بولا۔ "گندے گٹر کی طرح زیادہ ابلتا مت جا۔ چپ کر کے بیٹھ، ورنہ ابھی گلا کاٹ کر پھینک دیویں گے۔"

ابراہیم پھنکارا۔ "گلا کاٹ بھی دو گے تو یہ آواز بند نہیں ہوگی۔ تم کتنے گلے کاٹو گے، کتنی آوازیں بند کرو گے؟"

گارڈ نے زہرناک لہجے میں کہا۔ "دوسروں کا تو کہہ نا ہیں سکتا لیکن تیری بولتی ضرور صبح تک بند ہو جاوے گی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے چوکور خانے کا پٹ زور سے بند کر دیا۔

ابراہیم نے بلند آواز میں اسے کوسا پھر دروازے کی طرف تھوک دیا۔

گارڈ کی دھمکی اور اس کا لہجہ قابلِ غور تھے۔ "یہ کیا کہہ کے گیا ہے؟" عمران نے ابراہیم سے پوچھا۔

"جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن نہیں مار سکتے۔ جب تک میری زندگی ہے، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس نے ایک بار پھر عقیدت سے چاندی کے تعویذ کو چوما۔ اس کے چہرے پر فکر تردد کا نشان تک نہیں تھا۔

ابراہیم ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دلوں میں انگریزوں اور ان کے کٹھ تپلی حکم جی کے خلاف شعلے بھڑک رہے تھے۔ سلطانہ کی موت کے بعد یہ شعلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے...... وہ مرنا یا مار دینا چاہتے تھے......

رات بھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ علی الصباح مسلح گارڈز آئے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ بڑے صاحب محترم اینڈرسن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم نے جانے میں پس و پیش کی لیکن وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ ہمیں مختلف آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ارد گرد کی کوٹھڑیوں سے بھی کچھ قیدیوں کو نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ایسے کچھ قیدی مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

صرف آدھ گھنٹے بعد ساری صورتِ حال سامنے آ گئی اور یہ کافی سنگین تھی۔ یہ سنگین صورتِ حال ہمیں دکھانے کے لئے گاڈرز نے ہماری کوٹھڑی کے دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھول دیا۔ آہنی سلاخ کی دوسری جانب دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک دوسرا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اب ہمیں جیل کے ایک چھوٹے احاطے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک سرسری ساعت کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ بس ایک لمبی میز تھی جس کے پیچھے اسٹیٹ کے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ دو مقامی اور دو انگریز تھے۔ انگریزوں میں تمتماتے چہرے والا اینڈرسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ بہنے لگی۔ سلطانہ کی

اچانک موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسٹیٹ کے فوجی افسروں کے سامنے ایک قطار میں قریباً پندرہ افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط رسیوں سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کو بھی اسی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں شامل تھا۔ لگتا تھا کہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اینڈرسن نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”تم لوگوں پر یہ الزام ثابت ہوتا ہیں کہ تم نے عام شہریوں پر حملے کئے۔ اسپیشلی تم نے برٹش عورتوں اور بچوں کا مرڈر کیا۔ ان کی پراپرٹی کو نقصان پہنچایا...... اور کھلے عام بغاوت کی...... اس کے علاوہ دوسروں کو بغاوت پر اکسایا۔ ان کرائمز کے لئے یہ کورٹ تم کو سزائے موت دیتا......“

قیدیوں میں سے دو افراد چلانے لگے۔ ان میں ایک ابراہیم تھا۔ وہ اینڈرسن کے فیصلے کو یکسر رد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو نہیں، اپنے ساتھ لڑنے والے مسلح لوگوں کو مارا۔ ان ظالموں کو مارا جنہوں نے یہاں کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔

اینڈرسن اور دیگر افسروں کے چہرے پتھر کی طرح سپاٹ تھے۔ ان پر ان باتوں کا بالکل اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان قیدی کا رنگ یکسر ہلدی نظر آیا۔ اس نے التجا کے لہجے میں کچھ کہا۔ شاید افسروں کی منت سماجت کی۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ان لوگوں میں شامل نہیں ہوا۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کی حالت ترس ناک تھی مگر یہاں انہیں ترس کھانے کے لئے نہیں، شوٹ کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لی وان کا تیرہ چودہ سالہ پوتا یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی رویا بلکا تھا۔ بھرت کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اسپتال کے خونی ہنگامے میں وہ بچ گیا ہے۔ ابراہیم دھاڑنے لگا۔ ”تم گوری چمڑی والوں کی موت بڑی دردناک ہوگی۔ کتوں کی طرح زرگاں کی گلیوں میں گھسیٹے جاؤ گے۔ موت کو ترسو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔“ پھر اس نے اپنا سینہ تان لیا۔ جیسے گولی کھانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا ہو۔

اس کو دیکھ کر اور کئی افراد نے بھی سینے تان لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سے اکثر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ رائفل اسکواڈ بالکل تیار کھڑا تھا۔ یہ چھ باوردی سپاہی تھے جو جدید رائفلیں کندھوں سے لگائے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ اینڈرسن نے اپنے ہاتھوں میں سفید رومال پکڑ لیا تھا۔ رومال کے اس اشارے پر قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جانا تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مجھے کچھ عرصے پہلے اسحاق کی دردناک موت یاد

آ گئی۔ دو مسلح سپاہی آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار چاقو تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے تعویذ اور امام ضامن وغیرہ کاٹ کر ان کے جسموں سے علیحدہ کر دیئے۔ ایک پارسی نوجوان کے لباس سے ایک چھوٹی سی...... پاکٹ سائز کی مذہبی کتاب بھی نکلی۔ یہ اشیاء قیدیوں کے جسموں سے علیحدہ کرنے کے بعد قیدیوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے گناہوں کی معافی مانگ لیں، انہیں گولی ماری جا رہی ہے۔

نوجوان لڑکا آخری کوشش کے طور پر پھر منت سماجت کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد اس کی آواز فائرنگ کی خوفناک آواز میں دب گئی۔ فائرنگ اسکواڈ نے اندھا دھند برسٹ چلائے اور پندرہ کے پندرہ قیدیوں کو چھلنی کر دیا۔ ان کے جسم اوندھے سیدھے گرے اور تیزی سے خون اگلنے لگے......

ہماری طرح یہ منظر جیل کے اور بھی بہت سے قیدیوں نے دیکھا۔ ایک وحشت زدہ سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمہ چلا تھا۔ استغاثہ اور صفائی کے دلائل سنے گئے تھے اور سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے کا چوکور روزن بند کر دیا گیا اور ہماری کوٹھڑی میں صرف لالٹین کی مدھم روشنی باقی رہ گئی۔

”یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کئے بغیر زردوشوں کو مارا جا رہا ہے۔“ بھرت نے تاسف سے کہا۔

”جب پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگے تو ظالم حکمراں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔“ عمران نے بوجھل لہجے میں کہا۔

زخمی ابراہیم نے دو گھنٹے پہلے جن برتنوں میں ناشتا کیا تھا، وہ اسی طرح ایک کونے میں پڑے تھے۔ اس کی خون میں بھیگی ہوئی ایک پٹی بھی ایک گوشے میں رکھی تھی لیکن وہ خود اب نہیں تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان پندرہ قیدیوں کو سرعام سزا اس لئے دی گئی ہے کہ دیگر قیدی عبرت پکڑیں اور عملے کے احکام پر بے چوں چرا عمل کریں۔ اس سزا کے بعد دروازے کا روزن بند ہو چکا تھا اور ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی دوبارہ کھلے گا۔ مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک دو منٹ تک کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے پاس لائی گئی ہے۔ پھر روزن یعنی چوکور خانے کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا۔ دوسری طرف کا منظر تعجب خیز تھا۔ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر مسٹر اینڈرسن بڑی شان سے ایک صوفہ نما نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں

گار اور دوسرے ہاتھ میں وہسکی کا جام تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتما رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح انگریز فوجی موجود تھے۔ وہ اپنے چمکیلے جوتے والے ایک پاؤں کو مسلسل ہلا رہا تھا۔

میرا خون ایک بار پھر رگوں میں سیال آگ کا روپ دھار گیا۔ جی چاہا کہ ارد گرد کی ساری رکاوٹوں سے ٹکرا جاؤں، ان کو توڑ دوں یا خود ختم ہو جاؤں...... اور اگر ان کو توڑ دوں تو پھر اس تمتماتے چہرے والے سفید شیطان پر جا پڑوں اور خالی ہاتھوں سے اس کا جسم پھاڑ کر رکھ دوں۔

اس نے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''افسوس ہے کہ مجھے تمہیں یہاں دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کچھ طے ہوا تھا۔''

اینڈرسن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کھڑے دونوں انگریز محافظ ایک طرف اوجھل ہو گئے۔

اینڈرسن بولا۔ ''ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی پہلی شرط تو یہی تھی کہ تم دونوں ہندو سپاہیوں کے سامنے نہیں آؤ گے۔ لیکن جب تم آ گئے اور بہت سے لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر ہمارا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔''

عمران نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت سامنے آئے تھے جب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کم از کم سلطانہ کو ہی بچایا جا سکے اور پھر......''

یکا یک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک طرف سے وزنی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر رنجیت پانڈے ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی میں ایک سرخ رنگ کی پٹی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر مسٹر اینڈرسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات مسٹر اینڈرسن کے حوالے کئے اور دھیمے لہجے میں کچھ کہا بھی۔

''ویل ڈن...... ویل ڈن۔'' اینڈرسن نے سر ہلایا۔

ہم پر ایک اور ترچھی نظر ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ بڑی زہریلی کمینگی تھی اس نظر میں۔

عمران نے اینڈرسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے پانڈے صاحب کی پروموشن ہو گئی ہے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔ ہمیں اچھے اور قابل ساتھیوں کی قدر کرنا آتی ہے۔

پانڈے نے اٹھرا گاؤں میں کارکردگی دکھائی ہے۔''

''ہاں کارکردگی تو اس نے واقعی دکھائی ہے۔'' عمران نے ہولے سے کہا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... آپ...... پانڈے صاحب کی کارکردگی کا بتا رہے تھے۔''

اینڈرسن نے گلاس میں سے ایک سنہری گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کے وقت پانڈے نے زخمی کپتان ٹام بریرے کو بچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ برستی گولیوں میں اس تک پہنچا اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر فائرنگ کی زد سے نکال لیا۔ اور یہی نہیں، اس سے صرف دو منٹ پہلے وہ ایک اور اہم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔''

''وہ بھی بتا دیجئے جناب۔'' عمران نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس جنونی قاتل آفتاب خان کو شوٹ کیا۔ اگر وہ جلدی ہی ایسا نہ کرتا تو شاید اور کئی لوگوں کی جان جاتی...... بہرحال، وہ تیسرا بندہ کہیں نہیں مل سکا جو آفتاب اور سلطانہ کے ساتھ تھا۔''

عمران خاموش رہا۔ ہم جانتے تھے کہ تیسرے بندے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری گفتگو حسبِ سابق انگلش میں ہو رہی تھی۔ عمران چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر اینڈرسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''واقعی جناب! وہاں پانڈے صاحب کی کارکردگی زبردست رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ محترمہ ماریا کی موت کا ''کریڈٹ'' بھی پانڈے صاحب کو ہی جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' اینڈرسن نے عمران کو گھورا۔

عمران نے کہا۔ ''آپ نے سوچا ہے کہ وہ گولی کس نے چلائی جس کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہوئی اور محترمہ ماریہ سمیت کئی افراد کی جان چلی گئی؟''

اینڈرسن نے سگار کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ دھوئیں کے پس منظر میں وہ قیدی مزدور نظر آ رہے تھے جو ''سرسری عدالت'' کے فرش پر سزائے موت پانے والے قیدیوں کا خون صاف کر رہے تھے۔ کسی ساتھ والی راہداری میں پہرے داروں کے جوتوں کی ٹھک ٹھک گونج رہی تھی۔ ماحول میں عجیب سی سہمی ہوئی خاموشی تھی۔ اینڈرسن نے ایک اَبرو اٹھائی اور انگلش میں اسٹائل میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے گولی چلانے والا کوئی باسٹرڈ مقامی ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ سر جارج کی معزز بہن اس صورت حال میں سے زندہ سلامت نکل جائے۔ اس نے کسی قریبی چھت پر سے فائرنگ کی اور سب

کچھ درہم برہم کر دیا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہوتا ہی جنونی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ گولی چلانے والا اور اس سارے معاملے کو خراب کرنے والا آپ کا چہیتا افسر رنجیت پانڈے تھا تو پھر......"

"میں تمہاری اس بکواس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔"

"بہت اعتماد ہے آپ کو اس پر؟"

"اعتماد بھی ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ گولیاں چلیں، اس وقت وہ میرے ساتھ موجود تھا۔"

"اس نے وہ خود نہیں چلائیں۔ اس کے ساتھیوں نے یہ کام کیا۔"

"کیا میں شکل سے تمہیں اتنا گاؤدی نظر آتا ہوں کہ تمہاری باتوں پر بھروسا کروں گا؟"

"اسی لئے تو آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

اینڈرسن جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ 'اپنی اطلاع تم اپنے پاس رکھو۔ میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنے سوالوں کا صحیح صحیح جواب چاہئے؟"

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ہم آپ سے تعاون کریں تو ہمارے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟"

اینڈرسن نے دھواں نتھنوں سے خارج کیا۔ "تم نے اسپتال والے ہنگامے میں سب کے سامنے آ کر غلطی کی۔ اس غلطی کا خیازہ تو تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ کیا خمیازہ ہو گا، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" عمران نے کہا۔

"انور خاں کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ تابش کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اس وقت یہاں زرگاں میں موجود ہے۔ یہاں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں تابش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہاں زرگاں میں انور خاں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ مجھے زرگاں میں اس کے قریبی دوستوں کے کوائف بھی درکار ہیں۔"

میں اب تک ہونے والی گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ میری آنکھیں اینڈرسن کی دید سے جل رہی تھیں اور سینے میں آتشیں طوفان ابل رہا تھا۔

اینڈرسن نے عمران سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں...... انور خاں کے بارے میں تم کیا بتا سکتے ہو ہمیں......"

میں خاموش رہا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر۔

اینڈرسن پھنکارا۔ "میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ جناب سے...... اپنے ساتھی انور خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟"

میں نے اینڈرسن کی نیلگوں آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ انور خاں تم جیسے سارے سفید کتوں کی ٹانگیں چیرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ ضرور چیرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو پھر کوئی اور کرے گا۔ میں کروں گا یا میرے جیسا کوئی دوسرا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس راجواڑے میں تم ذلیلوں کی بدمعاشیوں کے دن گزر گئے ہیں...... گزر گئے ہیں۔" میں نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ...... در و دیوار میں گونج محسوس ہوئی۔

میرا یہ جواب اور لب و لہجہ بالکل غیر متوقع تھا۔ پہلے اینڈرسن کی آنکھوں میں شدید حیرت نظر آئی پھر اس کا چوڑا چکلا سرخ چہرہ سرخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "باسٹرڈ...... بدذات کالے...... تیری یہ جرأت......" وہ صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے چنگھاڑ کر آواز دی۔ "جوزف...... ڈیوی...... ادھر آؤ...... جلدی کرو۔"

پھر اس نے فرطِ طیش میں جھپٹ کر اپنا توانا بازو دروازے کے چوکور خلا سے اندر گھسا دیا۔ وہ میری گردن پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن میری گردن اس کی پہنچ سے قریباً ایک فٹ دور تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور خوفناک آواز میں دہاڑا۔ "لگتا ہے سابر مقابلے نے تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیئے۔ اس جھوٹی فتح کی زہریلی خماری تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ میں تیرا علاج کرتا ہوں۔ بڑا کارگر علاج کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد تجھے ایسے کمینے پن کی شکایت ہوئی تو میرا نام بدل دینا......"

یہی وقت تھا جب دونوں انگریز گارڈز لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹرپل ٹو رائفل لی اور دروازے کے چوکور خلا میں سے میرا نشانہ لے لیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلے قدم کے طور پر میری ٹانگ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دریغ گولی چلائی جو میری ٹانگ کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگوں پر دوسرا فائر کرتا، عمران تڑپ کر چوکور خلا کے سامنے آ گیا۔ "نہیں جناب! گولی نہ چلائیں۔ میں اس کی غلطی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اس نے غلطی کی ہے لیکن......"

"تم آگے سے ہٹ جاؤ باسٹرڈ۔ ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔" اینڈرسن دہاڑا۔ اس نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران نے پھر لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "بیوی کی موت کے بعد یہ اپنے حواس میں

نہیں ہے۔ جناب! اول فول بک رہا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں گے تو آپ سے معافی مانگے گا۔"

"ہوش تو اس کتے کے ابھی ٹھکانے آجاتے ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔" اینڈرسن پھر گرجا۔

عمران اپنی جگہ ڈٹا رہا اور دو تین منٹ کی کوشش سے اینڈرسن کا پارا نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تند و تیز گفتگو کے آخر میں اینڈرسن نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں کو کل اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں انور خاں کے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، اس کے ذمے دار تم خود ہوگے۔" وہ اپنے بھاری بوٹوں سے فرش کو کوٹتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے اس کی باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اردگرد کا سارا ماحول ہی مجھ پر بے اثر تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ نگاہوں کے سامنے صرف سلطانہ کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔ اکھڑی سانسیں، مجھے حسرت سے تکتی نظریں اور پھر اس کے بعد رنجیت پانڈے کی منحوس شکل۔ اس کا چہرہ میرے لئے دنیا کی سب سے قابلِ نفرت شے بن گیا تھا۔ اسی شخص کی مکاری نے اسپتال میں بساط الٹی تھی۔ اس شیطان نے بارود کو چنگاری دکھا کر سب کچھ ختم کیا تھا۔

اینڈرسن نے ہمیں انور خاں کے حوالے سے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن یہ مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ ہمیں اس امتحان سے گزرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ سارا دن ہی عجیب سے تناؤ اور غیر یقینی کیفیت میں گزرا۔ صبح سویرے جس طرح پندرہ قیدیوں کو سب کے سامنے گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا، وہ نا قابلِ فراموش منظر تھا۔ ان قیدیوں کی آخری کراہیں جیسے ابھی تک در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ عمران کے بے حد اصرار پر میں نے شام کے وقت کھانے کے دو تین لقمے لئے اور پھر ایک گوشے میں پڑ کر لیٹ گیا۔ بھرت ایک خوش گفتار شخص تھا مگر اس کوٹھڑی میں آنے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ اس پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے اور وہ آج دیکھ ہی چکا تھا کہ سزا دینے میں یہ گورے کتنے سفاک اور بے حس ہیں۔ عمران کی خوش کلامی بھی سنجیدگی کی گھمبیرتا میں چھپی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے موجودہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ بھرت نڈھال سا ہو رہا تھا۔ عمران ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

"ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

جب اس نے دوسری بار اصرار سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اٹھنے بیٹھنے سے میرے سر کے گومڑوں میں ٹیسیں اٹھتی تھیں لیکن ایسی ٹیسوں کو میں نے اب خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے زخموں کے حوالے سے میں ایسی بے پروائی برتتا تھا کہ کبھی کبھی بھول ہی جاتا تھا کہ مجھے زخم لگا ہے۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو اس نے انگلی سے پتھریلی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے غور کیا اور حیران رہ گیا۔ یہاں کسی نکیلی شے سے انگریزی کے پانچ حرف کندہ کئے گئے تھے۔ ان حرفوں سے جو لفظ بنتا تھا وہ "جیکی" تھا۔

عمران نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے روحانی استاد باروندا جیکی نے اسی کوٹھڑی میں اپنے اسیری کے دن گزارے تھے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ حیرت انگیز اتفاق تھا۔ میں نے چاروں طرف سر گھما کر پہلی بار اس کوٹھڑی کو بغور دیکھا۔ یہ قریباً دس ضرب بارہ فٹ کی مختصر جگہ تھی۔ یہاں رات اور دن میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ موٹے لوہے کا ایک چھوٹا سا زنگ آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کے ایک بدبودار غسل خانے میں کھلتا تھا۔ تو یہ تھی وہ جگہ جہاں جارج گورا نے باروندا جیکی کو رکھا اور اس پر ستم کے پہاڑ ڈھائے۔

عمران نے لالٹین کی روشنی میں مجھے کوٹھڑی کا ایک اور گوشہ دکھایا۔ یہاں جیکی کے نام کا پہلا حرف "جے" اور اس کی محبوبہ شکنتلا کے نام کا پہلا حرف "ایس" کندہ تھا۔ ان دو حرفوں کے اوپر یقیناً کوئی رومانی فقرہ لکھا گیا تھا مگر اس فقرے کو بعد ازاں رگڑ رگڑ کر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے یہ کام جیل کی انتظامیہ نے ہی کیا ہوگا۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ باروندا جیکی نے اپنی قید کے دن یہاں کاٹے تھے۔ یا کم از کم اپنی قید کا کچھ عرصہ یہاں کاٹا تھا۔

ہم لالٹین کی زرد روشنی میں ان دیواروں کو بغور دیکھتے رہے۔ یہ جگہ میرے لئے ایک دم تاریخی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایک جگہ جیکی کا سب سے پسندیدہ فقرہ لکھا ہوا نظر آیا۔ "نو پین......نو گین۔" یعنی درد نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

...... ہاں، یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں جیکی رہا تھا۔ یہاں کی دیواروں پر اس کا لمس تھا۔ یہاں کی فضا میں اس کی سانسیں رچی ہوئی تھیں۔

رات گہری ہو گئی۔ میں سونے کے لئے لیٹا تو جیکی کا تصور میرے سامنے آ گیا۔ کٹا پھٹا

اپاہج جسم، مدقوق چہرہ، اندر دھنسی ہوئی لیکن چمکیلی آنکھیں۔ میں نے سوچا، وہ بھی ایسے ہی اس فرش پر چت لیٹتا ہوگا۔ ایسے ہی لالٹین کی زرد روشنی میں سیاہی مائل چھت کو دیکھتا ہوگا۔ اپنی شکنتلا کو یاد کرتا ہوگا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے آس پاس ہے۔ اس کی روح اپنے اس پرانے مسکن میں موجود ہے۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جیکی! تم نے اس تاریک کوٹھڑی میں کرب کے جو شب و روز گزارے تھے، ان کا مداوا تو شاید کوئی نہ کر سکے لیکن تیرے بدترین دشمن جارج کو اس کے انجام تک میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس نے تیرے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تجھے اس تاریک قبر میں پھنکوایا تھا، آج وہ خود ''گورا قبرستان'' کی ایک قبر میں موجود ہے......''

میں تصور میں جیکی سے محوِ کلام تھا جب اچانک مجھے اس چاقو کا خیال آیا جو جارج کی موت کی یادگار تھا اور میں نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت یقیناً وہ چاقو بھی دوسری اشیاء کے ساتھ فوجیوں کے پاس چلا گیا تھا...... میں اس بارے میں سوچ رہا تھا جب یکا یک ایک بار پھر جیل کی چار دیواری سے باہر دھماکے سنائی دیئے۔ عمران کا کہنا تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ ساتھ میں فائرنگ بھی شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ یہ فائرنگ کافی شدید تھی اور لگتا تھا کہ جیل کے آس پاس ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوطرفہ فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ عمران اور بھرت بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جیل پر حملہ ہوا ہے۔''

''ایسے ہی لگت ہے۔'' بھرت بولا۔

ہم فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں کو بغور سنتے رہے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ نعروں کی مدھم گونج بھی سنائی دینے لگی۔ ''یہ تو لگتا ہے کہ جیل کے احاطے میں لڑائی ہو رہی ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''اور لڑنے والے کافی زیادہ تعداد میں ہیں۔'' عمران نے اضافہ کیا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ جیل پر ایک بڑا حملہ ہوا ہے اور کچھ لوگ جیل توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہنگامہ شدت اختیار کرتا گیا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بارود کی تیز بو ہماری بند کوٹھڑی تک پہنچ رہی تھی۔ یوں لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ جارج کی جیل پر مارے جانے والا یہ زبردست شب خون کامیاب

ہو جاتا اور ہم اپنی کوٹھڑی کے دروازے کو اپنے سامنے کھلا پاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے ذہن تیزی سے سوچ رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد محسوس ہونے لگا کہ لڑائی ہماری کوٹھڑیوں کے آس پاس ہی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جیل کا دفاع کرنے والے بھی جم کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی کسی انگریز افسر کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا اور ''کالے باغیوں'' کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ دو تین ایسے دھماکے بھی سنائی دیئے جو دستی بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے۔ عمران نے کہا۔ ''شاید راکٹ لانچر ہے۔''

یہ فیصلہ کن معرکہ آٹھ دس منٹ جاری رہا، یکا یک صورتِ حال پلٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے فاصلے پر چلی گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے جیل پر حملہ کرنے والے پسپا ہو رہے ہیں۔ غالباً جیل کی چھت پر سے بھی گارڈز نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ مزید یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہم اس بند کوٹھڑی میں صرف اندازے ہی لگا سکتے تھے۔ ہماری کوٹھڑی کے عین سامنے بھی گارڈز کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کی آوازوں سے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں مزید فاصلے پر چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ انتظامیہ کے مسلح لوگ، بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے گاڈرز کا جمگھٹا ہوا۔ کوٹھڑیوں کے دروازے کھلنے لگے اور پکڑے جانے والے لوگوں کو گالیوں کی بوچھاڑوں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی کھلا اور ایک زخمی قیدی کو بیدردی سے دھکا دے کر کوٹھڑی میں گندے فرش پر پھینک دیا گیا۔ میں نے انگریز افسر منیارڈ کو دیکھا، اس نے نفرت سے قیدی پر تھوکا اور اسے ''کالے ذلیل......سوئر'' کے خطابات دیئے۔

وزنی دروازے کو ایک بار پھر دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ زخمی کا ایک بازو کلائی پر سے ٹوٹ چکا تھا اور عجیب انداز میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی زخم تھا اور اس زخم سے بہنے والے خون نے اس کے پورے چہرے کو لتھڑا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا...... ''انور خاں تم؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

انور خاں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس کھینچ کھینچ کر سانس لیتا رہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہاں کسی رائفل کی سنگین یا کوئی اور تیز دھار چیز لگی

تھی۔

عمران نے بھی سن لیا تھا کہ میں نے زخمی کو کس نام سے پکارا ہے۔ وہ بھی جلدی سے پاس آ گیا۔ چوبی دروازے کا چوکور خانہ کھلا۔ ایک مقامی گارڈ نے ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا ہماری طرف پھینکا اور پھنکارا۔ ''اس کی مرہم پٹی کر دو۔''

چرمی تھیلے میں مرہم پٹی کا سامان تھا لیکن یہ انور خاں کے زخموں کے لئے کافی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے چُور...... بے بسی کی تصویر بنا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی، ابراہیم نامی شخص انور خاں کے حوالے سے کتنے جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ انور خاں زرگاں کے لئے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انور خاں کی قیادت میں حکم کے باغی زرگاں میں تہلکہ مچانے والے ہیں۔ وہ بہت جلد سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔ اس حوالے سے اس بے چارے نے بڑے جوش سے چاند کی سات تاریخ اور بدھ کا ذکر بھی کیا تھا۔

لیکن یہ توقعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ بے شک انور اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھایا۔ وہ جارج کی جیل توڑنے کے لئے بڑی قوت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اور اس ناکامی سے بھی بڑھ کر مایوس کن بات یہ تھی کہ انور خاں خود بھی شدید زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس کے زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے آخری وقت تک کوشش کی ہے کہ اسے زندہ نہ پکڑا جا سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

''انور خاں...... آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو...... میں تابش ہوں۔'' میں نے اس کے کندھوں کو ہلایا۔

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یوں اس نے مجھے سمجھایا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔

اس نے خشک، خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ عمران اور بھرت اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی کلائی کی حالت بھی تشویشناک تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''...... مجھے ختم کر دو...... یہ لوگ مجھے...... بہت بری موت مارنا چاہتے ہیں......''

عمران نے عجیب گونجتے سے لہجے میں کہا۔ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے انور خاں...... تم حوصلہ رکھو۔''

انور خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔ میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوست ہے اپنا...... پاکستان سے آیا ہے......''

انور خاں کی خون آلود آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر عمران کے ہاتھ پر رکھا اور ایک بار پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں...... آخری فتح ہماری ہو گی۔ ان گوروں کو ہمارا راجواڑہ چھوڑنا ہو گا۔ لوگ جاگ پڑے ہیں...... وہ قربانیاں دے رہے ہیں......''

زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انور خاں پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ اسے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہئے تھا مگر وہ یہاں ہمارے درمیان اس تاریک سرد کوٹھڑی میں موجود تھا۔ ہم کئی گھنٹے تک اس کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اس کی حالت قدرے اچھی ہو گئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رات کو قریباً چار سو مسلح جاں بازوں نے جیل پر حملہ کیا تھا۔ ان کو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جانا تھا۔ یہ زبردست منصوبہ بندی تھی لیکن عین موقع پر ایک شخص نے دغا کیا اور بازی پلٹ دی۔ ہم نے انور خاں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون تھا مگر انور خاں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی۔

میں نے آج انور خاں کو کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ میں اس سے نل پانی کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر چوہان، کپتان اجے، عبدالرحیم اور شکنتلا وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مگر انور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے سکتا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ ڈاکٹر چوہان بھی یہاں زرگاں میں موجود ہے۔

سارا دن انور خاں کی حالت کبھی بگڑتی اور کبھی سنبھلتی رہی۔ اس کے سینے پر شدید اندرونی ضرب آئی تھی اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

شام کے وقت انور خاں سو گیا۔ عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھیں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''صحیح کہتے ہیں تابی! تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے قبضے، ان کی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا، آج ہم وہ سب کچھ یہاں اس بھانڈیل اسٹیٹ میں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماحول بھی وہی ہے۔ یہاں بندوقوں اور مشین گنوں کے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں بھی ہیں۔ یہاں بھی ان مٹھی بھر گوروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کر رکھا ہے اور اپنے لئے کٹھ پتلیاں ڈھونڈی ہوئی ہیں۔ اور ابھی انور خاں بتا رہا تھا کہ خیر سے میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس عمران کی باتیں سنتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بس خاموش رہنا چاہتا تھا۔

عمران بولا۔ ''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سمجھا تھا کہ حکم جی زرگاں کا حکمراں ہے اور انگریز اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں لیکن اب کھلا ہے کہ یہاں کے تو حکمراں ہی یہ انگریز ہیں۔ حکم جی کو ایک ڈمی کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ وہ شراب اور عورت کے نشے میں غرق رہتا ہے۔ عملی طور پر اس نے یہاں کی باگ ڈور سرجن اسٹیل اور اینڈرسن جیسی لوگوں کو تھما رکھی ہے۔''

رات کسی وقت زرگاں کے وسطی علاقے میں پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ پھر یہ فائرنگ اور بھی دو تین علاقوں تک پھیل گئی۔ ہم اس قبر نما کوٹھڑی میں بس آوازیں ہی سن سکتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ کے چوکور خلا کے ذریعے تھا۔ اس خلا میں سے ہمیں کھانا اور ضرورت کی دیگر اشیاء پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ اشیاء فراہم کرنے والے تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا ایک گہرا سانولا ہندو تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا لہجہ اور آواز مجھے پہچانی سی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کچھ دن پہلے میں نے کہیں سنی ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس بارے میں عمران سے پوچھا تو وہ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ بہرحال یہ آواز میرے ذہن میں کھٹکتی رہی۔

رات کو پھر سلطانہ کی موت کے دردناک مناظر نظروں کے سامنے گھومتے رہے۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہوتی رہیں کہ معصوم بالو اب کبھی اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کو کبھی پتا ہی نہیں چلے گا کہ ماں کا محبت بھرا لمس کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر میں موت کے اس گھیرے سے نکل کر واپس فتح پور کے مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہاں میرے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہاں سلطانہ کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ اس کے کپڑے، اس کے برتن، اس کے زیور...... اور وہ سب کچھ جو وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلطانہ کے قاتلوں کے ساتھ ساتھ کٹر انتہا پسند ہاشم رازی کا چہرہ بھی میری نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ بھی تو بالواسطہ سلطانہ کے قتل میں شریک رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جسم میں لاوا سا بہنے لگا۔

رات کسی وقت میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کا چوکور خانہ کھلا ہوا ہے۔ خانے کی اکلوتی سلاخ کی دوسری جانب وہی پکی رنگت والا پہرے دار موجود ہے اور عمران سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔

صبح میں نے دیکھا کہ انور خاں ہولے ہولے کراہ رہا ہے۔ اس کی چوٹوں میں شدید درد تھا۔ جب انور خاں جیسا فولادی بندہ کراہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ درد معمولی نہیں ہے۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک انگریز گارڈ کا ٹماٹر جیسا چہرہ چوکور خلا میں نظر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ شاید یہ اس فتح کا نشہ تھا جو ان کو ملی تھی یا مل رہی تھی۔ ''کیا تکلیف ہے؟'' وہ انگریزی میں بولا۔

''انور خاں کو بہت درد ہے۔''

''اس کا درد بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دم ختم۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔'' اس کے معنی خیز لہجے نے میرے ذہن میں اندیشوں کی بھرمار کر دی۔

کچھ اسی طرح کی دھمکی ان گارڈز نے اس وقت دی تھی جب زخمی ابراہیم کو گولی سے اڑانے کے لئے اس کوٹھڑی سے لے جایا گیا تھا۔

تو کیا اب انور خاں کی باری آنے والی ہے؟ میں نے بے حد کرب سے سوچا۔

اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہم اب بھی تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آٹھ بجے کے قریب مسلح گارڈز آ گئے۔ میں سمجھا کہ وہ انور خاں کو لے جانے آئے ہیں لیکن انہوں نے پہلے بھرت کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور تیوروں سے پتا چلتا تھا کہ اگر ہم حکم عدولی کریں گے تو وہ ہمیں اندر ہی بھون سکتے ہیں یا اس بری طرح زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ رہیں۔ وہ لوگ بھرت کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ پھر ہم سب کو باری باری باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پشت پر رسیوں سے باندھ دیئے گئے۔ ہمارے اردگرد درجنوں رائفلوں کا پہرا تھا۔ یہاں کسی بھی طرح کی مزاحمت خودکشی کے مترادف تھی۔ انور خاں کو سب سے آخر میں ایک اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ بھی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور تیور خطرناک۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ میں بارونداجیکی کی یہ تاریخی کوٹھڑی آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

ہمیں برہنہ پا اور برہنہ سر چند تنگ راہداریوں سے گزارا گیا اور پھر ہم صحن میں آ گئے۔ ہماری آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں۔ آج ہم پورے چار دن بعد سورج کی روشنی دیکھ رہے

تھے۔ جارج کی اس بدنام زمانہ جیل کے در و دیوار میں اس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکا تھا جب مجھے سلطانہ کے ہمراہ پکڑ کر زرگاں لایا گیا تھا اور پھر میری خدمات جارج گورا کے حوالے کی گئی تھیں۔ لیکن آج جارج گورا تھا اور نہ سلطانہ۔

گارڈز کے نہایت سخت پہرے، میں ہم جیل کے پھاٹک سے باہر آئے اور یہی وقت تھا جب ہمیں زرگاں کی اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔ یہ سب کچھ تعجب خیز تھا۔ جیل کی بیرونی دیوار اور پھاٹک وغیرہ گولیوں سے چھلنی تھے۔ یقیناً یہ نشانیاں اس زبردست شب خون کی تھیں جو دو دن پہلے باغیوں کی طرف سے مارا گیا تھا اور جو بقول انور خاں ایک غدار کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ ہم نے اپنے اردگرد درختوں پر کچھ لاشیں لٹکتی دیکھیں۔ ان لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، ہم نے زرگاں کے لرزہ خیز منظر دیکھے۔ ایک چوراہے میں کئی جلی ہوئی لاشیں ایک چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ کچھ منہدم اور ادھ جلے مکان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں اور مختلف پولوں سے لٹکتی ہوئی لاشیں جا بجا دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے، کچھ کے چہرے مسخ تھے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

''لگتا ہے کہ بغاوت پوری طرح کچل دی گئی ہے۔'' میرے پہلو میں چلتے ہوئے عمران نے سرگوشی کی۔ ہم آخری قطار میں تھے۔ ہر قیدی کے عقب میں ایک مسلح گارڈ تھا جس نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم جیل سے نکلنے والے قریباً چالیس قیدی تھے۔ تین قیدی اسٹریچرز پر تھے۔ ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔ بھرت بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ اچھا ہونے نہیں جا رہا۔ میم کی عزت لوٹنے کے جرم میں وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا مگر یہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جب ہمارا قافلہ ایک کشادہ سڑک پر مڑا تو بھرت نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے زیرِلب کہا۔ ''ہم قاسمیہ کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ یہاں مسلمان آبادی ہے بلکہ یہ زرگاں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔''

اردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سہمے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ ہر طرف ہراس کی فضا تھی۔ ہم نے ایک چھوٹا سا محلّہ دیکھا جو پورے کا پورا جلا ہوا تھا۔ یہاں نمائش کے لئے ایک سر بریدہ لاش چوراہے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ جب ہم اس علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک فوجی گاڑی ہمارے قافلے کے پیچھے پیچھے چل

پڑی۔ میں نے اور بھرت نے مڑ کر دیکھا۔ اس گاڑی میں منحوس تھوبڑے والا اینڈرسن موجود تھا۔ تاہم ایک شخص اینڈرسن سے بھی اہم اس گاڑی میں موجود تھا۔ وہ دراز قد سرجن اسٹیل تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اس نے اپنے سگے بھائی کے علاوہ اپنی بیوی بھی کھو دی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اندر بدلے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

بھرت کے پیچھے چلنے والے مقامی گارڈ نے اس کی گردن پر زوردار جھانپڑ رسید کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف آگے دیکھے۔

ہم پابجولاں چلتے رہے۔ چند منٹ بعد پیچھے آتی ہوئی گاڑی میں سے اینڈرسن کی کرخت آواز بلند ہوئی۔ وہ میگافون کے ذریعے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔

''یہ اسٹیٹ اور حکم جی کے مجرم ہیں۔ آج ان لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے عبرت ناک پنش منٹ دیئے جائیں گے۔ ہام تم کو دکھائیں گا کہ باغیوں کا انجام کیا ہوتا۔ دیکھو اور عبرت پکڑو۔''

اس نے یہ چند فقرے بار بار دہرائے۔ ایک چھوٹے چوراہے پر یہ قافلہ رک گیا۔ یہاں ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ اردگرد کی دیواروں پر انگریزوں اور حکم کے خلاف باغیانہ نعرے لکھے تھے۔ جنہیں بعد ازاں مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں آبادی گنجان تھی۔ اردگرد کے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اگر یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تو ان دو ڈھائی سو فوجیوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اینڈرسن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہی جگہ ہے جہاں سے پانچ دن پہلے تم لوگوں نے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اسی جگہ سے وہ آگ بھڑکا جس نے اسٹیٹ کے پُرامن لوگوں کا بہت زیادہ نقصان کیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگوں کا مرڈر ہوا۔ ہاں، یہی وہ جگہ ہے۔''

اینڈرسن نے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا۔ انہوں نے قیدیوں میں سے چند افراد چنے۔ رائفلوں کی سنگینوں کے ذریعے ان کے کپڑے چاک کر دیئے گئے اور انہیں زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ اینڈرسن چنگھاڑا۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں پُرامن شہری ڈاکٹر ولیم اور اس کی وائف کا کپڑا پھاڑا گیا اور ان کو مار مار بے ہوش کر دیا گیا۔ اگر تم لوگوں نے وہ سین دیکھا تھا تو آج یہ بھی دیکھو۔''

اوندھا لٹائے جانے والے چھ قیدیوں کو اس طرح بے بس کیا گیا کہ ان کے سر کے بال اور ٹخنے گارڈز نے اپنی گرفت میں لے لئے...... پھر ان پر چمڑے کے وزنی جوتوں کی بارش

کر دی گئی۔ وہ چلاتے رہے، چلاتے رہے۔ ان کی جلد سے خون رِسنے لگا۔ ان میں سے تین نیم بے ہوش اور تین مکمل بے ہوش ہو گئے۔ مکمل بے ہوش ہو جانے والوں کو بھی اسٹریچرز پر ڈال لیا گیا اور انہیں بغیر کوئی طبی امداد دیئے یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے نکل کر لوگ اس قافلے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ ان کی حیثیت صرف تماشائیوں کی تھی۔ مزاحمت تو دور کی بات ہے، وہ مسلح فوجیوں کے سائے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے بالے تھے۔

قیدیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ سب کو انجام دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سرسری سی عدالتی کارروائی، تین چار منٹ کا رسمی مکالمہ اور پھر سزائے موت۔ مجھے لگا کہ میں کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء میں کھڑا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کچل دی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگوں کو سرِ عام پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کے سر جدا کئے جا رہے ہیں۔ کمپنی کی حکومت نے ساڑھے تین سو سالہ مغلیہ دورِ حکومت کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے...... ہاں، یہ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کا برائے نام اقتدار ایک ہندو کے پاس تھا اور وہ ان گوروں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ 'تو کیا آج ہماری زندگیوں کو فل اسٹاپ لگنے والا ہے؟' میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچے۔ یہ قاسمیہ چوک تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی یہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے بعد اور بھی ہجوم ہو گیا۔ گھروں کی چھتوں اور گلیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جو کچھ یہاں ہونے جا رہا ہے، وہ انہیں خون کے آنسو رُلا رہا ہے مگر وہ اسے روکنے کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں بھی درختوں پر کٹی لاشیں لٹکی نظر آئیں۔ ابھی ان میں سے بو اٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ان بدنصیبوں کو کل رات کسی وقت پھانسی دی گئی تھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔

یہاں ہمیں ایک قطار میں دس سولیاں گڑی نظر آئیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر صاف ستھرے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں درجنوں انگریز صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لرزہ خیز تماشے کی ہوس تھی۔ اس جگہ چاروں طرف خاردار باڑ تھی۔

ہمیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ برہنہ کئے جانے والے چھ افراد میں سے تین تو اسٹریچرز پر تھے، باقی تین ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی نہیں تھی۔ سولیاں ہم سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر تھیں۔ دو ہٹے کٹے جلاد نما افراد یہاں موجود تھے۔ ایذا رسانی کے بیشتر آلات بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے دستے والے وزنی ہتھوڑے، چھوٹی ہتھوڑیاں، آہنی میخیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر اسحاق کی لرزہ خیز موت کے مناظر گھوم گئے۔ ہزاروں افراد کے سامنے اس ''جاں بہ لب'' کو میخوں کے ذریعے سولی پر ٹھونکا گیا اور پھر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیا گیا تھا۔

فوجی افسر منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم چالیس قیدیوں کی تین قطاروں میں سب سے آخری قطار میں تھے...... لیکن بھرت کو اب پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ قیدیوں والے چار اسٹریچرز بھی ایک طرف رکھے تھے۔ اسٹریچرز کی بیلٹس باندھ کر قیدیوں کو ہلنے جلنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انور خاں کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ میں مسلسل کچھ پڑھ رہا ہے۔ منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ بہرحال، تمہارے لئے ایک خبر اچھی ہے اور ایک بری۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھی خبر یہ ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ابھی سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری سزا ملتوی ہو گئی ہے۔''

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ ''اور بری خبر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سفاکی سے بولا۔ ''یہ سزا زیادہ دیر کے لئے ملتوی نہیں ہوئی۔ آدھے قیدیوں کو یہاں سزا دی جا رہی ہے۔ آدھے قیدیوں کو ڈیڑھ دو میل دور قاسمیہ کے دوسرے چوک میں دی جائے گی...... چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ تمہیں دو ڈھائی گھنٹے اور زندگی مل گئی ہے اور زندگی تو پھر زندگی ہی ہوتی ہے۔''

میں آزاد ہوتا تو شاید اس سفید سؤر پر پل پڑتا مگر میرے ہاتھ پشت پر بے انتہا سختی سے بندھے ہوئے تھے اور درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

منیارڈ نے بڑی ادا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اردگرد کا نظارہ تم کو کیسا لگ رہا ہے؟ دیکھو، یہ صرف دو ڈھائی سو سپاہی ہیں۔ انہوں نے اردگرد کے ہزاروں تماشائیوں کو ہپناٹائز کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اندر سے کھول رہے ہیں، ابل رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی ایسی جو ہپناٹائز ہو چکی ہیں۔ میرا

خیال ہے کہ تمہیں عزت مآب اسٹیل صاحب کی بہادری کی داد دینی چاہیئے۔ لوگ کہتے تھے کہ قاسمیہ چوک کے علاقے میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور قاسمیہ کے ان باغی قیدیوں کو ان کے عزیز و اقارب کے سامنے ہی کتے کی موت مارنے والے ہیں۔ ہے نا بہادری؟" منیارڈ نے ستائش طلب نظروں سے مجھے اور عمران کو دیکھا۔

"لیکن یہ نہتے لوگ ہیں۔" عمران نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "اتنے بھی نہتے نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہے ان کے پاس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس توپیں اور راکٹ لانچر بھی ہوں تو یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑائی ہتھیار سے نہیں یہاں سے ہوتی ہے...... یہاں سے۔" اس نے اپنے سینے کو بائیں طرف سے ٹھونکا۔ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "اسٹیل صاحب اور مسٹر اینڈرسن چاہتے تو یہاں بہت ساری نفری بھی لا سکتے تھے۔ یہاں کے ہر کالے کے سر پر ایک رائفل بردار کھڑا کر سکتے تھے لیکن وہ صرف دو کمپنیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سپاہی۔ اور تم ان ڈھائی سو سپاہیوں کی دہشت دیکھ رہے ہو۔ یہ اس سے آدھے بھی ہوتے تو نتیجہ یہی ہونا تھا۔ اب تو تمہیں یہ بات ماننی چاہیئے کہ ایک برٹش سپاہی ایک سو کالے جنگجوؤں پر بھاری ہے......"

منیارڈ صرف بڑ نہیں مار رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سیکڑوں تماشائی واقعی انسانوں کے بجائے بھیڑ بکریاں نظر آ رہے تھے۔ دور فاصلے پر چند ٹولیاں ضرور ایسی تھیں جو نعرے لگا رہی تھیں اور احتجاجی رویے کا اظہار کر رہی تھیں مگر باقی سب سکوت تھا۔

اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ ایک شاندار میز کے عقب میں مخملی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہلکی سنہری دھوپ میں ان کے چہرے پر کچھ اور بھی سرخ دکھائی دیتے تھے۔ انڈرسن اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر آیا اور ایک بار پھر میگافون کے ذریعے دہاڑا۔ "...... ہام دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ یہ تمہارے سامنے عبرت کا تصویر بنا وہ سب ڈرٹی لوگ کھڑا ہے جس نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ظلم کیا۔ پچھلے پانچ دن تک ان لوگوں نے اس شہر کو جہنم بنائے رکھا۔ یہ سب کا سب اپنے کرائمز کو تسلیم کر چکا ہے۔ حکم جی کے قانون میں ان کے لئے کوئی رعایت ناہیں اور نہ ہی ہام دیں گا۔ اب کہاں ہیں وہ موٹی گردنوں والے سرکردہ لوگ جنہوں نے ان کو بھڑکایا۔ ان میں سے بہت سا بھاگ چکا اور بہت سا چوہوں کی طرح انڈر گراؤنڈ ہے۔ یہ بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں رہنے والے، جھوٹے دغاباز، فریبی عیاش تم کو کچھ ناہیں دے سکتے۔ اسپرین کا ایک گولی، جنریٹر کا ایک پرزہ، رائفل کا ایک

راؤنڈ...... کچھ بھی ناہیں۔"

قوی ہیکل اینڈرسن کئی منٹ تک دہاڑتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "ہام ڈرنے والا ناہیں، لڑنے والا لوگ ہے۔ ہام کو اپنے بازو پر بھروسا ہے اور اسی لئے ہام یہاں موجود ہے۔ اگر کسی کو کسی بھی ٹائم اپنے دل کا ارمان نکالنا ہے تو ہام اس کے لئے تیار ہے۔"

اینڈرسن کی تقریر ختم ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی سرسری سماعت بھی نہیں ہو گی اور اگلے چند منٹ کے اندر کم از کم بیس قیدیوں کو مقامی طریقے کے مطابق سولی چڑھا دیا جائے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انور خاں اور بھرت بھی ان بیس افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ بھرت کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ آفیسر منیارڈ اس کے قریب ہی موجود تھا۔ بھرت نے دو تین بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گارڈز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ یقیناً وہ ان آخری لمحوں میں پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوگا۔ ان کو بتانا چاہتا ہوگا کہ وہ میم کرسٹی کو مارنے والوں میں نہیں بچانے والوں میں شامل تھا...... مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اب صفائی دہائی کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ کسی فریادی کی کسی فریاد پر اب کان نہیں دھرا جائے گا۔

اسی دوران میں میری نظر میڈم صفورا پر پڑی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے معزز مہمانوں کی آخری قطار میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اتنی دور سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صفورا میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں بیٹھ کر سفاکانہ طریقے سے سولیاں چڑھائے جانے کا منظر دیکھ سکے۔ یقیناً وہ صرف ہمیں دیکھنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ خونی تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔

عمران نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "میڈم کو اپنانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ آہ...... اب اس کو کبھی پتا نہیں چل سکے گا کہ میں اس پر کس طرح فدا تھا۔"

میں نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد سے میری طرح اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد تھوڑا سا چہکا تھا۔ ہم بے حد سنگین صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کیوں بولا تھا؟

میں نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "عمران! کیا آج پھر ہم دیکھتے رہ جائیں گے؟ ہم اسحاق کو نہ بچا سکے، کیا انور خاں اور بھرت کے لئے بھی

کچھ نہ کرسکیں گے؟''

''نہیں یار! اس دفعہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''کیسے ہو جائے گا؟''

''یار! جب تم چاہو گے تو ہو جائے گا۔ تم کوئی ایویں شیویں چیز ہو؟ تم نے یہاں کے شکتی دیوتا جارج گورا کو ناکوں چنے چبوائے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں اسے موت کے گھاٹ اتارا ہوا ہے۔ تم کوشش کرو گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم زور لگاؤ تو تمہارے ہاتھوں کو جکڑنے والی رسّی ٹوٹ جائے گی۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''یار! میں نے کبھی خبروں کے علاوہ جھوٹ بولا ہے؟ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہو سکتا ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

ہم دونوں پنجابی میں بات کر رہے تھے اور لہجہ بہت دھیما تھا۔ گارڈز کچھ فاصلے پر تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری بات نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ عمران کی اس بے وقت کی راگنی پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔ ''عمران!'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا اور بدلے ہوئے آہنگ میں بولا۔ ''یار! تمہارے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ تم اسے توڑ نہ سکو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اسے کمزور کر دیا گیا ہے۔ تمہارے پیچھے پیچھے چلنے والا گارڈ اسے کمزور کرتا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریزر بلیڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو رسّی کے بلوں پر چلاتا رہا ہے۔ اب یہ رسّی سات آٹھ جگہ سے کمزور پڑ چکی ہے۔ ہمارے پیچھے دیوار ہے اس لئے ہمارے بندھے ہوئے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آ رہے۔''

میں نے اپنے ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں...... ابھی زور نہیں لگانا۔ ابھی زور لگانے کا وقت نہیں آیا۔''

میں نے سرگوشی کی۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی...... اگر...... رسّی کمزور کی ہے تو کس نے کی ہے...... اور کیوں؟''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے پیچھے چلنے والے گارڈ نے کی ہے۔ اور کیوں کی ہے، اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔'' وہ عجیب کھوئے سے انداز میں بولا۔ میں اس کا اطمینان اور ٹھہراؤ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ اطمینان اور ٹھہراؤ میرے

اندر ایک بے نام امید جگا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چلو تم طویل جواب نہ دو، مختصر دے دو۔''

ہم بڑے عام سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ گارڈز نے ابھی تک ہمارا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

عمران بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''کہتے ہیں نا کہ چیونٹی بھی اپنی طاقت کے مطابق اپنا دفاع کرتی ہے۔ کچھ لوگ چیونٹیوں ہی کی طرح حقیر اور بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔ جب رنجیت پانڈے جیسے لوگ ان کی انا کے منہ پر تھپڑ مارتے ہیں تو وہ اندر سے بدل جاتے ہیں۔ وہ رہتے تو چیونٹی ہی ہیں لیکن یہ زہریلی چیونٹی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو گرا دیتی ہے......'' عمران کا لب ولہجہ معنی خیز تھا۔

عمران کی بات نے میرے اندر ایک چھناکا سا کیا۔ دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ پانڈے اور تھپڑ والی بات سے مجھے چند روز پہلے کا ایک منظر یاد آ گیا...... اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ ہماری کوٹھڑی پر پہرا دینے والے گہرے سانولے گارڈ کی آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ وہ آواز مجھے یوں ہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ جب ہم اٹھرا گاؤں میں کماد کے کھیت میں چھپے ہوئے تھے تو رات کی تاریکی میں رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمانڈو ایکشن کے لئے نکلا تھا۔ یہ لوگ سیوریج کی ایک پرانی پائپ لائن تک پہنچے تھے اور اسپتال میں گھسنے کے لئے اس پائپ لائن کے سرے پر سے مٹی ہٹائی تھی۔ پانڈے کی ہدایت پر اس کا ماتحت کدال چلا رہا تھا۔ کدال سیمنٹ کے پائپ سے ٹکرا گئی تھی اور آواز پیدا ہوئی تھی۔ پانڈے نے بھنا کر اس ماتحت کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ تھپڑ کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ پانڈے اور اس کے اس مزدور نما ماتحت کے درمیان جو مختصر مکالمہ ہوا تھا، اس میں یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ بھرائی ہوئی سی آواز والا ماتحت اس وقت ایک دیہاتی کے حلیے میں تھا اور دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔

ایک دم واقعات کی بہت سی کڑیاں مل گئیں۔ کوٹھڑی میں، میں نے دو تین بار اس سانولے ماتحت گارڈ کو عمران سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی کھچڑی پکی تھی۔ کوئی پلان بنا تھا۔ عمران نے دوبارہ تیز سرگوشی کی۔ ''میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ ابھی زور نہیں لگانا۔ جب وقت آئے گا، میں بتا دوں گا۔''

دوسری طرف اجتماعی سولیوں کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ورزشی جسم والے مقامی جلاد بالکل تیار تھے۔ ہزاروں کا مجمع مضطرب لیکن خاموش تھا۔

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''لیکن میرے پیچھے چلنے والا گارڈ تو کوئی اور تھا؟''

''وہ اس کا ساتھی ہے۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

اب مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ ساری صورتِ حال یاد آرہی تھی۔ جب ہم یہاں آرہے تھے، سب قیدیوں کے پیچھے ایک ایک گارڈ تھا اور ہر گارڈ نے اپنے قیدی کو باقاعدہ بازو سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے والے گارڈ نے بھی میری کلائی تھامی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں کی بندش کے ساتھ کچھ کیا جارہا ہے۔

''عمران! اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ یوں نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے نکل جائے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''بس تھوڑا سا انتظار...... تھوڑا سا...... کسی نے یہاں آنا ہے۔''

''کس نے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں...... لیکن وہ آئے گا ضرور۔''

''تم پھر پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ تمہیں سب پتا ہوگا۔''

''سب نہیں...... ہاں تھوڑا بہت پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب آئے گا تو سیدھا ان میز کرسیوں کی طرف جائے گا جہاں یہ گورے بیٹھے، انگور کی بیٹی سے کھیل رہے ہیں۔ ایک دم ہلچل مچ جائے گی...... اور یہی وقت ہوگا تمہارے زور لگانے کا۔ تم اپنی رسیاں توڑ دینا اور سیدھا سرجن اسٹیل کی طرف جانا۔''

''سرجن اسٹیل کی طرف؟ وہ تو وہاں بیٹھا ہے۔ ان آخری کرسیوں کی طرف۔''

''تب وہ وہاں نہیں ہوگا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ یہاں ہوگا، ہمارے سامنے۔ وہ ذلیل ان بیس بندوں کو اپنے ''دستِ مبارک'' سے سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی آنجہانی ماریا کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہے۔''

ایک تنومند گارڈ ہمارے قریب آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم دونوں لگاتار باتیں کر رہے ہو۔ چپ ہو جاؤ ورنہ پہلے تمہاری باری آ جاوے گی۔''

میں اور عمران اس زہرناک وارننگ کے بعد خاموش ہو گئے۔ میڈم صفورا اب اپنی جگہ سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اب بھی کہیں پیچھے تماشائیوں میں موجود ہو۔ عمران کا کہا درست ثابت ہوا۔ دراز قد سرجن اسٹیل اپنی جگہ سے اٹھا اور گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا چبوترے پر آ گیا۔ سولیاں اب بالکل تیار تھیں۔ قطار میں کھڑے پہلے قیدی کا رنگ بالکل سفید ہو چکا

تھا۔ یقیناً پہلی باری اسی کی تھی۔ اسٹریچرز پر لیٹے قیدیوں کو بھی چبوترے پر چڑھا دیا گیا۔ ان میں انور خاں بھی تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ہمارے لئے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا نہیں۔

اینڈرسن، منیارڈ اور دیگر معزز گورے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود تھے۔ وہ اس سفاکی کا نظارہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار و آمادہ تھے جو یہاں روا رکھی جانے والی تھی...... پہلے قیدیوں کو سولیوں سے باندھا جانا تھا۔ پھر ان کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں آہنی میخیں ٹھونکی جانی تھیں۔ پھر آہنی ہتھوڑے کی ضربوں سے ان کے جسم کی اہم ہڈیاں ٹوٹنی تھیں۔ آخر میں رائفل کی گولی یا خنجر کے وار سے ان کا قصہ تمام ہونا تھا۔

......اور وہ کون تھا جسے آنا تھا؟ جس کے آنے کی امید عمران کو تھی...... وہ کون ہو سکتا تھا؟ ڈاکٹر چوہان؟ کپتان اجے؟ چھوٹے سرکار کا کوئی جاں باز یا پھر اقبال جسے ہم فتح پور کے تہ خانے میں چھوڑ آئے تھے؟

......تین قیدیوں کو سولی سے باندھا جا چکا تھا۔ میری دھڑکن عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے بے حد اضطراب کے ساتھ عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں میں مجھے انتظار کرنے کو کہا...... دو تین منٹ مزید گزرے اور پھر وہی ہوا۔ آنے والا آ گیا۔ وہ کون تھا؟ میں نے اسے کافی فاصلے سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی ایک ڈھاٹے میں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کاٹھ، اس کی جسامت اور اس کے بھاگنے کے انداز سے پہچانا۔ اور یہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ میں اسے بھولا ہوا تھا...... شاید میں نے لاشعوری طور پر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں نظر آ سکتا ہے...... وہ طلال تھا۔ سلطانہ کا پندرہ سولہ سالہ بھانجا...... جو کسی رشتے سے اس کا بھتیجا بھی تھا...... کم گو، کم آمیز۔ بڑی بڑی بھید بھری آنکھوں والا۔ سلطانہ اس کے لئے خالہ تھی، ماں تھی اور بہن بھی۔ وہ اس سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں نے طلال کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ غور کیا تھا کہ جب فتح پور مندر کے تہ خانوں میں سلطانہ کی موت کی خبر پہنچے گی تو اس کے اس راجپوت بھانجے پر کیا گزرے گی۔ اور اب اچانک وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس کی آمد کا منظر قابلِ دید تھا۔ وہ اور اس کی برادری کے قریباً دس پندرہ افراد اچانک ہجوم میں سے نکلے تھے اور اندھا دھند ان نشستوں کی طرف دوڑے جہاں گورے صاحبان مے نوشی میں مصروف تھے۔ طلال سب سے آگے تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں چھوٹی نال

والی رائفل نظر آئی۔ وہ لگاتار فائر کرتا اور چلاتا ہوا سلطانہ کے قاتلوں اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ کے لئے جیسے درجنوں گارڈز سکتہ زدہ ہو گئے۔ پھر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کیں۔ دھماکوں سے فضا کچھ اور بھی لرز اٹھی۔ طلال کے چار پانچ ساتھی رستے میں ہی گر گئے لیکن باقی خاردار باڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ طلال کے پیچھے آنے والے شخص کے ہاتھ میں قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ خاردار باڑ کے گول چھلوں کے اوپر پھینکا، پلک جھپکتے میں طلال اپنے تین چار ساتھیوں سمیت اس تختے پر چڑھا اور خاردار رکاوٹ پار کر گیا۔ میں نے اس کی گولی سے سیکنڈ آفیسر منیارڈ کو زخمی ہوتے اور میز پر اوندھے گرتے دیکھا۔

سولیوں کے قریب کھڑے درجنوں گارڈز اپنے ''وی آئی پیز'' کو بچانے کے لئے چبوترے سے اترے اور خاردار تاروں کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے مجھے کہا۔ ''توڑ دو۔''

اور میں نے پشت پر بندھے ہاتھوں کی بندش توڑ دی۔ رسّی کے کئی بل تڑاخے سے ٹوٹے اور وہ میرے ہاتھوں سے علیحدہ ہو گئی۔ میں پوری رفتار سے دراز قد سرجن اسٹیل کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ بھی خاردار باڑ اور اس کے اندر موجود معززین کی طرف تھا۔ ایک گارڈ نے مجھ پر فائر کیا۔ گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں اپنے پورے زور سے اسٹیل پر جا پڑا۔ سلطانہ کی موت کے بعد جو آگ میرے اندر جمع ہوئی تھی، اسے ایک دم نکاسی کا راستہ ملا۔ وہ شعلہ جوالا بن گئی۔ آسمانی بجلی کا روپ دھار گئی۔ اسٹیل اور میں لڑھکتے ہوئے تین فٹ اونچے چبوترے سے نیچے گرے۔ تب تک اسٹیل کا چمکیلا پسٹل میرے قبضے میں آچکا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی زرافے جیسی لمبی لیکن مضبوط گردن سے لگا دیا...... اور اسے گھسیٹتا ہوا دیوار کے بالکل پاس لے گیا۔ کئی گارڈز نے رائفلیں میری طرف سیدھی کیں۔

''خبردار...... گولی مار دوں گا۔ اڑا دوں گا اسے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

گارڈز ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے لیکن اسی دوران میں بائیں طرف سے ایک گارڈز نے گولی چلا دی۔ یہ گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزری۔ میں نے بھی اپنی دھمکی سچ کر دی۔ میں نے تپتے پھڑکتے، زور لگاتے اسٹیل کی گردن میں گولی ٹھونک دی...... میرا دوسرا فائر اس کے نیچے جبڑے کو چیر کر یقیناً اس کے سر میں گھسا ہو گا۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں اس کے جسم کو ڈھال کی طرح استعمال کر کے پیچھے ہٹا اور پھر جست لگا کر ایک فوجی جیپ کے عقب میں گرا۔ یہ جگہ جوابی فائرنگ کے لئے بہترین تھی۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ سلیقے سے رکھی ہوئی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گورے بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے طلال کی ایک جھلک دیکھی۔ میرے سامنے اس نے زمین پر گرے ایک فربہ اندام انگریز کی توند میں تلوار گھونپی اور دستے تک اتار دی۔ پھر وہ نیچے جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب صورتِ حال نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لی۔ کچھ دیر پہلے تک یہ کروٹ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار کا وہ مجمع جسے انگریزوں اور مسلح گارڈز نے اپنی دہشت سے ہپناٹائز کر دیا تھا...... اس ''ٹرانس'' میں سے اچانک ہی نکل آیا۔ عمران کہتا تھا، جادو ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ زنجیریں ایسے ہی کسی اچانک واقعے کی حدت سے پگھل جاتی ہیں اور رکے ہوئے پانی ایسے ہی کسی ہلچل کے سبب بلند و بالا ڈیموں کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انگریزوں اور ان کے گارڈز کو تتر بتر دیکھ کر ایک دم مجمع حرکت میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ بالکل غیر مسلح نظر آتے تھے، اب ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، تلواریں اور ایسی ہی دیگر اشیاء نظر آئیں۔ وہ نعرہ زنی کرتے ہوئے کسی سیلاب کی طرح آگے بڑھے۔ گارڈز نے رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ دھماکے ہوئے، شعلے لپکے۔ لیکن ہجوم رکنے کے لئے نہیں بڑھا تھا۔ وہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں شاید توپیں بھی نصب ہوتیں تو ان دیوانے لوگوں کو روک نہ سکتیں۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے زخمی ہو کر بہت سے لوگ گرے لیکن وہ رکے نہیں۔ یہ بڑا کلاسیکل منظر تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے مجھے یوں لگا کہ میں پھر ڈیڑھ سو برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آزادی کی جنگ کا ایک ٹکڑا دیکھ رہا ہوں۔ لوگ للکارتے ہوئے خاردار تار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لئے یہ شعر کہا جاتا ہے۔ کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت......

اور پھر تصادم ہو گیا۔ زرگاں شہر کا قاسمیہ چوک میدانِ جنگ بن گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، عمران کے ہاتھ چند سیکنڈ پہلے اسی ''سیاہ رنگت اور روشن دل'' والے غریب گارڈ نے کھولے تھے جس نے میرے ساتھ مہربانی کرائی تھی۔

عمران لپکتا ہوا چبوترے پر چڑھا اور اس اسٹریچر تک پہنچا جس پر انور خاں دراز تھا۔ میں بھی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے انور کے اسٹریچر کو اٹھایا اور فائرنگ کی زد سے دور ایک بڑی ٹرک نما گاڑی کی اوٹ میں لے گئے۔ باقی چار اسٹریچرز پر موجود افراد گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ہم نے چھٹے اسٹریچر کو بھی محفوظ اوٹ میں پہنچا دیا۔ طلال

کے کچھ ساتھی چبوترے پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے ان تین قیدیوں کی رسیاں کاٹ دی تھیں جنہیں سولیوں سے باندھا جا چکا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص راہی عدم ہو گیا تھا لیکن باقی دو سلامت تھے۔

میری نگاہیں صرف اور صرف سلطانہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ان سے اپنی سلطانہ کا بدلہ نہ لے سکا تو اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ رنجیت پانڈے، منیارڈ اور اینڈرسن میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہاں موجود تھے۔ مجھے پتا تھا، وہ موجود ہیں۔ میں نے ماؤزر نما پسٹل پر گرفت مضبوط کی اور خاردار تاروں کی طرف بڑھا۔ یہ ساری جگہ دوطرفہ فائرنگ کی زد میں تھی۔

عمران نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے روکا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی؟''

''نہیں، مجھے جانے دو عمران...... مجھے مر جانے دو یا مار دینے دو۔''

''حوصلہ کرو...... سب کچھ ہو گا۔''

''اب نہیں ہو گا تو کب ہو گا؟'' میں نے خود کو عمران سے چھڑایا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب عمران نے دیکھا کہ میں رکوں گا نہیں تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں دیوانہ وار ان پوزیشنوں میں گھس گئے جہاں سے انگریز اور مقامی گارڈز ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے کم از کم چار گارڈز کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔ یہاں ہماری دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ عمران نے بے دریغ ایک گورے سپاہی کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی اور میں نے ایک مقامی گارڈ کے پیٹ میں گولی مار کر اس کی رائفل چھین لی۔ اور تب ہمیں منیارڈ نظر آیا...... اس کا ایک کندھا طلال کی گولی سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ شاید چند سیکنڈ پہلے تک وہ اپنے بچے کھچے گارڈز کو یہ ہدایات دے رہا تھا کہ گولیوں کی بارش کر دو۔ ان لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دو۔ لیکن وہ بھول رہا تھا کہ ہر جگہ جلیانوالہ باغ نہیں ہوتا اور نہ ہر جگہ جنرل ڈائر کے ظلم کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے عمران سے سنگین چڑھی رائفل لی اور اپنی رائفل اسے دے دی۔ یہی وقت تھا جب منیارڈ نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہی شخص تھا جس نے سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لئے گورے کمانڈوز کو آنکھ کا قاتل اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ کو ہی نشانہ بنایا۔ نکیلی سنگین قوت کے ساتھ اس کی آنکھ سے ٹکرائی اور وہ سب کچھ تباہ کر گئی جو اس کی آنکھ کے پیچھے اور کھوپڑی کے اندر موجود تھا۔ شاید میں کچھ زور اور لگاتا تو سنگین کھوپڑی توڑ کر دوسری طرف سے باہر آ جاتی۔ منیارڈ کی دوسری آنکھ اور چہرے کے تاثرات بڑے بھیانک

تھے۔

ایک انگریز رائفل مین نے قریبی گلی کے اندر سے عمران کو نشانہ بنایا۔ عمران کی بے مثال لک کہاں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں بھی کام کیا۔ گولی سیدھی عمران کو لگتی مگر راستے میں عمران کی رائفل آ گئی۔ گولی اس کے دستے سے ٹکرائی تھی۔ عمران نے مہارت سے جوابی فائر کر کے رائفل مین کو ڈھیر کر دیا۔

اب یہ وقت تتر بتر ہونے کا تھا۔ چبوترے کے اردگرد اور میز کرسیوں والے احاطے میں تیس چالیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے بیس پچیس تو ضرور گارڈز کی ہوں گی۔ ان بیس پچیس میں کئی انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً دو سب سے اہم لاشیں سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی تھیں۔ اب کسی بھی وقت راج بھون سے کمک یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اگر کمک پہنچ جاتی تو راہِ فرار اختیار کرنے والے اور گلیوں میں روپوش ہونے والے سرکاری فوجی بھی واپس آ کر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ نہتے شہری کی کہاں تک مسلح فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

''بھرت کہاں ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے واپس اس گاڑی تک پہنچے جس کے عقب میں دونوں اسٹریچرز رکھے تھے۔ یہاں مسلح اور نیم مسلح شہریوں کا جمگھٹا تھا۔ ہم بھرت کے ساتھ ساتھ اس معرکے کے اصل ہیرو طلال کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ شہری فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے سرجن اسٹیل کی لاش کو گھسیٹنے کی کوشش بھی کی مگر عمران کے اشارے پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ جمع ہونے والے لوگ مجھے بے حد اہمیت دے رہے تھے۔ میں نے جارج، یہاں کے شکتی دیوتا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی میری پہچان تھی۔ کچھ لوگ وہ ٹوٹی ہوئی رسّی دیکھ رہے تھے جسے توڑنے کے بعد میں اسٹیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ یہ رسّی ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس رسّی کے ٹوٹنے میں مجھ سے زیادہ ایک ریزر بلیڈ کا کام ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مرکزِ نگاہ بن گیا۔ میرے گرد ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے میرے اور انور خاں کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ وہ میرے اور انور خاں کے حق میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرہ زنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو کہ وقت ضائع نہ

کریں۔ بہت جلد سرکاری فوجی پوری طاقت سے یہاں ہلا بولیں گے۔ لوگ اپنے دفاع اور بچاؤ کی تیاری کریں۔ گھروں اور محفوظ جگہوں پر مورچے بنالیں۔ خاص طور سے ان دو اہم راستوں کو روک لیں جو قاسمیہ میں داخل ہوتے ہیں...... یقیناً ان میں کچھ لیڈر ٹائپ بندے بھی ہوں گے۔ ان کے ذریعے فوری بندوبست کریں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب باتیں تم خود کیوں نہیں کہتے؟''

''نہیں یار! تمہاری بات کا اثر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں اہمیت دے رہے ہیں اور ٹھیک ہی دے رہے ہیں۔''

''لیکن......''

''لیکن شیکن کچھ نہیں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔'' اس نے ایک بندے سے میگافون لے کر میری طرف بڑھایا۔ یہ وہی خون آلود میگافون تھا جو ابھی ہم نے منیارڈ کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔

میں نے کبھی تقریر کی تھی اور نہ اس طرح لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ پھر بھی عمران کے کہنے پر میں چبوترے پر چڑھ گیا۔ دور تک پُرجوش لوگ نظر آرہے تھے۔ خاردار تاروں کے اردگرد کالے اور گورے فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ لاشوں پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ قاسمیہ کے نوجوان، فوجیوں کی بکھری ہوئی رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے میگافون ہونٹوں کے قریب کیا۔ یہی وقت تھا جب دو افراد مجمع چیرتے ہوئے آئے اور چبوترے پر آکر مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ ڈاکٹر چوہان اور عبدالرحیم تھے۔

چوہان کو میں نے بس اس کی آواز سے پہچانا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں جھول رہی تھیں۔ چوہان نے مجھے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا تھا، میں تمہیں ایک دن ضرور زندہ دیکھوں گا۔ مجھے پتا تھا۔''

عبدالرحیم بھی میرے گلے لگ گیا۔ عبدالرحیم ان قیدیوں میں سے تھا جو اسحاق اور انور خاں وغیرہ کے ساتھ ہمارے ہمراہ نل پانی پہنچے تھے۔ عبدالرحیم زرگاں کے اسی محلے میں رہتا تھا جہاں سلطانہ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ادھیڑ عمر عبدالرحیم ہچکیوں سے رونے لگا۔ ''سلطانہ بی بی چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ اس کی کوئی عمر تھی جانے کی۔''

عمران نے اسے بمشکل مجھ سے علیحدہ کیا۔ پھر میرے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''وقت کم ہے۔ جو کچھ کہا ہے جلدی سے اس کا اعلان کردو۔''

میں نے میگافون اپنے سامنے کیا اور بلند آواز سے وہ الفاظ دہرانے شروع کردیئے جو

عمران نے کہے تھے۔

لوگوں کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ تلواریں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے تک، ان لوگوں کو اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ مردہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ہی ان کے پیاروں کو بدترین طریقے سے مار کر اپنی ہیبت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے مگر اک ''پُرجوش واقعے'' نے انہیں زندہ کردیا تھا۔ ایک شخص نے فوجی جیپ کی چھت پر چڑھ کر حکم کے لئے مردہ باد کا نعرہ لگوایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کڑک کر بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم ان گوروں اور ان کے چمچوں کے لئے قاسیمہ کو قبرستان بنادیویں گے۔ ان کو اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت بھی ناہیں ہووے گی۔''

ایک اور شخص جیپ پر چڑھ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی انور خاں کا ایک قریبی ساتھی حسنات بھائی تھا۔ وہ دہاڑتی آواز میں بولا۔ ''تابش صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکٹھا ہونے کا فائدہ ناہیں۔ اپنے گھروں میں جاؤ۔ عورتوں اور بچوں کو پیچھے پرانے قلعے میں بھیج دو۔ ہر گھر کو مورچا بنالو۔ ہر گلی میں ان سفید سؤروں کے لئے موت کا ناکا لگادو۔ اب ہم پیچھے ناہیں ہٹ سکتے۔ اب ہمیں مرنا ہے یا ماردینا ہے۔''

عمران نے پھر مجھے بولنے کے لئے کہا۔ میں نے خون آلود میگافون اپنے سامنے کیا تو لوگ پھر ہمہ تن گوش ہوگئے۔ میں نے کہا۔ ''بھائیو! آج یہاں قاسمیہ چوک میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہلچل مچا دینی ہے۔ میں غائب کا علم نہیں جانتا اور نہ انور خاں جانتا ہے لیکن میں آپ سب کو وشواس دلاتا ہوں کہ اب ''نل پانی'' نے خاموش نہیں رہنا۔ اب وہاں سے سیلاب ضرور آئے گا اور یہ سیلاب ہمارے ساتھ مل کر ان گورے کالے حکمرانوں کو بہا کر لے جائے گا۔ راج بھون کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔ ہاں، اینٹ سے اینٹ بجے گی۔''

لوگوں کا جوش و خروش عجیب رنگ اختیار کر گیا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس وقت اس چبوترے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور راج بھون پر ہلا بول دیں تو وہ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عوام الناس کس طرح کسی کو اچانک بلند ترین درجے پر پہنچاتے ہیں اور پھر اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی لوگوں کو کسی انتہائی اقدام کی طرف لے جانے کا وقت نہیں آیا اور غالباً اسٹریچر پر لیٹے ہوئے انور خاں کی سوچ بھی یہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، وہ

سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

عمران کے اصرار پر سانولی رنگت والا گارڈ امر ناتھ بھی چبوترے پر آ گیا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس کو بھی چند لفظ بولنے کا موقع دو۔"

میں نے میگافون امر ناتھ کو تھمایا۔ وہ چند لمحے تک ہچکچایا پھر جذباتی انداز میں بولا۔

"ہمار کو جیادہ بولنا ناہیں آوت۔ اور نہ ہم نے جیادہ کچھ کہنا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ ہم سب نے مل کر ان جالموں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اب مرنا ہے یا مار دینا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر مجھے پرنام کیا۔ میگافون مجھے تھمایا اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

عمران کے اشارے پر میں نے لوگوں کو منتشر ہونے اور ہدایات پر عمل کرنے کا کہا...... لوگ منتشر ہونے لگے۔

○......❖......○

سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہم زرگاں کے پرانے قلعے میں تھے۔ یہ کافی قدیم عمارت تھی۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف سے گنجان آبادی نے گھیرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ یہ کھنڈر قلعہ اس راستے پر واقع تھا جو مشرقی سمت سے قاسمیہ میں داخل ہوتا تھا۔ چوہان، عبدالرحیم اور انور خاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انور خاں کی حالت میں بہتری واقع ہوئی تھی۔ وہ اب دھیمے لہجے میں بات بھی کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے بھرت بھی بچ بچا کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی محبوبہ چمپا عرف چمپی اور اس کی ماتا بھی تھی۔ چمپی کا یہاں آنا اس کے لئے خطرناک تھا مگر بھرت تو اسے کنوئیں میں کودنے کو کہتا تو بھی وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہ لگاتی۔ بہرحال دونوں ماں بیٹی اوڑھنیوں میں لپٹی بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ قاسمیہ چوک میں لڑائی شروع ہوتے ہی بھرت نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک قریبی گلی میں رُوپوش ہو گیا تھا۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کے ہاتھ کھولے تھے اور اسے گوروں سے بچانے کے لئے کئی گھنٹے ایک بیکری میں چھپائے رکھا تھا۔

سرکاری فوج نے ابھی تک قاسمیہ پر کسی طرح کی کارروائی نہیں کی تھی یقیناً انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہاں زبردست مزاحمت کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ ہر گھر نے ایک مورچے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب وہ بڑی احتیاط اور پوری طاقت کے ساتھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

بس چند گھنٹوں کے اندر ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر مزاحمت کاروں کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح جمع تھے۔ قاسمیہ چوک میں میرا جسّت لگا کر چبوترے سے اترنا

اور پھر سرجن اسٹیل پر جھپٹنا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہر کسی کی زبان پر تھا۔ میں نے اسٹیل کو اس کے اپنے ہی ماؤزر نما پسٹل سے قتل کیا تھا۔ یہ پسٹل ابھی تک میرے پاس تھا۔ لوگوں کے لئے یہ اسپیشل پسٹل بھی "زیارت" کی چیز بنا ہوا تھا۔ جارج کی عبرت ناک شکست کے بعد جو "ہوا" میرے سلسلے میں بندھی تھی۔ اب وہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ میرا اپنے ہاتھوں کی بندش کو توڑنا بھی لوگوں کے لئے زبردست حیرت اور تحریک کا باعث تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اس صورتِ حال کا اصل ہیرو عمران تھا یا پھر گارڈ امر ناتھ کا وہ ساتھی جس نے میری بندش کو بڑی صفائی سے قابلِ شکست بنایا تھا۔

میرے بعد اگر لوگ کسی کو تھوڑا بہت کریڈٹ دے رہے تھے تو وہ راجپوت نوجوانوں کا وہ جتھا تھا جس نے اچانک ہجوم میں سے نکل کر ہنگامے کا آغاز کیا۔ اس جتھے کے تقریباً چار نوجوان جاں بحق اور دو سخت زخمی ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر چوہان وغیرہ قلعے کے اندر ہی طبی امداد دے رہے تھے۔ جتھے کے باقی نوجوانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی تسلی ضرور ہوئی تھی کہ طلال مرنے والوں میں شامل نہیں۔

سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی موت نے میرے اندر بھڑکتی آگ پر پانی کے کچھ چھینٹے تو ڈالے تھے مگر اس کی حدت میں خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں میں ابھی تک سرجن اسٹیل کے خونچکاں جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔

یہ شخص تھا جس نے اپنی سائنسی مہارت سے بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکم کو کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتا تھا اور لوگ حکم کو بہت بڑا اوتار سمجھنے لگے تھے۔

عمران نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "جگر! آج تم نے سرجن صاحب کو ٹھنڈا کر کے اپنا بہت پرانا بدلہ چکا دیا ہے۔"

"کون سا بدلہ؟"

"الیکٹرانک چپ والا بدلہ۔ دراصل یہ چپ ہی تو تھی جس نے تمہیں برسوں اسٹیٹ کا قیدی بنائے رکھا ہے۔"

"لیکن حکم اور اینڈرسن ابھی زندہ ہیں عمران۔"

"یہ جو ایکشن سے بھرپور فلم شروع ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ مریں گے...... لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ ان فوت شدگان میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "کم از کم میں تو شامل ہو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

میری آنکھوں میں پھر سلطانہ کا غم جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ عمران کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں بھگوتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکایا۔ "دیکھو تابش! کون آیا ہے؟" یہ چوہان کی آواز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا اور پوتا ستیش کھڑے تھے۔ مالا کے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ وہ بہت کمزور اور خستہ حال نظر آتی تھی۔ مالا اور ستیش کو ہم نے آخری بار فتح پور کے مندر میں دیکھا تھا۔ ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ ستیش کے والد کے ہاتھ تیل کے کڑاہے میں جلے تھے اور پھر لوگوں نے اسے دوشی ٹھہرا کر قتل کر دیا تھا۔ مالا کی جان بھی بہ مشکل بچ پائی تھیں اس کے بعد سے مالا اور ستیش منظر سے یکسر اوجھل تھے۔

ستیش ایک نہایت کٹر اور انتہا پسند برہمن زادہ تھا لیکن جو اطلاعات ملی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ اب بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس کے بدلنے کی ایک وجہ تو یقیناً اس کی خوبرو اور روشن خیال پتنی مالا ہی تھی۔ دوسرے اس نے اپنے بزرگوں کا جو انتہائی دقیانوسی رویہ دیکھا تھا، اس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ستیش کا ایک بازو پلاسٹر میں جکڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سنگین اور بگڑی ہوئی چوٹ اسی مندر والے ہنگامے کی یادگار ہے۔ وہ بیمار اور کمزور بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور عمران نے ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ ان دونوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہمارا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہوگا۔ بہرحال، میرے دو چار فقروں نے ہی ان کے خدشات دور کر دیئے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ مالا اور ستیش ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو پچھلے ڈھائی تین ماہ میں پیش آئے تھے۔ سامبر مقابلے میں جارج کی عبرت ناک شکست اور موت کی تفصیلات بھی انہیں معلوم تھیں۔

مالا نے اشکبار لہجے میں مجھے بتایا۔ "ماتا جی ہماری جان کی دشمن ہو رہی ہیں، تابش بھیا۔ آپ کو پتا ہی ہووے گا، یہاں زرگاں میں ان کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے اشارے پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاوت ہیں۔ ماتا جی نے چند خطرناک لوگن کو ہمارے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ان لوگن کو حکم ہے کہ میں جہاں بھی ملوں، میری ہتھیا کر دی جاوے۔ میرے بچے اور ستیش کو پکڑ کر ان کے پاس لایا جاوے۔ ہم دو مہینوں سے جگہ

جگہ چھپتے پھر رہے ہیں۔"

عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد آپ دونوں کو کہیں چھپنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ دونوں یہاں قلعے میں آ گئے ہیں، یہ بڑا اچھا کیا ہے۔"

اس گفتگو میں مالا کے پتی ستیش نے بھی حصہ لیا۔ وہ اپنے سابقہ رویہ پر بڑا نادم تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ اس نے استھان میں سلطانہ کو زندہ جلانے کی کوشش میں حصہ لیا اور بعدازاں وہ گرو کی موت کا سبب بھی بنا۔ وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھ کو وشواس ناہیں ہوتا کہ دادی جی اس حد تک جا سکت ہیں۔ وہ میری پتنی اور میرے بچے کے جیون کی دشمن ہو رہی ہیں۔ ان کے ہرکارے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

یہ واقعی کٹرپن کی انتہا تھی۔ وہ بڑھیا کہنہ عقیدوں کی پجارن تھی۔ اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ پرانی نسل کے ایسے ہزاروں لوگ یہاں موجود تھے۔

اسی دوران میں انور خاں کے ساتھی حسنات احمد کے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ حکم کے فوجی دستے بڑی تعداد میں قاسمیہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کمان اینڈرسن صاحب خود کر رہے ہیں۔ وہ ایک بند فوجی جیپ میں سوار ہیں۔ اس جیپ کے علاوہ بھی درجنوں گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں اس کارروائی میں شریک ہیں۔

مخبر فیروز احمد نے کہا۔ "وہ لوگ اسپیکروں کے ذریعے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ علاقے کے لوگن اپنے گھر خالی کر کے پیچھے ہٹ جاویں ورنہ ان کو دشمن سمجھا جاوے گا اور اپنے انجام کے وہ خود ذمے دار ہوں گے۔"

حسنات احمد نے مجھ سے کہا۔ "اس وقت قاسمیہ کے لوگن اور زرگاں کے دوسرے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ان کے درمیان ہو دیں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاویں گے۔ وہ ایک دو دن تک تو ان حکم کے ٹٹوؤں کو قاسمیہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیویں گے۔"

میں عمران سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تنہائی کہیں نہیں تھی۔ پورا قلعہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں عمران کو لے کر ایک ڈیوڑھی میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل دماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "عمران! تم دیکھ رہے ہو، یہ لوگ مجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں جارج کو مار سکتا ہوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں تو پتا ہے یہ سب کچھ میرے بس کا روگ نہیں۔"

"کیا تمہارے بس کا روگ نہیں؟"

"یار! انجان نہ بنو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح کی مار دھاڑ کر سکتا ہوں اور کروا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کمانڈر وغیرہ بنانے کے چکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑیں اور میں ان کو لڑاؤں۔"

"تو یار! اس میں مشکل کیا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ...... تم یہ سمجھو کہ سب کچھ میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے، تم صرف آرڈر جاری کر رہے ہو۔"

"مگر......"

"یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہو جائے گا۔ اصل کام تو یہاں کے لوگوں کے جذبے اور حوصلے نے ہی کرنا ہے۔ بس ان کو تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ راہنمائی ہم کریں گے۔"

"ہم نہیں، تم کرو گے۔"

"چلو، میں ہی کروں گا۔ کیا ہم انور خاں کا اتنا ساتھ بھی نہیں دے سکتے؟ اب یوں کرو کہ قلعے سے باہر نکلتے ہیں۔ جیپ پر علاقے کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ میگا فون ساتھ لے لیتے ہیں راستے میں دو چار جگہ رک کر لوگوں کو حوصلہ دیں گے...... انہیں بتائیں گے کہ وہ جم کر اپنا دفاع کریں۔ کم از کم اتنی دیر تک ان گوروں اور کالوں کو روکیں جب تک نل پانی سے "اٹیک" نہیں آ جاتا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ نل پانی سے اٹیک آئے گا؟"

"ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سویرے قاسمیہ چوک میں ہزاروں کا مجمع تھا اور دو ڈھائی سو مسلح سپاہیوں نے انہیں بھیڑ بکری بنایا ہوا تھا۔ مگر جب طلال اور اس کے ساتھیوں نے ہلا بولا اور تم نے سرجن اسٹیل کی گردن دبوچی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا۔ یار یہ منظر ایسے ہی بدلتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب نل پانی چپ نہیں رہے گا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار دیکھ رہے ہیں کہ حکم مکمل طور پر ان گوروں کا کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ وہ اب آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ اب تک یہ لڑائی ٹلتی رہی ہے مگر اب نہیں ٹلے گی۔"

ہم نے گوروں سے چھینی ہوئی دو جیپوں پر قاسمیہ کے اندر ایک چکر لگایا۔ حسنات اور آٹھ دس مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اہم جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ عمران کے کہنے پر میں نے میگا فون کے ذریعے لوگوں کے جوش و جذبے کو ابھارا۔ ہر جگہ فلک شگاف نعروں سے فضا گونجی۔

ہم رات دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد گوروں اور حکم کے دستوں کی طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ یہ حملہ دو طرف سے تھا۔ حملے کی جگہ قلعے سے خاصی دور تھی۔ پھر بھی تابڑ توڑ فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے ہلچل مچ گئی...... ہمیں معلوم تھا کہ سرکاری دستوں کے لئے تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن ہو گا۔ دفاع کرنے والے گھروں میں مورچا بند تھے اور سرکاری سپاہیوں کو کھلی جگہ پر آگے بڑھنا تھا۔ حسنات اپنے دیگر اہم کمان داروں کے ساتھ دفاعی لائن پر موجود تھے۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کم از کم چوبیس گھنٹے تک سرکاری دستوں کو قاسمیہ کی گلیوں میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ "ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لڑائی والی جگہ پر موجود ہونا چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جانا مناسب ہے۔"

"تم نے ہر خطرے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"مجھے پتا تھا کہ تم یہ فقرہ ضرور بولو گے۔ لیکن ایک طرف تم مجھے مکمل ذمے داریاں سونپ رہے ہو، دوسری طرف میرے اختیارات میں مداخلت بھی کر رہے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔ یہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے۔ لیکن اگر یہ اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان کے درمیان ہو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ باقی جہاں تک لڑائی کی بات ہے، فی الحال میں نے لڑنا ہے اور نہ تم نے۔"

اس نے مجھے وہاں رہنے پر مجبور کیا اور خود چوہان، عبدالرحیم اور دیگر مسلح افراد کے ساتھ قلعے سے نکل گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے قائل کر لیتا تھا۔ اور مجھے ہی کیا، وہ ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ کر سکا...... تو شاید ایک لڑکی کو نہ کر سکا...... شبو کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ آزاد فضاؤں کا رخ کر لے۔ یا شاید اس نے اسے قائل کرنے کے لئے اپنا پورا زور لگایا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کی اپنی خواہش اور اندر سے پیدا ہونے والی رضا کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ بہر حال، اب یہ سب دور افتادہ ماضی کی باتیں تھیں۔

شدید لڑائی کی صورت حال قریباً ڈیڑھ گھنٹا رہی۔ پھر غیر متوقع طور پر ایک دم سکون ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد عمران اور چوہان وغیرہ قلعے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حکم کے وفاداروں کا پہلا بڑا حملہ روک دیا گیا ہے۔ ہاں، جنوبی راستے سے وہ لوگ قریباً ایک فرلانگ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے دو محلوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عمران کو کندھے پر

معمولی زخم بھی آیا تھا۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا تھا جو اس کے کندھے سے چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

عمران، چوہان اور میرے درمیان لڑائی کی صورتِ حال کے بارے میں بات ہوئی......عمران نے کہا۔ ”ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہئے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم اکیلے انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ہے کہ ہم انہیں کچھ دیر تک روک سکتے ہیں۔ اگر اس دوران میں نل پانی حرکت میں آ جاتا ہے تو پھر راج بھون کی باقاعدہ فوج کے ساتھ زوردار مقابلے کا ماحول بن سکتا ہے۔“

قرائن سے پتا چلتا تھا کہ اب سویرے تک کوئی نیا حملہ نہیں ہوگا۔ اس دوران میں قاسمیہ کے اندر گھس آنے والے دستے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائیں گے۔ اتفاقاً اس لڑائی میں دونوں فریقوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دونوں طرف سے صرف سات آٹھ افراد ہلاک اور دو درجن کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تعداد حکم اور اینڈرسن کے فوجیوں کی تھی۔

چوہان، حسنات، بھرت اور عبدالرحیم وغیرہ کو نگرانی کا کام دے کر میں اور عمران تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ کل کے ہنگامہ خیز دن کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ حسنات احمد نے قلعے کی دوسری منزل پر ایک محفوظ کمرا ہمارے لئے منتخب کیا تھا۔ یہاں ایک بڑا پلنگ تھا جس پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں انگیٹھی کی حرارت بھی موجود تھی۔ دور کہیں قلعے کی بیرونی دیوار کے پاس کسی کتے کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی کتا تو نہیں لیکن پھر اس ”فضول“ خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ہمیں لیٹے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کمرے کے قدیم طرز کے منقش چوبی دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ عمران نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف انور خاں کا ساتھی حسنات احمد تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید انور خاں کی طبیعت پھر خراب ہوگئی ہے لیکن یہ شک صحیح نہیں تھا۔ حسنات احمد سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرنے کے بعد عمران نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بے تابی سے دائیں بائیں دیکھا جیسے چھپنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ واقعی جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اپنے چھپنے کے لئے نہیں، میرے چھپنے کے لئے...... اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک قدِ آدم آبنوسی الماری کے پیچھے موجود خلا میں چھپا دیا۔ میں سرگوشیوں میں پوچھتا رہ گیا کہ کیا بات ہے مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی اہم معاملہ لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر

لے آیا۔ یہ ایک لمبی گرم چادر میں لپٹی ہوئی جواں سال عورت تھی۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے چادر سر سے سرکائی تو میں دنگ رہ گیا۔ گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی میں میرے سامنے گیتا مکھی کھڑی تھی۔ وہی لڑکیوں کی ڈانس انسٹرکٹر، پکی عمر لیکن چست جسم والی ”چلتی پرزی“۔ اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگا کہ وہ ہلکے سے نشے میں ہے۔ اس نے عجیب دل ربا انداز سے عمران کو دیکھا۔ گرم چادر اس کے شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔ جسمانی نشیب و فراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ عمران نے ذرا جھنجلاہٹ سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ عمران کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

”بیکار میں ناہیں آئی ہوں۔ بڑے کام کی خبر لائی ہوں۔ تمہارا من خوش ہو جاوے گا۔ تم کہو گے، مانگو گیتا آج کیا مانگتی ہو۔“

عمران نے کہا۔ ”گیتا! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ تمہیں سنائی دے رہا ہوگا، اب بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔“

”مجھے کیا بتا رہے ہو۔ جتنا زرگاں کے بارے میں، میں جانتی ہوں کوئی اور ناہیں جان سکتا۔ زرگاں گیتا مکھی سے ہے اور گیتا مکھی زرگاں سے ہے۔“ اس نے عجیب بے باکی سے کہا اور عمران کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی۔

یہ زرگاں کے شبستانوں کی رازداں وہی تیز طرار عورت تھی جو اس سے پہلے زرگاں سے ہماری واپسی کے وقت، عمران کے ساتھ ایک رومانی سین کر چکی تھی۔ یہ رومانی سین ان کوششوں کا عوضانہ تھا جو اس نے سلطانہ کے زیور ڈھونڈنے کے حوالے سے کی تھیں۔

......لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے باک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی چادر تھوڑی سی اور سرکائی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چادر کے نیچے اس نے دو حصوں پر مشتمل مختصر ترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمران کو کندھوں سے تھاما اور جذباتی انداز میں اس کا گال چوم لیا۔ عمران بھنا گیا۔ اسے ذرا دھکیل کر بولا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میں شرم کی اتنی کمی ہو سکتی ہے۔“

وہ نشیلے انداز میں بولی۔ ”اپنوں سے شرم ناہیں ہوتی۔ شاید تم میری گستاخی پر ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن اگر یہ گستاخی ہے بھی تو سوچو کہ کیوں ہے؟ کوئی تو ایسی بات ہووے گی جس کی وجہ سے تمہاری اس بندی کو اتنی جرأت ہو رہی ہے۔“

عمران نے غور سے اسے دیکھا اور تاڑ لیا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھ کر بولا۔ ”گیتا! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بات بتاؤ۔“

”بات کی قیمت؟“ وہ صرف دو تین انچ کے فاصلے سے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے بولی۔

''کیا قیمت؟''

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ عمران نے جیکٹ اور قمیص اتاری ہوئی تھیں اس نے عجیب جذباتی انداز میں اس کے کندھے کی خونی خراش پر اپنے احمریں ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ کسی جونک کی طرح اس کے کندھے سے رسنے والا خون چوس رہی تھی۔ عمران نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔ ''یہ کیا حرکت ہے گیتا؟''

''یہ پریم ہے عمران...... اور پریم کی کئی قسمیں ہووت ہیں۔ کچھ پریم بلیدان دیتے ہیں، کچھ نہیں دیتے۔ ایسے پریموں میں ایک ہاتھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ لیا جاتا ہے۔''

''تم کیا دینا چاہتی ہو؟''

''میں تمہیں بھانڈیل اسٹیٹ کی تقدیر بتانا چاہت ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسی جانکاری دینا چاہت ہوں جو اس لڑائی کا نقشہ بدل دیوے گی۔''

''کیس جانکاری؟''

وہ نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''سب کچھ بتادوں گی تو پھر مجھ بے چاری کے پاس کیا رہ جاوے گا۔ چلو تمہیں تھوڑا سا بتادیوت ہوں۔ تل پانی سے آنے والی بڑی بی جسے اب لوگن ماتا جی کہنے لگے ہیں، اس سارے کھیل میں ترپ کے پتے جیسی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس بڑی بی نے اب سے تھوڑے سے پہلے قاسمیہ کے علاقے اور قلعے پر زوردار حملے کے لئے ایک شبھ گھڑی بھی نکالی ہے۔ یہی کارن ہے کہ ہندو فوجیوں کے مشورے سے گوروں نے ابھی لڑائی روک دی ہے۔ لیکن اس بڑی بی کے حوالے سے اگلی بات بہت زیادہ خاص ہے......''

''کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''قیمت؟'' گیتا مکھی نے عمران کو خمار آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

○......❖......○

وہ سراپا دعوت عمران کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ دے...... ایک ہاتھ لے کی عملی تفسیر نظر آتی تھی۔ وہ عمران کو ''ہونے والی لڑائی'' کے حوالے سے کوئی خاص الخاص بات بتانا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی اس ''انفارمیشن'' کے بدلے وہ عمران کی قربت کی خواہش رکھتی تھی...... عمران جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''گیتا! ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں۔ ایک ایک

منٹ قیمتی ہے۔ یہ ساری باتیں اور شرطیں پھر کسی اور وقت کے لئے رکھ چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ تم مجھے معلومات بھی دے دو اور وہ کسی کام کی بھی نہ رہیں۔''

یوں محسوس ہوا کہ عمران کی بات کسی حد تک گیتا کے دل کو لگی ہے۔ اس نے ذرا ٹھٹک کر عمران کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھریں۔ بہر حال، وہ اتنی جلدی مکمل ہار ماننے والی عورت نہیں تھی اس نے بل کھا کر عمران کی گردن میں بازو ڈالے۔ اس کے کنگنوں کی چھنکار کمرے میں گونجی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ عمران سے جڑی کھڑی تھی، بڑی ادا سے بولی۔ ''محبت اور جنگ دونوں بڑی خاص چیزیں ہیں عمران! ہم ایک کے لئے دوسری کو قربان تو نا ہیں کر سکتے۔''

''لیکن گیتا! جو کچھ تم چاہ رہی ہو، اس کے لئے ذہنی سکون اور اندر کی خوشی درکار ہے۔ ہم اس وقت بڑی آزمائش کی گھڑیوں سے گزر رہے ہیں۔ اس آزمائش کو اور زیادہ سخت مت کرو۔''

''میں نے کیا کہا ہے، بس تم سے تھوڑا سا سمے ہی تو مانگا ہے۔'' وہ نشیلے لہجے میں بولی۔

''یہ سمے ہی تو قیمتی ہے گیتا۔ میں رات تمہارے پہلو میں گزار دوں گا تو بہت سے کام بگڑ جائیں گے۔''

اس نے ایک طویل آہ بھری...... اور اپنے مؤقف پر ذرا ڈھیلی نظر آنے لگی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ''چلو کچھ دیر ہی سہی...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی وچن بھی تو دو۔''

''کیا وچن؟''

وہ مسکرائی۔ ''یہی کہ جب تمہاری یہ آزمائش ختم ہو جاوے گی تو اپنے ہزار برس کے جیون میں سے ایک رات اپنی دیوانی کے نام کرو گے۔''

''ٹھ...... ٹھیک ہے۔ وچن دیتا ہوں۔''

وہ عمران سے چمٹ گئی۔ اس نے اس کی گردن، چہرے اور ہونٹوں پر گرم بوسوں کی بارش کر دی۔ عمران نے بھی تھوڑی بہت جوابی کارروائی کی۔ وہ عمران کو دھکیلتی ہوئی بستر پر جا گری۔ اس کے لمبے ریشمی بال منتشر ہو گئے۔ عمران بڑے تحمل اور دانش مندی سے اسے اس کی حدود کے اندر رکھنے کی کامیاب رہا۔

دس پندرہ منٹ بعد گیتا کے جذبات کا چڑھا ہوا دریا کسی حد تک اتر گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں کہنیاں گاؤ تکیے پر ٹکا کر ٹیک لگائی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ ہرگز

نہیں جانتی تھی کہ اس خلوت گاہ میں ایک اور شخص بھی موجود ہے اور آبنوسی الماری کے عقب سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہے۔عمران کی سوالیہ نظریں گیتا مکھی پر تھیں۔ دور کہیں قاسمیہ کی کسی گلی میں فائرنگ ہو رہی تھی اور یہ گونجتی ہوئی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔

گیتا مکھی نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔''اس بڑی بی کی چوتھی پشت اس راجواڑے کے ایک راجا، راہول جگجیت رائے سے ملتی ہے۔جگجیت رائے کے زمانے میں راجواڑے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کافی لڑائیاں ہوئی تھیں۔اس وقت بھی قاسمیہ کے مسلمان اس قلعے کی دیوار گرانے اور اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔کہا جاوت ہے کہ اس لڑائی میں دونوں طرف کے کم از کم چار ہزار لوگن مارے گئے تھے۔اس لڑائی کے بعد راجا جگجیت رائے نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اگر پھر کبھی اسی طرح کی صورتِ حال بن جاوے اور مسلمان قلعے کے اندر بند ہو جاویں تو ان کو باہر نکالنے میں آسانی ہووے۔کچھ لوگن کا خیال ہے کہ راجا نے اس وقت کوئی ایسا زمین دوز راستہ بنایا تھا جس کو استعمال کر کے قلعے کے اندر داخل ہوا جا سکے۔لیکن یہ بات سچ ناہیں ہے۔قلعے کے اندر گھسنے کا کوئی خفیہ راستہ ناہیں ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے گیتا داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

عمران نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے برا سا منہ بنایا اور بولا۔''لیکن تمہاری اس اہم جانکاری سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟''

گیتا نے جھٹ سے عمران کے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔''ابھی میری بات مکمل ناہیں ہوئی۔لیکن جتنی بات میں نے تم کو بتائی ہے، اس کی تعریف تو کرو۔''

''چلو ٹھیک ہے......تعریف کرتا ہوں۔''

''ناہیں، منہ زبانی تعریف مجھے ناہیں چاہئے۔'' وہ اس کے گلے لگ کر بولی۔

چار و ناچار عمران نے اسے چوما، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''بڑی بی جسے اب بہت سے لوگن بڑی روانی سے بڑی ماتا جی کا خطاب دے رہے ہیں، ایک بڑا خاص الخاص انکشاف سامنے لائی ہے۔یہاں زرگاں میں بڑی بی کی ایک بڑی پرانی آبائی حویلی ہے۔اس حویلی میں کچھ جدی کاغذات پڑے ہوئے تھے۔یہ کاغذات بڑی بی نے حکم جی کو پیش کئے ہیں۔ان سے پتا چلا ہے کہ وہ پرانی بات کچھ ایسی غلط بھی ناہیں تھی جو اس قلعے کے حوالے سے کہی جاوت ہے۔اس قلعے میں ایک بڑی خامی ہے......اور راجا رائے کے دور میں یہ خامی جان بوجھ کر رکھی گئی تھی......تاکہ اگر کسی آنے والے سمے میں مسلمان اس قلعے میں قلعہ بند

ہوں تو ان پر حملہ کیا جا سکے......''

عمران کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات ابھرے اور اس کی توجہ بڑھ گئی۔گیتا، عمران کی اس کیفیت سے محظوظ ہوئی۔وہ نیم دراز ہو گئی اور اس کی گود میں سر ٹکا کر بولی۔''تمہارا کیا خیال ہے عمران! وہ خامی کا ہووے گی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

وہ اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔''یہ وہی خامی ہے جو سات پردوں میں چھپی ہوئی اکیلی ناری کے اندر ہووت ہے۔اس خامی کو سات پردوں کی وجہ سے دور ناہیں رکھا جا سکتا۔یہ خامی تو ناری کے اندر ہی ہووت ہے۔وہ اوپر سے چاہے بڑی مضبوط نظر آوت ہو لیکن اس میں چھپی ہوئی کمزوری اسے مضبوط ناہیں رہنے دیتی۔''

عمران نے کہا۔''تمہارا فلسفہ سمجھنے میں مجھے تھوڑی دیر لگے گی......اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔''عمران! قلعے کی فصیل پرانی ہونے کے باوجود بہت مضبوط ہے لیکن ایک جگہ ایسی ہے جہاں یہ فصیل بالکل مضبوط ناہیں ہے۔وہ دیکھنے میں مکمل فصیل نظر آوت ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔شاید ایک بڑا فوجی ٹرک بھی اس سے ٹکرا جاوے تو وہ گر سکتی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ہے عمران۔اور میں تمہیں اس کا مکمل ثبوت دے سکت ہوں......فصیل کا وہ حصہ دراصل کبھی ایک بڑا دروازہ ہوا کرت تھا۔راجا رائے کے زمانے میں وہ دروازہ گرا دیا گیا اور وہاں پر بھی فصیل بنا دی گئی۔مگر فصیل کا یہ ٹکڑا اندر سے بالکل کھوکھلا بنایا گیا ہے۔سمجھو کہ نانک چندی اینٹوں کی دو عام سی دیواریں ہیں جن کے درمیان آٹھ دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔یہ سارا کام راتوں کے اندھیرے میں بڑی رازداری سے کیا گیا ہووے گا۔ہو سکتا ہے کہ جن کاریگروں نے یہ کام کیا ہو، ان کو ویسے ہی جان سے مار دیا گیا ہو یا پھر قید میں ڈال دیا گیا ہو۔بہرحال، فصیل کا یہ کھوکھلا ٹکڑا ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے اور بڑی ماتا نے یہ حقیقت اپنے جدی کاغذوں کے ذریعے حکم جی وغیرہ پر کھول دی ہے۔''

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔یقیناً عمران کی کیفیت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔گیتا کا انکشاف اگر درست تھا تو بڑا خطرناک تھا۔ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو کسی جنگل میں کسی درندے سے بچنے کے لئے درخت پر چڑھ جائے اور اچانک اسے پتا چلے کہ وہ جس

درخت پر چڑھا ہے، وہ جڑوں کے بغیر ہے اور زمین بوس ہو رہا ہے۔

"وہ جگہ کون سی ہے؟" عمران نے گیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو، سب کچھ مجھ سے چھین رہے ہو اور اس کا صلہ بھی کوئی نہیں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"پلیز گیتا...... پلیز۔ ہم بڑی نازک سچویشن سے گزر رہے ہیں۔ اور جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ سچ ہے تو پھر سچویشن اور نازک ہو جاتی ہے۔"

"وہ تو میں بھی اچھی طرح جانت ہوں۔" اس نے عمران کے ہونٹوں پر انگلی چلا کر کہا۔ "یہ بات تو طے ہے کہ کل سویرے قاسمیہ کے لوگن برٹش فوجیوں اور حکم کے سپاہیوں کا حملہ زیادہ دیر نا ہیں روک سکیں گے۔ ہو سکت ہے کہ وہ دس بارہ گھنٹوں کے اندر ہی چاروں طرف سے پسپا ہو کر قلعے کے اندر آ جائیں اور دروازے بند کر دیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار عورتیں اور بچے تو اب بھی قلعے میں موجود ہیں۔ پھر یہاں موجود لوگن کی تعداد کئی ہزار تک ہو جاوے گی۔ ان سارے لوگن کے جیون اسی صورت میں بچے رہ سکیں گے جب یہ قلعہ ان کی رکھشا کرے گا۔ اگر قلعہ رکھشا نہ کر سکا تو بڑی جلدی سب کچھ ختم ہو جاوے گا۔"

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، بالکل درست تھا۔ عمران کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ گیتا کی بات کے وزن کو پوری طرح محسوس کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"گیتا! اٹھو...... مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔"

"لیکن پہلے اپنے وچن کی تصدیق تو کرو۔"

"کیا کروں؟"

"اپنے دستخط کر دو۔"

"کہاں؟"

"یہاں۔" اس نے اپنے بالائی جسم کو بے لباس کر دیا اور کوئی مارکر نما شے عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران سٹپٹایا ہوا نظر آیا مگر وہ بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈھلتی جوانی والی طرار گیتا مکھی شاید آج اپنا ہر مطالبہ پورا کرانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران نے اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ بھی پورا کیا اور پھر اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ گیتا مکھی نے خود کو سرتاپا گرم چادر سے ڈھانپا اور عمران کے پہلو میں چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سیاہ چادر میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عام لوگوں کے لئے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ کون ہے۔

اب میرا وہاں رکنا بھی بیکار تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکل کر ان کے پیچھے گیا۔ قلعے کے

طویل برآمدوں اور وسیع و عریض احاطوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بے شمار مشعلیں اور گیس کے ہنڈولے قرب و جوار کو روشن کر رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوف ہراس کے ساتھ ساتھ جوش و خروش کے آثار بھی تھے۔ عمران اور گیتا مکھی درمیانی احاطے سے گزر کر فصیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ میں نے رسماً عمران سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ عمران کو بھی معلوم تھا کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حسنات اور چوہان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ ہم قلعے کے مرکزی دروازے سے، فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے سو ڈیڑھ سو قدم شمال کی طرف آئے۔ یہاں پہنچ کر گیتا مکھی کچھ دیر تک قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہی اور وہ نشانیاں ڈھونڈتی رہی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھیں۔ آخر اس نے فصیل کے ایک حصے کو منتخب کیا۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ "یہاں سے اینٹیں نکال کر دیکھو۔"

حسنات کی ہدایت پر فوراً ہی دس بارہ افراد وہاں پہنچ گئے۔ ان کو کدالیں وغیرہ فراہم کر دی گئیں۔ فصیل پر کدالیں چلنا شروع ہوئیں۔ پہلی دو چار اینٹیں نکالنے میں دشواری ہوئی لیکن اس کے فوراً بعد اینٹیں گرنا شروع ہو گئیں۔ وہاں موجود تمام افراد کے چہرے تحیّر کی آماجگاہ بن گئے۔ فصیل کا یہ حصہ واقعی کھوکھلا تھا۔

یہ ایک تہلکہ خیز انکشاف تھا۔ حسنات کی ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد کدالیں اور ہتھوڑے وغیرہ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو شاید آدھ پون گھنٹے میں فصیل کا یہ ٹکڑا منہدم کر ڈالتے لیکن ہم نے آپس میں مشورے کے بعد انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ یہ فصیل جیسی بھی بری بھلی تھی لیکن اس کا کھڑا رہنا اس کے منہدم ہونے سے بہتر تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ فصیل کا یہ حصہ گرنے کی صورت میں دفاع کا متبادل انتظام موجود ہو۔ یہ انتظام کیا ہو؟ اور اسے جلد سے جلد کس طرح مکمل کیا جائے؟ یہ دونوں بڑے اہم سوال تھے۔ اس موقع پر ایک بار پھر عمران کے مشورے نے مجھے طاقت بخشی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ سب تمہاری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

"یار، تم نے مجھے بُری طرح پھنسا دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں ہے۔"

"کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ جو شخص جارج گورا کو ہرا سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

لوگ تمہیں نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں یار۔ کچھ تو خیال کرو ان کے جذبات کا۔"

"میں نے گھونسا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دینی ہے۔" میں دھیمی آواز میں پھنکارا۔

"تمہیں گھونسا مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس آنکھ سے اشارہ کر دو۔ تمہارے یہ سیکڑوں پرستار میری ہڈیوں کا چورا کر ڈالیں گے۔ آخر کمان دار ہو تم۔ لیڈرشپ ہے تمہارے پاس۔"

"عمران...... یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ تھوڑی کھجا کر بولا۔ "دیکھو، بات میری ہو گی لیکن زبان تمہاری ہو گی۔ اس "ڈمی" فصیل کے پیچھے ہمیں ایک اور دفاعی لائن قائم کرنی پڑے گی۔ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوار وغیرہ تو بنائی نہیں جا سکتی۔ ہاں، ایک نیم گول خندق ضرور کھودی جا سکتی ہے......"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر فصیل کا کمزور حصہ ٹوٹ بھی جائے تو آگے خندق ہو؟"

"بالکل...... یہ بات جب تم کہو گے تو اس کا زیادہ اثر ہو گا۔ ابھی درجنوں لوگ کام پر لگ جائیں گے۔"

اگلے آدھے گھنٹے میں وہی ہوا جو عمران نے کہا تھا۔ میں نے حسنات اور مبارک علی وغیرہ سے مشورہ کیا اور وہی تجویز دی جو عمران نے میرے کان میں ڈالی تھی۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کدالوں اور کسیوں والے قریباً ڈھائی تین سو افراد جمع ہو گئے اور فصیل کے کمزور حصے کے سامنے نیم دائرے میں ستر فٹ لمبی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ کام حیران کن تیزی سے بس پانچ چھ گھنٹے کے اندر ہی مکمل ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب تین گھڑسوار بڑی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے احاطے میں پہنچے۔ وہیں سے ان کی نظر مجھ پر اور حسنات وغیرہ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا ہماری طرف آئے۔ ان میں انور خاں کا ایک اور قریبی ساتھی مبارک علی تھا۔ اس کے علاوہ امرناتھ اور ایک دوسرا شخص تھا۔ وہ باہر سے کوئی اہم خبر لے کر آئے تھے۔

"کیا بات ہے مبارک؟" حسنات نے دریافت کیا۔

مبارک بولا۔ "قاسمیہ کے داخلی دروازے کے پاس بہت بڑا ہجوم ہو گیا ہے۔ وہاں ایک بہت خاص خبر آپ لوگن کا انتظار کر رہی ہے۔"

"کیسی خبر؟" میں نے پوچھا۔

مبارک نے میری طرف دیکھا اور مؤدب انداز میں کہا۔ "وہاں ایک چوبارے پر ہم

نے بڑا پکا مورچا بنا رکھا ہے۔ ابھی پہلے پہر کو جو حملہ ہوا تھا، اس کا مقابلہ اس مورچے کے اندر سے بہت ڈٹ کر کیا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑی دوربین چوبارے کی سب سے اونچی جگہ پر لگائی گئی ہے۔ اس دوربین کے ذریعے ہم کو ایک بڑی خاص جانکاری ملی ہے جی۔ ہم نے اس بڑھیا کو دیکھ لیا ہے جسے لوگن بڑی ماتا کہہ رہے ہیں اور اس کو دیوی کا درجہ دے رہے ہیں۔"

"کہاں ہے بڑھیا؟" میں نے پوچھا۔

"دھرم شالا کے تالاب کے اندر جو اونچا مینارہ ہے اس پر چڑھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص قسم کی پوجا پاٹ کر رہی ہے۔ دو اور پجارنیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے حسنات احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہاں قاسمیہ کے ساتھ ہی ہندو آبادی میں ایک بڑا دھرم شالا ہے۔ دھرم شالا کے تالاب کے اندر ایک چوکور مینارہ ہے۔ اس کو ناگ مینارہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اردگرد پتھر کا ایک بڑا سانپ لپٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پرانے وقتوں سے پنڈت اور پجاری وغیرہ خاص چلّے کاٹنے کے لئے یا خاص قسم کی پوجا پاٹ کے لئے اس پر چڑھتے ہیں۔"

یہ خبر واقعی اہم لگتی تھی۔ اگر کہیں سے واقعی بڑی بی نظر آ رہی تھی تو پھر ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک بند جیپ میں سوار مبارک علی کے ساتھ جا رہے تھے۔ مبارک علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جیپ میں میرے ساتھ حسنات احمد، عمران اور بھرت تھے۔ ہم قاسمیہ کی مختلف گلیوں سے گزرے۔ جگہ جگہ مورچے نظر آ رہے تھے۔ جو مورچے کھلی جگہوں پر تھے، ان کو ریت کی بوریوں اور اینٹوں وغیرہ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ مسلح افراد ہر طرف گشت کر رہے تھے۔ خوراک سے بھرے ہوئے بہت سے چھکڑے قلعے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ انتظام اس لئے تھا کہ اگر قلعے میں محصور ہونا پڑے تو دشواری پیش نہ آئے۔

جلد ہی ہم قاسمیہ کے داخلی راستے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ہم ایک زیادہ تنگ گلی میں مڑے۔ پھر اپنی سواریوں سے اترے اور بیس تیس قدم فاصلہ طے کر کے ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ اردگرد سیکڑوں افراد جمع تھے۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا اور فلک شگاف نعرے لگائے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک چار منزلہ چوبارے کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ چوبارے کی ساری منزلوں پر مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ وہ بے حد پُرجوش نظر آتے تھے۔ انگریزوں اور حکم کے ہرکاروں کے خلاف زبردست نعرہ زنی کر رہے تھے۔ یہاں مجھے ایک

چونکا دینے والا منظر بھی نظر آیا۔ ایک راہداری میں ایک انگریز کی برہنہ لاش کو الٹا لٹکایا گیا تھا۔ غالباً یہ شخص کل صبح ہونے والے معرکے میں مرا تھا یا پکڑا گیا تھا۔ لاش کے جسم پر تشدد کے بہت سے نشان تھے۔ یقیناً یہ لاش اس سفاکی کا ردِعمل تھی جو "تہذیب یافتہ گوروں" کی طرف سے پچھلے پانچ چھ دنوں میں یہاں روا رکھی گئی تھی۔ جیل سے قاسمیہ کی طرف آتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے درجنوں افراد کی درختوں سے جھولتی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان بدنصیبوں کو ٹکم اور اینڈرسن کے جوانوں نے سرعام پھانسیاں دی تھیں اور لاشیں چیل کوؤں کے لئے چھوڑ رکھی تھیں۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم چوبارے کی چھت پر پہنچ گئے۔ اب صبح صادق کا اجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس چوبارے کے اردگرد چاروں طرف لاتعداد لوگ گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں نظر آ رہے تھے۔ رائفلیں لہرا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ چوبارے کی چھت پر قاسمیہ کے سرکردہ افراد اور جنگجو موجود تھے۔ ایک تین فٹ لمبی ٹیلی اسکوپ ایک اسٹینڈ پر رکھی گئی تھی اور اس کے اردگرد ہجوم تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم نے راستہ دیا۔ میں اور عمران، حسنات احمد کے ساتھ ٹیلی اسکوپ پر پہنچے۔ سب سے پہلے مجھے ہی مطلوبہ منظر دکھایا گیا۔ منظر واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ٹیلی اسکوپ کو بڑی خوبی سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک مینار پر فوکس کیا گیا تھا۔ مینار کے بالائی سرے پر برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہون منت رہی ہوگی۔ غور سے دیکھنے پر بڑی بی کی شبیہہ نظر آتی تھی وہ آلتی پالتی مارے شاید فرش پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر ایک سیاہ بکرے یا بکری کا کٹا ہوا سر جھول رہا تھا۔ خاصی سردی میں بھی بڑی بی کے جسم پر فقط سفید سوتی ساڑھی ہی دکھائی دیتی تھیں تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کے کندھوں پر کوئی شال قسم کی چیز بھی ہے۔ درمیانی عمر کی دو اور عورتیں بھی بڑی بی کے ساتھ تھیں۔

"آپ لوگ بھی دیکھو۔" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے عمران اور حسنات وغرہ کو دعوت دی۔

باری باری سب نے یہ منظر دیکھا۔ آخر میں پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ بڑی بی دوسری طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے کندھوں پر پھونک مارنے کے لئے اپنی گردن گھماتی تو اس کا چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ اچانک شور اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قاسمیہ کے کچھ مکین آپس میں ہی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ تین چار باریش افراد کو لوگ بُری طرح مار

رہے تھے۔ انہیں غدار، دھوکے باز اور پتا نہیں کیا کیا قرار دے رہے تھے۔ دیگر افراد انہیں چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ "یہ کیا تماشا ہے؟ ختم کرو یہ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

شدید گرما گرمی میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی لیکن پھر بھی کھینچا تانی اور بدزبانی جاری رہی۔ حسنات اور مبارک وغیرہ نے آگے بڑھ کر یہ ہنگامہ بمشکل کنٹرول کیا۔ دو چار افراد اب بھی بری طرح گرج برس رہے تھے۔ "تم منافق ہو۔ تم غیروں سے ملے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگن کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔"

اس طرح کے فقرے چاروں طرف گونج رہے تھے۔ مار کھانے والے زخمی افراد کو موقع سے ہٹا لیا گیا۔ مارنے والے سیکڑوں کی تعداد میں تھے، وہ اور جوش و خروش سے نعرے لگانے لگے...... ان کے نعروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑی بی کو فوراً سے پہلے شوٹ کر دینے کے خواہشمند ہیں۔

حسنات مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے جھگڑے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ "ایک قبیلے کے لوگوں نے رائے دی ہے کہ بوڑھی عورت پر گولی نہ چلائی جاوے۔ یہ بدشگونی ہووے گی۔"

"بدشگونی سے کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا کہنا ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق جنگ میں کسی پر اس کی بے خبری میں پیچھے سے وار کرنا بالکل غلط ہے...... اور جس پر وار کیا جاوے، وہ ناری ہو اور عمر رسیدہ بھی ہو تو یہ اور بھی غلط ہے۔ بس اسی بات پر باقی لوگن غصے میں آ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی عام عورت ناہیں، یہ فساد کی جڑ ہے۔ یہ اس لڑائی میں بڑے بڑے فیصلے کر رہی ہے۔ یہ مرے گی تو دشمنوں کی کمر ٹوٹے گی۔ وہ اسے مارنے میں ذرا سی بھی دیری کرنا ناہیں چاہتے۔"

"ظاہر ہے ان حالات میں تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی دور نشانہ لگ بھی سکے گا؟" عمران نے کہا۔

"وہ دیکھیں جی، جہاں بہت سے لوگن جمع ہیں...... چھت کے اس کونے میں۔" مبارک علی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

عمران کے ساتھ ساتھ میں نے بھی دیکھا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ پھر مجھے ایک دور مار رائفل بھی نظر آئی۔ یہ کافی بڑی رائفل تھی۔ اس کے اوپر بھی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ کئی اہم جنگجو کمانڈر یہاں جمع تھے۔ حسنات احمد نے کہا۔ "یہ زرگاں کے تین چار بہترین نشانے باز

ہیں جی۔اڑتے پرندے پر سو فیصد ٹھیک نشانہ لگالیوت ہیں۔ مجھے یقین ہے، ان میں سے کوئی ایک بڑی بی کے کھوپڑے میں سوراخ کر لیوے گا۔"

چھت پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بالکل غیر متوقع طور پر ان کو ایک بڑی شاندار کامیابی ملنے والی ہے۔ اس ٹیلی اسکوپ نے اتفاقیہ طور پر ایک ایسا کام کر دکھایا تھا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماہر فلکیات اپنی ٹیلی اسکوپ سے آسمان کا طول و عرض ناپ رہا ہو اور اچانک ایک ایسا ستارہ اسے نظر آ جائے جس کی خبر پہلے کسی کو نہ ہو۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی حیران کن دریافت تھی۔ وہ بڑی بی جو زرگاں کے شعلوں پر تیل ڈالنے کا کام بڑی ہٹ دھرمی سے کر رہی تھی، اچانک ہی اس ٹیلی اسکوپ کے عدسوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، باریک نقوش اور تیکھی لمبی ناک والا ایک نشانے باز دور مار رائفل میں بلٹ ڈال رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہی شخص بڑھیا پر نشانہ لگانے والا ہے۔ سیکڑوں تماشائیوں کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ عمران نے میرا کندھا دبایا۔ ہم نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھے۔ حسنات احمد اور چوہان نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان ہماری روانگی کے بارے میں پوچھتا، عمران نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اردگرد موجود ہر شخص کا دھیان، دور مار رائفل اور نشانے باز کی طرف تھا۔ سانسیں جیسے رک گئی تھیں اور نگاہیں دھرم شالا کے دور افتادہ مینارے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ زینوں کی تاریکی میں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عمران کوئی خاص کام کرنا چاہ رہا ہے۔

"کچھ بتاؤ گے بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ آن ایئر ہونے سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کہا اور مجھے تقریباً کھینچتا ہوا نچلی منزل پر لے آیا۔ یہاں تاریکی تھی۔ کسی نے ہمیں پہچانا نہیں۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا اور کمرے کا دروازہ شتابی سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا یہاں بھی ایک کھڑکی کے پاس ایک لمبی رینج کی رائفل پڑی تھی۔ بہرحال، یہ اوپر والی رائفل سے کم طاقتور تھی۔ اس رائفل کو چلانے والا بھی غالباً بڑی بی کی ہلاکت کا منظر دیکھنے کے لئے بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔ عمران نے رائفل کو فوراً چیک کیا۔ اس میں دو بلٹس موجود تھیں۔ رائفل پر چھوٹے سائز کی ٹیلی اسکوپ بھی لگی ہوئی تھی۔

"بڑھیا کو مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اسے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ رائفل لوگوں کو زندہ کرنے کے لئے ہی تو ہوتی ہے...... یار...... کبھی کبھی کیسا احمقانہ سوال کرتے ہو تم۔"

"لیکن تمہیں پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اوپر بڑی گن سے فائر کرنے تو لگے ہیں وہ لوگ۔"

"میں نشانہ چوکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اگر نشانہ چوک گیا تو دو تین سیکنڈ میں بڑی بی غائب ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن ان لوگوں کے پاس بڑی گن ہے۔ حسنات بتا رہا ہے کہ وہ لوگ زرگاں کے بہترین نشانے باز ہیں۔"

"زرگاں اور لاہور میں بڑا فرق ہے۔ لاہور...... لاہور ہے۔ اور لاہور کا نشانے باز بھی، لاہور کا نشانے باز ہے۔"

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم شکار دیکھو، شکاری دیکھو اور نشانہ دیکھو۔"

وہ بڑے اعتماد سے رائفل کے سامنے جا بیٹھا۔ مینارہ اور اس کی بالائی روشنی یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی رات کی تاریکی بتدریج دن کے اجالے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "میں نشانہ لینے لگا ہوں۔ اگر دروازے پر دستک ہو بلکہ اگر کوئی دروازے کو اکھاڑ بھی دے تو تم نے دروازہ نہیں کھولنا ہے۔"

"عمران! دیکھ لو۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔"

"تمہیں پتا ہے، میں صرف نازک معاملوں کو ہی دیکھتا ہوں۔ نزاکت مجھے پسند ہی بڑی ہے۔ خاص طور سے اگر لڑکیوں اور ان کے معاملوں میں ہو تو......"

میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ جو کرنے جا رہا ہے، کر کے رہے گا۔ اسے دلیلیں دینا بیکار تھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک اور دوربین پر پڑ گئی۔ یہ کمرے کی ایک دیوار پر لگی کھونٹی سے جھول رہی تھی۔ میں نے یہ پیتل کی دوربین اتار کر آنکھوں سے لگا لی۔ عمران رائفل کے سامنے اوندھا لیٹ کر شست باندھ چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا۔ میں نے آج تک اس کا نشانہ خطا ہوتے نہیں دیکھا تھا...... مگر آج...... اس نے نشانہ خطا کیا۔ اور ایک نہیں دونوں نشانے خطا کئے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ بڑھیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی دونوں ساتھی عورتیں بھی اٹھیں۔ میں نے ان کے ہیولوں کو تیزی سے اوجھل ہوتے

دیکھا۔

''اوہ شٹ۔'' عمران نے دانت پیس کر رائفل پر مکا رسید کیا۔

پھر وہ مجھے لئے تیزی سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ہلچل تھی۔ اوپر تلے ہونے والے دو فائرز کی گرجدار آواز سن کر لوگ بالائی منزل کی طرف دوڑے جا رہے تھے، تاہم کچھ اوپر سے نیچے بھی آ رہے تھے۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔ تاریکی اور بھگدڑ میں کسی نے ہمیں کمرے میں داخل ہوتے یا نکلتے نہیں دیکھا۔ کم از کسی نے ہمیں پہچانا ہرگز نہیں۔ ہم بھی زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ یہاں دور مار رائفل کے قریب موجود چوٹی کے نشانے باز، بُری طرح آگ بگولا ہو رہے تھے۔ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی کسی اور نے گولی چلا دی ہے اور اس اچانک فائرنگ کے نتیجے میں ''شکار'' اوجھل ہو گیا ہے۔ لمبی ناک والا شخص زینوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ ''نیچے دیکھو۔ وہاں سے گولی چلائی ہے کسی حرامزادے نے۔''

چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے زینے اتر گئے۔ ''کیا ہوا حسنات؟'' عمران نے پوچھا۔

''گڑبڑ ہو گئی عمران بھائی۔ بڑھیا بچ گئی۔ لگتا ہے کہ ہم سے پہلے کسی اور نے گولی چلا دی۔ لیکن وہ اس خبیث کو لگی نہیں۔''

میں جب سے عمران کے ساتھ تھا، مجھے پہلی بار اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے جلد بازی ہوئی تھی۔ اس نے نسبتاً چھوٹی گن سے اور افراتفری میں نشانہ لیا تھا...... بہرحال، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ شاید اس میں کوئی بہتری ہو۔ ایک نشانے باز اب بھی بڑی گن کے پاس موجود تھا۔ اس گن کی دوربین بھی نسبتاً بڑی تھی۔ نشانے باز نے مسلسل دوربین سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ مگر اب توقع نہیں تھی کہ بڑھیا پھر نشانے پر آئے گی۔

چوبارے کے اندر اور ارد گرد موجود سیکڑوں لوگوں میں مایوسی کی لہر سی دوڑ گئی۔ تاہم کچھ لوگ امید ظاہر کر رہے تھے کہ شاید بڑھیا کو گولی لگ ہی گئی ہو۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور عمران اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ واپس قلعے میں آ گئے۔ فصیل کے کمزور حصے کے سامنے قوس کی شکل کی سرنگ تیزی سے کھودی جا رہی تھی۔ سیکڑوں مرد و زن اور بچے قلعے کے مختلف حصوں میں موجود تھے۔ وہ اپنی اپنی اہلیت کے مطابق مختلف کام انجام دے رہے تھے۔ کہیں ناشتا بنایا جا رہا تھا، کہیں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ دفاعی انتظامات میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام رہی تھیں۔ گیتا مکھی اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان سیکڑوں عورتوں کے درمیان

کہیں موجود تھی یا شاید واپس جا چکی تھی۔ میں اور عمران دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ پتا نہیں کیوں، مجھے عمران کی نشانے بازی پر مسلسل شک سا ہو رہا تھا...... میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''عمران! تم مجھے ہر وقت الجھن میں رکھتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری کون سی بات کو حقیقت سمجھوں اور کس کو جھوٹ؟''

''بھئی! میڈیا کا تو کام ہی الجھن میں رکھنا ہوتا ہے۔ ایک الجھن کے ختم ہونے سے پہلے دوسری الجھن شروع ہو جانی چاہئے۔ ورنہ ناظرین بھاگ جائیں گے اور اینکر بے چارے پکارتے رہ جائیں گے، جایئے گا نہیں...... جایئے گا نہیں۔'' وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں، میں نہیں بھاگوں گا۔ مگر مجھے سچ سچ بتایا کرو۔''

''ٹھیک ہے، آئندہ سچ بتایا کروں گا۔''

''یعنی تم بالواسطہ اعتراف کر رہے ہو کہ یہ سچ نہیں تھا۔ تم نے...... تم نے جان بوجھ کر بڑھیا کو بھگایا ہے؟''

''یار بھگایا تو جوان اور خوبصورت عورتوں کو جاتا ہے۔ بڑھیا کو بھگانے سے کیا فائدہ۔ کتنا بے ہودہ الزام لگا رہے ہو...... ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے بڑی بی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔''

''کیوں؟''

''یار! دشمن پر پیچھے سے وار کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور دشمن بھی اتنا پرانا، جتنا یہ قلعہ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بڑھیا ضرور بہادر شاہ ظفر کا حقہ تازہ کرتی رہی ہے...... یا کم از کم مہاتما گاندھی کی گرل فرینڈز میں شامل رہی ہے۔''

''تم پھر بکواس کر رہے ہو۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر دستک ہوئی اور پھر حسنات اور ڈاکٹر چوہان اندر آ گئے۔ حسنات کچھ دیر پہلے تک کافی افسردہ نظر آتا تھا مگر اب اس کی کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں انور بھائی سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ بڑھیا کا بچ جانا ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔''

''کس لحاظ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں، اس بڑھیا نے قاسمیہ پر بھرپور حملے کے لئے شبھ گھڑی نکالی ہوئی ہے۔ اس شبھ گھڑی کی وجہ سے ہی ابھی تک ہندو فوجی حملے سے رکے ہوئے ہیں۔ مجبوراً

گوروں کو بھی رکنا پڑا ہے۔ حالانکہ یہ گورے وقت ضائع کرنا نہیں چاہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اب تک ہم پر حملہ نہیں ہوا تو اس کی وجہ یہ بڑھیا ہی ہے۔ اگر یہ بڑھیا مر جاتی تو ہم پر ابھی حملہ ہو چکا ہوتا۔"

"یہ بات تو ہے۔" عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے معصوم صورت بنا رکھی تھی۔ کسی کو شک تک نہیں ہو سکتا تھا کہ بڑھیا کو بھگانے والا کام عمران نے کیا ہے اور اس طرح سے کیا ہے کہ اس کام سے اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا موقع نہیں مل سکا۔ حسنات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "انور بھائی کہتے ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ابھی دس بارہ گھنٹے تک ہم چاق و چوبند رہیں۔ امید ہے کہ آج رات تک ہمیں باہر سے زبردست کمک مل جائے گی۔"

"کمک سے تمہاری مراد گل پوش سے آنے والی مدد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل جناب! ہمارے مخبر بتا رہے ہیں کہ گل پوش سے کم و بیش چار ہزار سپاہی روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کی قیادت خود چھوٹے سرکار کر رہے ہیں۔"

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ بات بھی بالکل واضح سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہم پر آغاز جنگ جتنی دیر سے ہوگا، اتنا ہی ہمارے لئے بہتر ہوگا۔

○ - ❖ - ○

گورے اور کالے اتحادیوں کی طرف سے ہم پر حملے کا آغاز شام سے کچھ دیر بعد ہوا۔ یہ بھرپور حملہ تھا اور ہم سب اس حملے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ عمران نے مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں قلعے میں رہوں اور یہاں کے معاملات کو کنٹرول کروں۔ شیر دل، حسنات، چوہان اور مبارک علی کے ساتھ لڑائی کی جگہ پر تھا۔ قاسمیہ پر دو طرف سے حملہ کیا گیا تھا۔ لڑائی کی شدت سے در و دیوار لرزنے لگے اور قاسمیہ کے مختلف حصوں میں آگ بھڑکتی دکھائی دی۔

انور خاں کی حالت اب بہتر تھی۔ ہم دونوں قلعے کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ انور خاں بستر پر نیم دراز تھا اور گاہے بگاہے مجھ سے بات بھی کر رہا تھا۔ انور خاں نے عمران کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ خاص طور سے ایسے سنگین حالات میں عمران کا نرم انداز اور اس کا مطمئن انداز انور خاں کو بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دانش! تم نے پہلے کبھی اپنے اس دوست کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا یہ بھی پاکستان سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟"

"نہیں انور بھائی! یہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ میرا ایک دوسرا دوست اقبال بھی اس کے ساتھ ہے۔"

انور خاں نے کہا۔ "مجھے اس شخص کی آنکھوں میں ایک چمک نظر آتی ہے جو بڑے سے بڑے خطرات میں بھی بجھتی نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مرد میدان ہے۔ نہ صرف خود لڑ سکتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی لڑوا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "انور بھائی! سچ پوچھو تو میں نے یہاں ابھی تک جو فیصلے کئے ہیں، وہ اسی کے مشورے سے ہوئے ہیں۔ ظاہری طور پر میں کمان دار کا کردار ادا کر رہا ہوں لیکن اصل میں سب کچھ عمران ہی کر رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

انور خاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کراہتے ہوئے ذرا پہلو بدلا اور بولا۔ ”خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے تابش! تم نے یہاں زرگاں میں جو کچھ کیا ہے وہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ تم نے ایک دوبدو مقابلے میں اس شخص کو مات اور موت دی ہے جو خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے ایک بہت بڑا بت توڑا ہے۔ اس بت کے ٹوٹنے سے ہی لوگ زندہ ہوئے ہیں اور اپنا آپ منوانے کے لئے گلی کوچوں میں آئے ہیں......“

ہم باتیں کر رہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بتدریج پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ قیامت کا شور تھا جس میں گاہے بگاہے لرزہ خیز بارودی دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ قلعے کے طول و عرض میں پُر جوش مسلمان نوجوانوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے......

”شہادت یا موت۔“

انور خاں نے کہا۔ ”انسان حوصلہ نہ ہارے تو کچھ نہیں ہارتا۔“ پھر وہ تکیے سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ اینڈرسن اور حکم کے دستے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید وہ قاسمیہ کے درمیان تک پہنچ چکے ہیں۔“

انور بولا۔ ”یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہمارا آخری مورچا یہ قلعہ ہی ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم کتنی دیر تک اپنے حریفوں کو قاسمیہ کے گلی کوچوں میں روک سکتے ہیں۔ اس بارے میں تمہارا اندازہ کیا ہے؟“

میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر بغور اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے عام شہری اور نیم فوجی دستے ایک باقاعدہ فوج کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکتے تھے۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اب لڑائی قاسمیہ کے عین وسط میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”انور بھائی! لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمیں قلعے میں محصور ہونا پڑے گا۔“

”جو خندق تم کھدوا رہے ہو، اس کی پوزیشن کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”وہ جگہ مجھے یہاں سے نظر نہیں آ رہی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مکمل ہو چکی ہے۔“

”یہ اللہ کا خاص کرم ہوا ہے۔“ انور خاں بولا۔

”لیکن...... وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں فصیل کے کمزور حصے کے بارے میں بتایا؟“

”سچی بات یہ ہے انور بھائی کہ اس میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا کردار ہے۔ وہ عورت عمران کی کوئی جاننے والی تھی۔ اسی نے عمران کو یہ اطلاع دی تھی۔“

”تابش! اگر ہم یہ لڑائی جیتنے میں کامیاب ہو گئے تو اس میں اس ”اطلاع“ کا بھی بہت بڑا حصہ ہوگا۔“

زخمی انور خاں نے جو اگلا سوال مجھ سے کیا، اس نے ایک بار پھر مجھے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تابش! تمہارا بچہ ماں کے بغیر بے حال ہے۔ سلطانہ اب کہاں ہے؟“

میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایک ٹیس سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

میں نے کہا۔ ”انور بھائی! سلطانہ اب وہاں ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ شاید تمہیں پتا نہیں چل سکا۔ وہ زرگاں کے قبرستان میں سو رہی ہے۔“

انور خاں کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی سلطانہ کے آخری لمحات کا منظر گھومنے لگا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ رخساروں کے انار، آنکھوں کی روشنی کی طرح بجھتے چلے جا رہے تھے...... اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا......

خدا حافظ میرے شریکِ حیات۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی...... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں۔ اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی اور......

انور خاں کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ”یہ کب ہوا تابش...... اور کیسے؟“

میں نے مختصر الفاظ میں انور خاں کو وہ ساری دل فگار رُوداد سنا دی۔ سلطانہ اور آفتاب خاں کا گھیرے میں آنا۔ ہاشم رازی عرف ہاشو کی ہٹ دھرمی۔ رنجیت پانڈے کی عیاری...... اور پھر ماریا کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی موت...... میں نے سب کچھ انور کے گوش گزار کیا......

ہمارے ٹھکانے یعنی پرانے قلعے کے گرد لڑائی کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قاسمیہ کے گلی کوچوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور اینڈرسن کے سپاہیوں کے پاس ایل ایم جی...... اور ایم جی تھری ٹائپ کی گنز بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دستی بموں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی تواتر سے سنائی دے رہے تھے۔ مرکزی حصے میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی...... زخمی تیزی سے قلعے

میں آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان زخمیوں کی جگہ لینے کے لئے تازہ دم جوانوں کو باہر بھیجنا ضروری ہے۔ میں انور خاں سے اجازت لے کر نیچے چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے شمار مسلح افراد میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا جوش وخروش دیدنی تھا...... میں نے ایک کمان دار سے کہا کہ وہ فوری طور پر سو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ تیار کرے اور دفاع کرنے والوں کو کمک مہیا کرے۔

میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس ہدایت پر عمل ہو گیا۔ دو منٹ کے اندر ایک لہریئے دار جھنڈے کے نیچے ڈیڑھ دو سو جنگجو جمع ہو گئے اور پھر اپنے کمان دار کے عقب میں گھوڑے دوڑاتے قلعے سے باہر نکل گئے۔ جوں جوں لڑائی کی شدت بڑھ رہی تھی، عمران اور چوہان وغیرہ کی سلامتی کے حوالے سے میرے خدشے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب قلعے سے صرف نصف فرلانگ کی دوری پر کئی زوردار دھماکے ہوئے۔ بھڑکنے والے شعلوں کا نارنجی عکس اب قلعے کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ چند گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اندر داخل ہوئے۔ ان میں مبارک علی بھی شامل تھا۔ اس کا کندھا زخمی تھا اور خون اس کے سفید لباس کو تربتر کر رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”جناب! لڑائی قلعے کے سامنے ہو رہی ہے۔ حسنات بھائی اور ان کے قریباً ایک ہزار جاں نثاروں نے کہا ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ باقی سب لوگ اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر قلعے میں گھس جاویں اور دروازے بند کر لیویں۔ انہوں نے اس بارے میں آپ سے اجازت مانگی ہے......“

”عمران صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی اگلی صفوں میں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی ہے۔“ پھر مبارک علی نے اپنی خون آلود قمیص میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر بولا۔ ”عمران صاحب نے یہ رقعہ بھی بھیجا ہے آپ کے لئے۔“

میں نے جلدی سے رقعہ کھولا، اس پر بس ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ ”میری رائے ہے کہ باہر لڑنے والوں کو اب اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔“

میں نے مبارک علی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم لوگ موقع پر موجود ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب واپس آ جانا چاہئے اور دروازے بند کر لینے چاہئیں تو ایسا کر لو۔“

مبارک علی تعظیمی انداز میں سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے چاروں پانچوں ساتھی بھی واپس چلے گئے۔ میں بالائی منزل پر انور خاں کے پاس پہنچا تو وہ شدید زخمی ہونے کے

باوجود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مختلف دستہ سالاروں کو پوزیشن سنبھالنے کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔

......ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ پھر قلعے کے دو بڑے دروازے کھول دیئے گئے اور مزاحمت کرنے والے مسلح شہری اور جنگجو تیزی سے قلعے میں داخل ہونے لگے۔ ان میں لڑکے، کم عمر نوجوان یہاں تک کہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے لڑائی کی تربیت حاصل نہیں کر رکھی تھی، صرف اپنے جذبے اور حوصلے کی مدد سے انہوں نے کئی گھنٹوں تک حکم کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کیا تھا۔

پروگرام کے مطابق حسنات احمد اور اس کے جاں نثار ساتھیوں نے حملہ آور دستوں کو آخر وقت تک روکے رکھا یہاں تک کہ قلعے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

میں قلعے کی بالائی منزل سے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایسے مناظر کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ جیتی جاگتی حالت میں نگاہوں کے سامنے تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں، زخمیوں کی پکاریں، جگہ جگہ پڑی ہوئی لاشیں، بارود کی بو، دھواں اور شعلے۔ شاید میں ڈیڑھ سو سال پہلے کی دہلی میں تھا۔ انگریزوں اور سکھوں نے لال قلعے کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ تاجدار ہندوستان پر آخری ضرب لگانے کے لئے اور ہمیشہ سے تاراج ہونے والی دہلی کو پھر سے تاراج کرنے کے لئے وہ اپنی توپوں کو لوڈ کر رہے تھے اور اپنی سنگینوں کو چمکا رہے تھے۔ لیکن یہ دہلی نہیں تھا، یہ بھانڈیل اسٹیٹ تھی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مگر کیا تاریخ نے آخر تک خود کو دہرانا تھا؟

قلعے کے اندر واپس آنے والوں میں مجھے عمران نظر نہیں آیا۔ میری نگاہیں بے قراری سے اسے تلاش کرنے لگیں۔ آخر اس کی جھلک دکھائی دی اور میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ اور چوہان صحیح سلامت تھے۔ ایک گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ہونٹوں میں بڑے اسٹائل سے سگریٹ دبا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس نہایت سنگین صورتِ حال کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ عمران اور چوہان سیدھے میرے پاس آئے۔ دونوں کے چہرے دھوئیں اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ قلعے کے دروازے بند ہو جانے کے بعد لڑائی کچھ دیر کے لئے تھم گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے سے پہلے کمانڈر [illegible] صف بندی کر رہا ہے۔

[illegible] میں [illegible] نے حسنات احمد کو [illegible] دیکھ لیا۔ وہ بھی اپنے بیستر [illegible] ے

ساتھ بالکل آخری وقت میں قلع کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی......
عمران نے سگریٹ کا دھواں میری طرف چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹھیک ٹھیک بتانا...... میں اس وقت فرسٹ بلڈ کے ہیرو جان ریمبو کی طرح نہیں لگ رہا؟''

''لگ رہے ہو۔ لیکن فرسٹ بلڈ میں جان ریمبو زندہ بچ گیا تھا۔ یہاں ایسا سین نظر نہیں آ رہا۔''

''جگر! تمہاری سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ ہم یہ لڑائی جیتیں گے اور زندہ بھی رہیں گے...... نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ لاہور بھی پہنچیں گے...... نہ صرف لاہور پہنچیں گے بلکہ ہفتے کی کسی خوب صورت شام کو پی سی میں بوفے ڈنر بھی کریں گے...... اور نہ صرف ڈنر کریں گے بلکہ واپسی پر میں تمہیں رکشے میں بھی بٹھاؤں گا......''

''کیا مطلب؟''

''بھئی واپسی پر تم میرے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکو گے نا۔ میرے ساتھ تو ریما جی ہوں گی۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا میں دور تک جائیں گے واہ ہو ہو ہو...... جب ریما جی میرے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوں، موٹر سائیکل اڑی جا رہی ہو اور راستے میں اسپیڈ بریکر آ جائے...... تو تمہاری قسم مزہ ہی آ جاتا ہے۔ ایک بار تو شوٹنگ پر......''

یکا یک رائفل کا ایک برسٹ آیا۔ کھڑکی کے تختوں میں چھید ہو گئے اور ہماری عقبی دیوار سے بہت سا پرانا پلاستر اکھڑ کر فرش پر آ گرا۔

میں اور عمران بے ساختہ نیچے جھک گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر حسنات اور چوہان بھی موجود تھے۔ بہرحال، کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''تم جب بھی جھوٹ بولتے ہو اس طرح کا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔''

''میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔''

''لیکن کہنے تو لگے تھے۔''

''مجھے لگتا ہے اینڈرسن کے فوجیوں میں ضرور کوئی ریما جی کا عاشق موجود ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا اور اپنی گر جانے والی پی کیپ اٹھا کر پھر سر پر رکھ لی۔

لڑائی کی شدت میں واقع ہونے والی کمی صرف پانچ دس منٹ تک رہی۔ اس دوران میں ہم سب نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اچانک ہی اینڈرسن کی زیرکمان باقاعدہ فوج نے قلعے پر زبردست ہلا بول دیا۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ جدید ہتھیاروں سے لیس یہ دستے زبردست تربیت یافتہ تھے۔ وہ طوفان کی طرح قلعے کی طرف بڑھے۔ فصیل کے اوپر سے مسلمان سپاہیوں اور مسلح نوجوانوں نے ان پر زبردست فائرنگ اور خشت باری کی۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی اور جس کے بارے میں گیتا مکھی نے پیش گوئی کی تھی۔ اینڈرسن نے فصیل کے اسی کمزور حصے کو نشانہ بنایا جس کے سامنے ہم قوس نما خندق کھدوا چکے تھے۔ خندق سے نکلنے والی مٹی کنارے کے ساتھ ساتھ جما دی گئی تھی اور اس مٹی نے خندق کو اور بھی ناقابلِ عبور بنا دیا تھا۔

راکٹ لانچروں کے پے در پے دھماکے ہوئے۔ یہ بڑے سائز کے ڈیڑھ دو درجن راکٹ فصیل کے اسی کمزور حصے پر داغے گئے جو اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لئے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس جگہ سے فصیل میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے اور وہ مسمار ہو گئی۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ مسمار ہونے والی فصیل کے عین سامنے قلعے کے احاطے میں ہم نے ایک مضبوط مورچا بنا رکھا تھا۔ انور خاں کے دو درجن بہترین ''لڑاکے'' اس مورچے میں میرے اور عمران کے ساتھ موجود تھے۔ جب وہی کچھ ہوا جو بندے نے سوچ رکھا ہو تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ ہوا تھا، ہماری توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ جونہی فصیل کا کمزور حصہ مسمار ہوا، اینڈرسن کے گورے اور کالے فوجی سیلابی ریلے کی طرح اندر گھسے...... تب انہیں علم ہوا کہ ان کے لئے راستہ صاف نہیں ہے ان کے سامنے گہری خندق کی صورت میں ایک زبردست رکاوٹ موجود ہے۔ وہ رک گئے...... ان کے رکنے، پلٹنے اور پوزیشنیں سنبھالنے میں جو دو تین منٹ کا وقت لگا، اس نے ان پر قیامت ڈھا دی۔ ہمارے مورچے سے ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ یہ لرزہ خیز منظر تھا۔ اس وقت کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔ ٹریگر دبا کر کسی زندہ شخص پر گولی چلانا اور پھر اسے گھائل ہو کر گرتے ہوئے دیکھنا...... اور پھر دوسرے کو نشانہ بنانا۔ ان کی بے بسی، ان کی ناکام جدوجہد اور ان کی تڑپ پھڑک کو دیکھنا، یہ سب کچھ اور ہی طرح کا عمل تھا۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں......

تین چار منٹ کے اندر فصیل کو گرانے والے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے۔ وہاں درجنوں لاشیں گری ہوئی تھیں۔ کچھ ہلاک شدگان خندق کے اندر بھی گرے تھے۔ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں نے پیچھے ہٹ کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ میں مصروف ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہم قلعے پر اینڈرسن اور حکم کا پہلا بڑا حملہ روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لڑائی کی شدت میں بتدریج کمی

آتی چلی گئی۔ ظاہر تھا کہ اب اینڈرسن اور اس کے اہم کمان دار ساتھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ رات گزرنے سے پہلے پہلے کسی اور طرف سے زوردار حملہ کیا جائے۔ قلعے کی بالائی منزل سے ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ گھیرا ڈالنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے پورے قلعے کو گھیرا ہوا تھا۔ اردگرد کی سیکڑوں عمارتوں کی چھتوں پر بھی یہ لوگ موجود تھے۔ ان کی کثیر تعداد کا اندازہ ان کی حرکت کرتی ہوئی مشعلوں اور ٹارچوں وغیرہ سے بھی ہوتا تھا۔ ان کا زیادہ اجتماع قلعے کے مرکزی دروازے کی طرف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ سیلابی ریلے کی طرح دروازے کی طرف بڑھے اور انہوں نے دروازہ توڑنا چاہا تو تادیر انہیں روکا نہیں جا سکے گا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یار! اگر اب بھی نل پانی سے کوئی مدد نہ آئی تو پھر کب آئے گی؟''

''ہاں، اب تو انہیں آ جانا چاہئے......'' عمران کے بجائے چوہان نے جواب دیا۔

یہ بڑے قیمتی لمحے تھے اور ان کی قدر و قیمت ہم سب کو معلوم تھی۔ اسی دوران میں حسنات احمد کا ایک ساتھی بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے حسنات احمد کے کان میں کچھ کہا۔ حسنات کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر میرے قریب آ کر بولا۔ ''جناب! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔''

میں اور عمران، حسنات کے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ حسنات کے دو تین ساتھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ بھی کچھ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ ہم قلعے کے برآمدے سے گزرے اور پھر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ تہ خانہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شہتیر، بالے، لکڑی کے قدیم تختے، نہ جانے کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا اور ان سب چیزوں کے بیچ ٹوٹے پھوٹے فرش پر گیتا مکھی کی خون آلود لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا تھا۔ گیتا مکھی کے مرمریں گالوں پر انگلیوں کے گہرے نشانوں سے واضح ہوتا تھا کہ اس کا منہ کافی دیر تک دبا کر رکھا گیا ہے۔ گیتا نیم عریاں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سگریٹ سے داغنے کے کئی نشان بھی تھے۔

ہم حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑے رہ گئے۔ حسنات کے ساتھی نے آگے بڑھ کر ایک گرم چادر گیتا کے خونچکاں جسم پر پھیلا دی۔

حسنات بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ گیتا مکھی ہے۔ یہ راج بھون کی خاص ملازماؤں میں سے ہے۔ یہ راج بھون میں ناچنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ

دیوت تھی۔ اس کے سمبندھ بڑے بڑے لوگن سے تھے۔ اوہ خدایا! یقین نہیں آ رہا کہ یہ یہاں مری پڑی ہے۔''

عمران نے تاسف انگیز انداز میں کہا۔ ''اس پر دست درازی کی گئی ہے اور مارا بھی گیا ہے......''

عمران بغور موقع واردات کو دیکھنے لگا۔ حسنات کے ساتھی نے ایک گیس لیمپ اور پکڑ لیا۔ فرش پر قدموں کے نشان تھے۔ اس کے علاوہ گیتا مکھی کو گھسیٹے جانے اور مارنے پیٹنے کے شواہد بھی ملتے تھے۔ ایک نم کپڑا بھی ملا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کپڑا گیتا مکھی کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا یا ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گیتا کی ایک ہاتھ کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ عمران نے غور سے انگلیوں کا معائنہ کیا۔

''لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے جناب!'' حسنات کا ایک ساتھی بولا۔ ''ہمیں مشعلوں کے لئے لکڑیوں کی جرورت تھی۔ ہم یہاں آئے تو درواجے کو باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی ہم نے درواجا کھولا تو خون کی لکیر نجر آئی۔ جرا آگے بڑھے تو یہ لاش تھی۔''

''تمہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی لاش ہے؟''

''جج...... جی ہاں۔'' دوسرا شخص بولا۔ ''یہ بڑی مشہور عورت ہیں جی۔ ہم نے ان کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی ہوئی ہیں۔''

''تم کسی پر شک کر سکتے ہو؟''

''ناہیں جی ہمیں کچھ انداجا ناہیں۔ ہم تو اس بات پر حیران ہو رہے ہیں کہ یہ لال بھون کے ناچ گھر سے یہاں اس قلعے میں کیسے پہنچی ہیں؟''

عمران کا چہرہ تو سپاٹ تھا لیکن اس کے اندر کا گہرا دکھ میں نے محسوس کیا۔ یہ جواں سال عورت جس کا نام گیتا مکھی تھا، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اب تک ہمارے لئے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔ صرف ایک رات پہلے تک یہ عمران کے ساتھ ایک تنہا کمرے میں موجود تھی اور اپنی معلومات کے عوض اس کے پیار اور قربت کی طالب ہو رہی تھی۔ اب وہ اپنی تمام خواہشات سمیت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ وہ عمران سے اپنی خفیہ ملاقات کی وجہ سے ہی موت کا شکار ہوئی ہے۔

لاش کے بارے میں حسنات کے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد ہم اوپر واپس انور خاں کے پاس آ گئے۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دو جاں نثار

محافظ اس کی دونوں جانب چوکس کھڑے تھے۔

عمران کے اشارے پر میں نے ان محافظوں کو باہر بھیج دیا۔ اب کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ انور خاں کو اس سارے معاملے کی خبر تھی جو یہاں ہمارے اور گیتا مکھی کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں ہم نے خندق کھدوانے والا نہایت مفید کام کیا تھا۔

گیتا مکھی کے اس بہیمانہ قتل کی اطلاع نے انور خاں کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ بولا۔

''میرے اندازے کے مطابق یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے برادرز...... میں نے تمہیں جیل میں بتایا تھا نا کہ جیل پر ہم نے ایک زبردست حملہ کیا تھا۔ اگر وہ حملہ ناکام ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارے اندر سے یہ غداری ہوئی۔ ہمارے شب خون کی اطلاع پہلے سے جیل کے گارڈز کو ہو چکی تھی۔ اب یہاں بھی کوئی ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔ ہمارے اندر ہی کوئی ایسا بندہ موجود ہے جو ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس بندے کو گیتا مکھی اور عمران کی ملاقات کا علم ہوا ہے اور اس کا نتیجہ گیتا مکھی کی موت کی شکل میں نکلا ہے۔''

''کون ہوسکتا ہے؟'' عمران کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

''میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' انور خاں نے کہا۔ ''جیل والے واقعے کے بعد مجھے اپنے ایک ساتھی پر شبہ تھا مگر وہ شبہ درست نہیں نکلا۔ ہاں، اس بات کا یقین مجھے اب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ بندہ ہمارے قریبی ساتھیوں میں موجود ہے۔''

میں نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔ کون ہوسکتا تھا؟ انور خاں کے ساتھ جو لوگ یہاں زرگاں پہنچے تھے، وہ سب بھروسے کے تھے اور انہیں ہم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ ان میں ڈاکٹر چوہان، عبدالرحیم اور اجے کمار بھی شامل تھے۔ اس کے بعد بھرت اور امرناتھ تھے۔ مالا تھی اور اس کا شوہر ستیش جواب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مبارک علی، مخبر فیروز اور حسنات کے بارے میں بھی کسی طرح کا شبہ رکھنا غلط تھا۔ وہ انور خاں کے جاں نثار تھے اور ان کی اب تک کی کارکردگی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی۔

ہم دیر تک اس معاملے پر غور کرتے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انور خاں کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جس شخص یا اشخاص نے جیل کا شب خون ناکام بنایا تھا، وہی اب گیتا مکھی کی دردناک موت کا بھی ذمے دار ہے...... یا ذمے دار ہیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم سب کو حد سے زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

عمران اور انور خاں نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے حسنات اور مبارک علی کو بتایا اور ان دونوں کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ انور خاں کو بولنے میں کافی دقت ہو رہی تھی، اس لئے زیادہ تر ہدایات میری زبانی ہی جاری ہو رہی تھیں۔ ہم نے اسلحے کے گودام کی سکیورٹی تین گنا کر دی۔ دیگر اہم مقامات پر بھی نفری میں اضافہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر چوہان جی جان سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ چند اور افراد بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان میں آنجہانی ڈاکٹر لی وان کا ایک اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ میں چوہان کی حوصلہ افزائی کے لئے شفاخانے کی طرف گیا۔ یہ عارضی شفاخانہ ہنگامی بنیادوں پر قلعے کے شمالی حصے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہاں دو تین جنریٹرز کا اہتمام بھی تھا۔

زخمیوں میں سے زیادہ تر کو گولیوں اور تلواروں کے زخم آئے تھے۔ ہر طرف زخمیوں کی کراہیں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ان کو حتی الامکان طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر چوہان ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر عمران نے اسے شفاخانے کے اسپیشل وارڈ میں دیکھ لیا۔ یہاں زیادہ نازک حالت والے زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ کو جلنے سے زخم آئے تھے۔ ایک زخمی کے پیٹ میں راکٹ کے پرخچے لگے تھے۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک شخص کا بازو بارودی دھماکے میں جھلس گیا تھا۔ چوہان ایک نرس کی مدد سے اس کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپکا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے تھکن ٹپکی پڑ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بس ایک چھوٹے سے وقفے کے سوا پچھلے چوبیس گھنٹے سے کام کر رہا ہے۔ اسے آرام اور اچھے کھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اپنا خیال نہیں رکھے گا تو پھر خود بھی مریضوں میں شامل ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دو تین گھنٹے بعد وہ کچھ دیر کے لئے اوپر جا کر آرام کر لے گا۔

بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ مسلمانوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اونچی ذات کا ہندو ہے۔ وہ ایک مریض کے پاؤں سے بہنے والا خون اپنے ہاتھ سے صاف کر رہا تھا۔ بھرت کی شخصیت اسے ایک مختلف فرد بناتی تھی۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا میں گوروں کے جبر کا شکار ہوا تھا اور پھر یہاں پہنچا تھا۔ وہ اپنا نہیں تھا لیکن بیگانہ بھی نہیں تھا۔

میں اپنے سامنے لیٹے ایک تنومند زخمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ اور چہرہ بھی جھلسا ہوا نظر آ تا تھا۔ پورے چہرے پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے سینے تک ایک سفید چادر کھینچی ہوئی تھی۔ اس نے چادر ہٹائی تو نیچے خطرناک سیون ایم ایم رائفل نظر آئی۔ بڑی پھرتی سے اس

نے رائفل میری اور عمران کی طرف سیدھی کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''خبردار...... چھلنی کر دوں گا۔'' وہ دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مہارت سے گولی چلائی۔ ایک گارڈ جو رائفل سیدھی کرنی چاہ رہا تھا، الٹ کر دروازے کے پاس گرا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔

''خبردار...... اڑا دوں گا۔ اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' رائفل بردار پھر بولا۔ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی آواز نے بتا دیا کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔

بھانڈیل اسٹیٹ کا عیار ترین اور خطرناک قاتل۔ اس کا سارا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ پٹیاں یقیناً صرف چہرہ چھپانے کے لئے ہی لپیٹی گئی تھیں۔

میں نے اور عمران نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ چوہان چونکہ رنجیت کے بستر سے قریب تھا، اس نے بلا کی تیزی سے رنجیت پانڈے کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ مگر یہ جعلی مریض، اصلی ڈاکٹر کو مات دے گیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان اپنا ہاتھ پانڈے کی رائفل تک پہنچاتا، سیون ایم ایم کی گولی اس کی پیشانی توڑ کر اندر گھس گئی۔ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔

اس سے بہت پہلے کہ چوہان کا جسم فرش سے ٹکراتا، پانڈے کی رائفل پھر ہماری طرف سیدھی ہو چکی تھی۔ وہ ذرا سا موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میری سکتہ زدہ نظریں چوہان پر جمی تھیں، اس کی پیشانی سے خون کی پہلی بوندیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پانڈے پر جھپٹتا، میری گردن سے کوئی سخت چیز آ لگی۔ ''خبردار! گولی مار دوں گا۔'' عقب سے ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ عبدالرحیم کی آواز تھی۔ میں نے اور عمران نے تقریباً ایک ساتھ ہی مڑ کر دیکھا۔ عبدالرحیم ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور سفاکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک اور مریض اچھل کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹے بیرل کی رائفل نظر آئی۔

ڈاکٹر چوہان کی اچانک موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں برداشت کھو دوں گا اور کچھ ایسا ہو جائے گا جو نہیں ہونا چاہئے...... لیکن عمران کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ اور اس کے تاثرات دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا...... اس سچویشن میں مزاحمت کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سفید پٹیوں کے اندر سے پانڈے کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں...... اور یہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ان کے اندر خون کی

پیاس...... جنون بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنو، ان نازک لمحوں میں کوئی بھی قیامت برپا کر سکتا تھا۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

ایک بار پھر رنجیت پانڈے نے بیدردی سے کئی بار رائفل کا ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے سات آٹھ بار ''ٹھک ٹھک'' کی آواز بلند ہوئی۔ اس اسپیشل وارڈ میں موجود پانچ چھ مریض پلک جھپکتے میں زندگی سے موت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پانڈے نے بڑی مہارت سے ان کے سینوں یا سروں میں گولیاں ماری تھیں۔ یہ بربریت کی انتہا تھی۔ عبدالرحیم اور پانڈے کے دوسرے ساتھی کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ جدید رائفلیں تھیں، ایک سیکنڈ میں گولیوں کو بوچھاڑ کر سکتی تھیں۔ ان کی موجودگی میں صبر کا دامن چھوڑنے کا مطلب، خود موت کے جبڑوں میں اپنا سر دے دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہ دردناک منظر تھا وارڈ میں موجود کم و بیش چھ مریض جو پہلے ہی اپنے جان لیوا زخموں کی وجہ سے کراہ رہے تھے، تین چار سیکنڈ کے اندر خون میں نہا گئے۔ ایک درمیانی عمر کے باریش شخص نے سینے پر گولی کھانے کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی مگر پانڈے کی اگلی گولی نے اس کی شہ رگ چیر کر رکھ دی اور وہ بستر سے گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

''چلو آگے لگو میرے پو۔'' پانڈے نے مجھ سے مخاطب ہو کر جنونی لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کے درمیان جیسے ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اکثر اوقات ہم بغیر کچھ کہے سنے بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے...... شاید اکثر دوست جو پُر ہنگام حالات میں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور کٹھن واقعات کا سامنا کرتے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے رمز شناس ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں نے پانڈے کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل کیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ عجرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔

یہ لوگ ہمیں اندرونی سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔ یہ نسبتاً تنگ اور تاریک سیڑھیاں تھیں۔ ہم قلعے کی بالائی منزل پر پہنچے۔ جب ہم ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے، کئی افراد نے ہمیں اس حالت میں دیکھا اور حیران ہوئے لیکن ان افراد میں سے کوئی بھی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کر سکا۔ یہ سب لوگ چونکے ضرور لیکن اس سے پہلے کہ ان کا چونکنا کسی طرح کی کارروائی کا سبب بنتا، ہم اس کمرے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انور خاں ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ مبارک علی بھی اس کے پاس موجود تھا اور اس کے زخمی کندھے کی پٹی بدل رہا تھا۔

اس سچویشن نے ان دونوں کو بھی بری طرح چونکایا۔ اندر داخل ہوتے ہی پانڈے نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکیوں کو بھی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ کمرے میں موجود ایک گارڈ نے جاں بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہولسٹر سے پستول نکالا...... مگر اس کے پستول سیدھا کرنے سے پہلے ہی ٹھک کی منحوس آواز بلند ہوئی اور یہ گارڈ ماتھے پر گولی کھا کر ایک میز پر گرا اور اسے چکنا چُور کر کے فرش بوس ہو گیا۔

''میرا نشانہ چوکتا ناہیں حرامجادو۔ گولی چلا کر اڑتی مکھی کا پر کاٹتا ہوں۔'' پانڈے زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔ لگتا تھا کہ وہ آج سفاکی کی ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔

اس نے اپنے چہرے کی طویل پٹیاں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ وہ ایک بیگی ٹائپ جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا اس نے جیکٹ کے اندر سے لوہے کے دو کڑے نکالے۔ دیکھنے میں یہ کڑے بائیسکل کو لگائے جانے والے تالے کی طرح لگتے تھے مگر اس تالے سے کچھ بڑے تھے۔ اسٹیل کے بنے ہوئے ان کڑوں کی ایک جانب ایک ڈیجیٹل میٹر بھی بنا ہوا تھا اور ہندسے حرکت کر رہے تھے۔ پانڈے نے اپنی قاتل رائفل ہماری طرف سیدھی رکھی اور ایک کڑا اپنے تنومند ساتھی کو تھما دیا...... اس نے آگے بڑھ کر اسٹیل کا یہ کڑا شدید زخمی انور خاں کی گردن میں پہنا دیا۔ ''کھٹ'' کی آواز سے کڑا لاک ہوا اور اس پر ایک سرخ بلب جل اٹھا۔ یہ سارا عمل بس چار پانچ سیکنڈ کے اندر مکمل ہو گیا۔

دروازے سے باہر ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ پھر حسنات احمد کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''مبارک! دروازہ کھولو...... کون ہے اندر؟''

جب حسنات نے یہ فقرہ دو تین بار دہرایا تو پانڈے کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پپو! دیکھتا کیا ہے۔ سسرے کھڑکی کھول...... اور اس ذلیل سے بول کہ ابھی کچھ دیر چھری کے نیچے سانس لے۔ اندر انور خاں کی ماں، بہن کے ساتھ جروری کام ہو رہا ہے۔''

میں نے یہ فقرہ بمشکل برداشت کیا اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ فی الحال پانڈے کی ہدایت پر عمل کرنا ہی مناسب ہے۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ باہر حسنات اور مبارک کے مشتعل ساتھیوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہر ایک کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

''کھبردار! کوئی فالتو بات کی تو تیرا گندا بھیجا دیوار سے چپکا دوں گا۔'' پانڈے پھنکارا۔

میں نے حسنات سے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔

ابھی تھوڑی دیر میں دروازہ کھولتے ہیں۔''

''لیکن...... آپ پر رائفلیں اٹھانے والے یہ لوگ کون ہیں؟ اور ان میں سے ایک تو شاید عبدالرحیم ہے۔''

''ہاں...... وہ بھی ہے لیکن اب معاملہ طے ہو رہا ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے حسنات احمد کو تسلی دی۔

''ہمارے پاس زیادہ ٹائم ناہیں ہے جی۔ بڑے دروازے کے سامنے اینڈرسن کے لڑاکا دستے جمع ہو رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہلا بول سکت ہیں......'' حسنات نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ وقت ناہیں لگائیں گے۔'' میں نے کہا اور کھڑکی بند کر دی۔

پانڈے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر جلنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس نے پسپا ہوتے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں گھسنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے ایک زخمی کی حیثیت سے اپنا منحوس تھوبڑا پٹیوں میں لپیٹ لیا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی عیاری اور خطرات پسندی کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ درست ثابت ہوا تھا۔ نل پانی کے دیوان کی طرح وہ یہاں بھی بے خوف گھس آیا تھا اور اب ایک جنونی قاتل کی حیثیت سے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دائیں طرف عبدالرحیم کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اسی بدترین شخص کا چہرہ تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے اندر رہا ہے اور آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق پیچھے کی طرف پلٹتے جائیں، یہ شخص اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ ہر کٹھن وقت میں پایا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی سے لے کر میر جعفر اور میر صادق تک، اور پھر وہاں سے لے کر موجودہ دور کے نامی گرامی غداروں تک یہ شخص ہر جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ یہاں بھی انور خاں کے قریبی ساتھی عبدالرحیم کی صورت میں موجود تھا۔ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ انور خاں کا یہی ساتھی تھا جس نے جیل پر کئے جانے والے زوردار حملے کو ناکام بنایا تھا۔ یقیناً اینڈرسن یا منیارڈ جیسے کسی شاطر گورے نے اسے ''چمک'' دکھا کر اپنے جال میں پھنسایا تھا اور بازی پلٹی تھی۔

میں نے عبدالرحیم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بھی پوری ڈھٹائی سے میری طرف دیکھ رہا تھا...... دو دن پہلے یہ شخص میرے گلے لگ کر رویا تھا اور سلطانہ کی موت پر آنسو بہائے تھے۔ آج یہ بڑے طمطراق سے مجھ پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اپنے آقاؤں کے ایک اشارے پر یہ میرے جسم میں ایک درجن سوراخ کر سکتا تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت تھی کہ گیتا مکھی کی موت

کا ذمے دار بھی یہی عبدالرحیم ہے۔ جب گیتا مکھی، عمران سے ملاقات کے لئے کمرے میں داخل ہوئی تھی...... یہ کمرے سے باہر پہرے والوں کے ساتھ موجود تھا۔

پانڈے نے سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ ''پپو! میرا خیال ہے کام کی بات کرلیویں۔ ہمارے پاس جیادہ سمے ناہیں ہے۔ ویسے بھی تم سب کو بڑے جور کی لگ رہی ہووے گی۔ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسٹیل کا کڑا ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسٹیل کا کڑا ہے اور مجے کی بات یہ ہے کہ اسٹیل صاحب کا ہی بنایا ہوا ہے مرنے سے پہلے یہ آخری تحفہ وہ تم دونوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے پوری آشا ہے کہ جب یہ تحفہ تم دونوں کی دم میں نمدہ فٹ کرے گا تو اسٹیل صاحب کی آتما کو جرور شانتی ملے گی۔''

''جو بکواس کرنی ہے صاف صاف کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ کڑا عجت مآب جناب خان صاحب کی گردن میں فٹ ہو چکا ہے۔ اس میں جبردست قسم کا دھماکا خیج مواد ہے یہ پھٹے گا تو خان صاحب کے چیتھڑے اڑا جاویں گے۔ ان کے شریر (جسم) کے سارے ظاہری اور پوشیدہ ٹکڑے اڑ اڑ کر اس کمرے کی دیواروں سے چپکیں گے۔ یہ دیکھ لو، اس کے اوپر میٹر چل رہا ہے۔ الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ صرف اور صرف تیس منٹ ہیں تم لوگن کے پاس...... بلکہ اب تیس بھی کیا صرف ستائیس رہ گئے ہیں۔ اب تم دونوں کے ذلیل دماغوں میں جرور آئے گا کہ اپنے خان صاحب کی جان اس کڑے سے کیونکر چھڑوائی جاوے...... تم سوچو گے کہ کسی طرح ہمیں ''ناک آؤٹ'' کر دو اور پھر یہ کڑا خان صاحب کی گردن شریف سے اتار پھینکو...... لیکن ایک بات میں تم کو بالکل صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ یہ کڑا کسی بھی طرح خان صاحب کی گردن سے اتارنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جاوے گا...... اس کو کھولنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ بس ایک ہی......''

ہم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور اپنے لب و لہجے سے وقعی بے حد خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمارے چہرے دیکھے پھر اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی چابی وابی ناہیں ہے۔ اس کی چابی اس کا کوڈ ہے۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ...... اور وہ کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں...... ''اور یہ کمینہ پن میں نے اپنے تک ناہیں رکھا۔ آگے بھی چلایا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے زرگاں کے آدھے

سے جیادہ کمینے بچے میرے ہی چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں بہت سے غیر قانونی سالے ہیں میرے۔ یہ عجت مآب خان صاحب بھی ان میں سے ایک ہو سکتے ہیں......'' اس کے لہجے میں زہر تھا اور آگ تھی۔

انور خاں سے یہ ریمارکس برداشت نہیں ہوئے۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی پانڈے نے بے دریغ گولی چلائی۔ ''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ گولی انور خاں کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ''حرامجادے! اگلی گولی سے تیرا نایل پھوڑ دوں گا۔''

انور خاں کا چہرہ سرخ...... انگارہ ہو گیا لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ان لمحوں میں دلیری دکھانا، ہوش و حواس کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

رنجیت پانڈے کا پارا چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اس کڑے کو کھولنے کا کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور وہ کہیں لکھا ہوا ناہیں ہے۔ بس یہاں ہے یہاں...... میرے کھوپڑے میں۔'' اس نے انگلی سے اپنی کنپٹی کو ٹھونکا۔ ''اگر تمہارے گندے دماغوں میں مجھے مارنے کا کیڑا رینگ رہا ہے تو اس کیڑے کو کچل دو کیونکہ اگر کسی وجہ سے میں مر گیا تو تمہارے اس خان صاحب کو دو ڈھائی ہجار ٹکڑوں میں بٹنے سے کوئی ناہیں بچا سکے گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی بتا دیوت ہوں پپو۔ پہلے تم دونوں کے کھوپڑوں میں گھسے ہوئے شک کا کچومر تو نکال دوں۔ مجھے پتا ہے تم دونوں بوگیر کتوں جیسے ہو۔ بڑی دور دور کی بو سونگھنے کی کوشش کرت ہو۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس کے ثبوت کے لئے یہ دوسرا ''اسٹیل رنگ'' حاجر خدمت ہے۔''

اس نے وہ دوسرا کڑا ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کڑے پر بھی بالکل دوسرے کڑے کی طرح ڈیجیٹل میٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس کڑے کو لاک کیا۔ اس پر سرخ بلب روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹر پر الٹی گنتی شروع ہو گئی۔

''پچیس...... چوبیس...... تیئیس......

رنجیت بولا۔ ''تم دونوں کے والد بزرگ باشی اسٹیل صاحب نے یہ بڑے کمال کی چیز بنائی ہے۔ یہ دیکھو، اس ''رِنگ'' پر پچیس سیکنڈ کا ٹائم فکس تھا۔ پندرہ سیکنڈ گزر چکے، دس سیکنڈ باقی ہیں۔ لو اس کی کارکردگی ملاحجہ کرو۔'' اس نے احاطے کی طرف والی کھلی کھڑکی میں سے اسٹیل رِنگ باہر پھینک دیا۔ احاطے میں یقیناً یہ اسٹیل رِنگ لوگوں کے درمیان ہی گرا ہوگا۔

کچھ کرنے یا کہنے سننے کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ چھ سیکنڈ بعد ایک زبردست دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ تیز چمک بھی تھی۔ بچوں اور عورتوں کے چلانے کی کرب ناک آوازیں بلند ہوئیں۔ احاطے کے اس حصے میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا کھڑکی کے پٹ سے آ چپکا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ کپڑے کی ایک دھجی بھی تھی۔ یہ شاید کسی بچی کا پھول دار فراک تھا۔

پانڈے کے چہرے پر درندگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بھیانک شخص ہے۔ نل پانی میں میرے ساتھ لڑتے ہوئے وہ کسی وجہ سے پسپا تو ضرور ہوا تھا مگر پسپا ہوتے ہوتے بھی ایک خوف ناک بم بلاسٹ کر گیا تھا جس میں درجنوں افراد کی جان گئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اب تمہیں وشواس ہو گیا ہوگا کہ یہ کوئی ناٹک نہیں ہے۔ خان صاحب کی گردن شریف میں جو پٹا ڈالا گیا ہے، وہ جرور ان کے جسم کے پوشیدہ ٹکڑوں کو اس کمرے کی دیواروں اور چھت سے چپکائے گا۔'' پھر اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اور اب ہمارے پاس بچا ہے فقط بیس منٹ کا سمے۔ ان بیس منٹوں کے اندر تمہیں اس قلعے کا بڑا درواجا کھلوانا ہے اور اس سارے معاملے کو بغیر لڑائی مار کٹائی اور جیادہ خون خرابے کے حل کرنا ہے۔ اور میں جانت ہوں کہ یہ کام عجت مآب جناب خان صاحب کر سکت ہیں یا تم کر سکت ہو۔'' اس نے اپنی بھدی کالی انگلی میری طرف سیدھی کی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھری ہوئی تھی۔ آنکھیں جل ہی تھیں۔

''تم چاہتے ہو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیں؟'' عمران نے کہا۔

''یہ گلا کاٹنا ناہیں ہووے گا۔ یہ جندہ رہنے کا اور امن شانتی کا معاہدہ ہووے گا۔ اینڈرسن صاحب بہادر کی طرف سے یہ وچن ہے کہ درواجا کھول دیا جاوے تو کسی عورت، مرد، بچے سے کوئی جیادتی ناہیں ہووے گی۔ عام معافی کا اعلان کیا جاوے گا۔''

انور خاں پھنکارا۔ ''حکم جیسے دغاباز اور اینڈرسن جیسے عیار لومڑ کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی دیوانہ ہی ہوگا۔ اینڈرسن اپنی گندی زبان سے پہلے بھی ایسے بہت سے وعدے کرتا رہا ہے......اور یہی کام جارج گورا کا ہوا کرتا تھا......''

''دیکھو خان صاحب! یہاں لمبا بھاشن ناہیں چلے گا۔ سمے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں تم کو صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ ہمارے فوجی دستوں نے اندر تو آنا ہی آنا ہے۔ یہ درواجا

کھلے گا ناہیں تو پھر ٹوٹ جاوے گا۔ اور اگر یہ ٹوٹے گا تو پھر بہت برا ہووے گا۔ یہاں کیچڑ ہو جاوے گا تم لوگن کے خون سے۔ اور اس کیچڑ پر تمہاری روتی چلاتی عورتوں سے برا بھلا بھی کریں گے ہمارے سینک۔ خود پر اور اپنے بال بچوں پر کرپا فرماؤ۔ درواجا کھلوا دو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی صورت نہیں۔'' انور خاں کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ بم پھٹتا ہے تو پھٹنے دو۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔''

پانڈے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیا کہتے ہو پپو؟ تمہیں بھی جناب خان صاحب کے جیون کی کوئی پروا نہیں؟ یہ محترم خان صاحب ہی ہیں جن کی لعنتی شخصیت کی وجہ سے زرگاں کے یہ مُسلے یک جان ہیں، ورنہ یہ گندی نالے کے کیڑے ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے زرگاں کی ایک سو دس نالیوں میں علیحدہ علیحدہ بہہ رہے ہوتے۔''

انور خاں کی گردن میں ''اسٹیل رِنگ'' تھا اور اس ''رِنگ'' کا ڈیجیٹل میٹر بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وحشت ناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔ پانڈے نے دونوں راستے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیئے تھے۔ ہمیں قلعے کا بڑا دروازہ کھلوانا تھا یا پھر اپنی اور انور خاں کی موت کو قبول کرنا تھا۔ ہمارے یعنی میرے، عمران اور بھرت وغیرہ کے لئے تو پھر بھی چانس موجود تھا۔ ہم پانڈے اور اس کے دونوں ساتھیوں پر غلبہ پانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر انور خاں کی زندگی تو سو فیصد نشانے پر تھی۔ ہم کسی طرح پانڈے، عبدالرحیم اور تیسرے شخص کو بے بس کر بھی لیتے تو انور خاں کا کیا کرتے...... پانڈے بتا چکا تھا کہ اس بلاسٹ ڈیوائس کی الٹی گنتی کو بس کوڈ لگا کر ہی بند کیا جا سکتا ہے اور کوڈ بس پانڈے کو معلوم تھا۔ ہم پانڈے کو جان سے مار کر بھی انور خاں کو نہیں بچا سکتے تھے۔

''اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔'' پانڈے نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''چابیاں نکالو اور درواجا کھلواؤ۔ ورنہ کچھ باقی ناہیں بچے گا اور خان صاحب کی موت کی تو پوری گارنٹی ہے۔''

عبدالرحیم رائفل تھامے، کمرے کے کونے میں بالکل چوکس کھڑا تھا۔ وہ بکا ہوا شخص تھا اور اس کی آنکھوں میں بے غیرتی ناچ رہی تھی۔ وہ ایک عام سا شخص تھا لیکن اپنے ہم وطنوں سے بے وفائی کا تمغہ سینے پر سجا کر وہ عام نہیں رہا تھا۔ گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے وہ انور خاں کو اور ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔

کمرے سے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال جاننے کے لئے بے قرار تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کی کھڑکی سے احاطے میں کوئی

مہلک چیز پھینکی گئی ہے جس سے زبردست بلاسٹ ہوا ہے اور لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔ یقیناً ہماری سلامتی کے حوالے سے بھی باہر کے لوگوں کے خدشات بڑھتا جا رہے تھے۔

ہمارے اور پانڈے کے درمیان اعصاب شکن مکالمہ ہوا۔ انور خان کے گلے میں آویزاں ''اسٹیل رِنگ'' کو ''ڈی ایکٹی ویٹ'' کرنے کے لئے پانڈے کی بس ایک ہی شرط تھی۔ قلعے کا دروازہ کھلوا دیا جائے اور اینڈرسن کے دستوں کو پُرامن طریقے سے اندر آنے کی اجازت دی جائے...... یہ شرط ہمارے لئے اور خاص طور سے انور خان کے لئے کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ ایک حوصلہ مند حریت پسند تھا زرگاں میں اس کی جدوجہد کی داستان طویل تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی درجنوں بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ چکا تھا۔ اس نے آج بھی جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی...... اور ڈیجیٹل میٹر تیزی سے پیچھے کو جا رہا تھا۔ اب صرف آٹھ منٹ کا وقت باقی تھا۔ پانڈے پھنکارا۔ ''صرف آٹھ منٹ...... اس کے بعد خان صاحب کی رُخصتی تو یقینی ہے...... پھر تم تینوں کو بھی باری باری جانا پڑے گا۔''

''لیکن تم......''

''لیکن...... کچھ نا ہیں۔''

پانڈے نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اب ساڑھے سات منٹ ہیں۔ اس میں تم بڑی مشکل سے دروازے تک پہنچ سکو گے اور اسے کھلوا سکو گے...... جونہی دروا جا کھلے گا، میں کوڈ لگا کر گنتی اسٹاپ کر دوں گا۔ جلدی کرو۔ اب اٹھ جاؤ۔''

وہ خبیث اپنے مؤقف سے ایک ملی میٹر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا اور وقت واقعی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی صورتِ حال کے بے پناہ دباؤ کو محسوس کر رہا تھا۔ اب یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ اگر ہم دروازہ نہیں کھلوائیں گے تو کم از کم انور خان تو فوری طور پر موت کے منہ چلا جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''پانڈے! تم تھوڑی دیر کے لئے اسے اسٹاپ کر دو تا کہ ہمیں دروازے تک پہنچنے اور اسے کھلوانے کے لئے مناسب وقت مل سکے۔''

''یہی تو پرابلم ہے پپو کے یار! اس ڈیوائس کو بس ایک ہی دفعہ آن اور ایک ہی دفعہ آف کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں نے اسے ایک بار آف کر دیا تو پھر یہ میرے لئے اتنا ہی بیکار ہو جاوے گا جتنا کسی ہیجڑے کے لئے منگل سوتر ہوتا ہے۔ میں تم سے پھر کہوت ہوں۔ اب بھاگو یہاں سے، وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔''

''او کے...... او کے۔'' عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آؤ تابی!''

ہم مڑ کر دروازے کی طرف بڑھے اور یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ میری چھٹی حس مجھے پہلے سے خبردار کر رہی تھی کہ عمران کچھ کرنے والا ہے اور اس نے کر دیا تھا۔ میں نے اس کا وہی خطرناک روپ دیکھا جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ عبدالرحیم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تڑپ کر اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالا۔ یہ ایسی برق رفتار حرکت تھی جس کی تیزی کو شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جا سکے۔ عمران نے بیرل کو تھاما۔ یہی وقت تھا جب عبدالرحیم کی انگلی بے ساختہ ٹریگر پر دب گئی۔ عمران شاید جانتا تھا کہ یہ ہو گا۔ اس نے بیرل کا رخ اپنی مرضی کے رخ پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ رائفل سے چھ گولی کا برسٹ چلا اور پانڈے کے لحیم شحیم ساتھی کو چھلنی کر گیا۔ چند گولیاں کھڑکی کے تختوں سے پار ہو گئیں میں پانڈے سے قریب تھا۔ پوری طاقت اور تیزی سے اس پر جا پڑا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزری۔ میں نے اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔ پانڈے کی اپنی ہی رائفل کا آہنی بیرل، وزنی سائیلنسر سمیت اس کے چہرے پر لگا۔ یہ اتنی بھرپور ضرب تھی کہ میں نے پانڈے کی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ وہ پشت کے بل پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ یہ بھی ایک بے مثال ضرب تھی۔ زرگاں میں اَن گنت ناجائز بچوں کا مبینہ باپ گھٹنوں کے بل گرا لیکن...... اس نے ابھی تک اپنی رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ایک بار پھر رائفل میری طرف سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر تب تک عمران...... طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عبدالرحیم سے چھینی ہوئی رائفل کا دستہ گھما کر پانڈے کی کھوپڑی پر مارا۔ وہ اچھل کر اپنے مردہ ساتھی کے پہلو میں گرا۔ اس مرتبہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ تاہم گرتے ساتھ ہی وہ یوں اٹھا جیسے اس کے پورے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ بلا خیز رفتار سے عمران کی طرف آیا۔ عمران نے اس پر لاٹھی کی طرح رائفل چلائی مگر وہ جھک کر بچ گیا۔ اس کے کندھے کی ٹکر عمران کے سینے پر لگی۔ دونوں اوپر تلے فرش پر گرے۔ چند سیکنڈ کے لئے ان دونوں کے درمیان زبردست کشمکش نظر آئی۔ دونوں لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھے مگر پھر عمران کا داؤ چل گیا۔ وہ پلٹ کر پانڈے کو اپنے نیچے لے آیا۔ اور یہی وقت تھا جب وہ کچھ ہوا جس کی توقع مجھے یا عمران کو نہیں تھی۔ پانڈے نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور اپنے مردہ ساتھی کے ہولسٹر میں سے اچانک پستول کھینچ لیا۔ بس ایک سیکنڈ کی بات تھی، وہ گولی عمران کے سر پر ٹھونک سکتا تھا۔ پانڈے کی رائفل اب

میرے ہاتھ میں تھی۔ میں...... جان گیا کہ اگر ایک سیکنڈ کے اندر میں نے یہ رائفل استعمال نہیں کی......اور بالکل درست استعمال نہیں کی تو میں عمران کو کھو دوں گا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے ایک بار پھر ''ٹھک'' کی ہلاکت خیز آواز بلند ہوئی۔ گولی کھا کر پانڈے کا سر ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ اس کی کنپٹی میں موت کا روشن دان کھل گیا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ......مردہ چھپکلی کی طرح واپس، پٹ سے فرش پر گرا۔ اس کی کنپٹی بڑی سرعت سے سرخ ہوتی چلی گئی۔ زرگاں میں ہمارا خطرناک اور مکارترین دشمن موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور یہ سب کچھ حیران کن سرعت سے ہوا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب مجھے اور عمران کو ایک ساتھ صورتِ حال کی بدترین سنگینی کا احساس ہوا۔ انور خاں کی زندگی خطرے میں تھی۔ انور خاں کے گلے میں مقفل ہو جانے والے ''اسٹیل رِنگ'' کا میٹر چل رہا تھا اور سرخ بلب روشن تھا۔ اب صرف چھ منٹ باقی تھے۔ پانڈے نے کہا تھا کہ اس میٹر کی الٹی گنتی کو روکنے کا کوڈ صرف وہ جانتا ہے اور اگر اس ''اسٹیل رِنگ'' کو کسی بھی طرح انور خاں کی گردن سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔ اور قرائن سے لگتا تھا کہ پانڈے کی دونوں باتیں درست تھیں۔ عمران نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حسنات اور مبارک علی سمیت کئی افراد اندر آ گئے۔ اندر پڑی ہوئی خونچکاں لاشوں نے ان سب کو ششدر کر دیا۔ ان میں سے صرف عبدالرحیم کے جسم میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی......باقی پانڈے سمیت داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ عبدالرحیم کا سر بھی عمران کی ایک سخت ضرب کی وجہ سے پھٹ چکا تھا۔ عمران نے تیزی سے پانڈے کے لباس کی تلاشی لی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پانڈے نے بارہ ہندسوں والے جس کوڈ کی بات کی تھی، وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا اور پانڈے کی جیبوں میں موجود ہو لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی ہم کوئی ایسا نمبر نہیں ڈھونڈ سکے۔ اسی دوران میں حسنات اور مبارک وغیرہ بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ میں نے حسنات کو تیزی سے باہر نکلتے اور ایک جانب اوجھل ہوتے دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص بات آئی تھی۔

حسنات جس تیزی سے گیا تھا، اسی تیزی سے واپس آ گیا۔ وہ کسی قریبی کمرے سے چند انگریز قیدیوں کو ہانک کر لایا تھا۔ ان میں دو لڑکیاں اور تین مرد تھے۔ ان کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔

حسنات نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل کے ساتھ ہیں جی۔ اس کے ساتھ لیبارٹری میں کام کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی اس

رِنگ کے کوڈ کے بارے میں جانتا ہووے گا۔''

میں نے بغور ان پانچوں افراد کو دیکھا۔ ان میں سے دو نوجوان تھے، باقی ادھیڑ عمر تھے۔ ایک بھوری داڑھی والے کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یہ گرفتار شدگان تھے۔ اب بھی ان کی طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ بظاہر ان کی تن فن ختم ہو چکی تھی مگر اندرونی اکڑ باقی تھی۔ شاید یہ اکثر مغربی ممالک کے باشندوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر خود کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ہزیمت اٹھا کر بھی وہ اپنی گردن کا تناؤ برقرار رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جلد ہی ان کی شکست جیت میں بدل جائے گی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی یہ پانچوں افراد یہاں کی سنگین ترین صورتِ حال کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ بستر پر نیم دراز انور خاں کی گردن میں موت کا پھندا موجود ہے اور ہندسے تیزی سے پیچھے کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ سرجن اسٹیل اس قسم کے جتنے بھی منحوس آلات تخلیق کرتا تھا، وہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسٹیل کے اس مہلک رِنگ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کا کوڈ ان میں سے کسی کو معلوم ہو۔

میں نے اور عمران نے ان پانچوں سے بڑی تیزی کے ساتھ اس بارے میں سوالات کئے۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اس الیکٹرانک رِنگ کو کوڈ کے ذریعے پھٹنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن کوڈ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یا معلوم تھا اور وہ بتا نہیں رہے تھے۔ یہ بڑے دردناک لمحات تھے۔ ہماری پیشانیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ میں نے بھوری داڑھی والے کے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے۔ کوڈ بتا دو۔''

''میں نہیں جانتا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا یہ ڈیوائس تم لوگوں نے نہیں بنایا؟ اس کے کل پرزے تم نے نہیں جوڑے؟''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اس کام کی دوسری اسٹیج میں شریک رہا ہوں مگر کوڈ کی تفصیل مجھے پتا نہیں۔ اگر تم مجھے اس کوڈ کی وجہ سے مارو گے تو یہ غلط وجہ ہوگی۔''

میں نے کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت کے بال پکڑے۔ وہ انگریزی میں بولی۔

''مجھے نہیں معلوم مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس میں کوئی کوڈ لگتا ہے......اگر......اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس شخص کی جان بچانے کے لئے بتا دیتی۔''

وہ سارے کوڈ کی جانکاری سے انکاری تھے۔ اور وہ سب قریبی ماتحتوں کی حیثیت سے سرجن اسٹیل کی شعبدہ ساز لیبارٹری میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو

رہی تھی۔

اب تین ساڑھے تین منٹ کا وقت باقی رہ گیا تھا۔ انور خاں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اب تم لوگ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میرے ساتھ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔"

اس نے اصرار کے ساتھ ہم سب کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ وہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔ وہ بے بسی کا عروج تھا۔ زرگاں کا ہر دل عزیز حریت پسند، جبر کی آنکھوں میں ہر پل آنکھیں ڈال کر رکھنے والا انور خاں موت کے منہ میں تھا اور ہم اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اچانک کرشمہ ساز عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس نے رائفل کا دستہ ایک انگریز قیدی کی پیٹھ پر رسید کیا اور اسے واپس انور خاں کے کمرے میں دھکیل دیا۔ اس ہٹے کٹے شخص کو پانڈے کی لاش سے ٹھوکر لگی اور وہ انور خاں کے بستر کے قریب گرا۔ پھر عمران نے ایک دوسرے قیدی کی پیٹھ پر لات رسید کی اور اسے بھی کمرے میں پھینک دیا۔

وہ گرجا۔ "ان سارے حرامزادوں کو کمرے میں پھینکو۔ اگر انور خاں جائے گا تو پھر یہ بھی ساتھ جائیں گے۔"

یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ ڈیجیٹل میٹر کی الٹی گنتی اب دو منٹ تک پہنچ چکی تھی۔ ہم نے پانچوں انگلش ٹیکنیشنز کو دھکیل کر انور خان والے کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ قیدی ٹیکنیشنز کے رنگ برف کی طرح سفید ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ انور خاں کے ساتھ ہی وہ بھی "اڑنے" والے تھے۔ موت کو عین سامنے دیکھ کر ان کا صبر و تحمل اور ٹھہراؤ جواب دے گیا۔ وہ دہائی دینے لگے۔ اندر سے دروازہ پیٹنے لگے۔ شارٹ اسکرٹ والی نوجوان انگریز لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ یہ سارے مناظر ہم کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔

"اسٹیل رِنگ" کا میٹر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ایک منٹ تیس سیکنڈ...... ایک منٹ پچیس سیکنڈ...... ایک منٹ بیس......

موت آتی ہوئی نظر نہیں آتی...... لیکن یہاں اس کمرے میں وہ نظر آ رہی تھی۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر، ان کی آنکھوں میں۔ انور خاں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور یہی وقت تھا جب کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت تیزی سے مڑی اور لڑکھڑاتی ہوئی انور خاں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے اسٹیل کے "رِنگ" کا ایک کھٹکا کھولا۔ نیچے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا "کی پیڈ" تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی کانپتی انگلیاں چلائیں۔ وہ کوڈ پریس کر رہی تھی...... اور وہ زندگی کا کوڈ تھا بارہ ہندسوں کا کوڈ...... جو موت کے میسج کو

"ڈیلیٹ" کر کے زندگی کو جاری رکھنے کی انسٹرکشنز دے سکتا تھا۔ اور پھر الٹی گنتی رک گئی۔ آخری ریڈنگ بیس سیکنڈ تھی۔ بیس سیکنڈ کے فرق سے موت کا فرشتہ راستہ بدل گیا تھا۔ عمران کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے اندر کے اطمینان کو ظاہر کیا کرتی تھی۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ کھچڑی بالوں والی عورت کانپتے ہاتھوں سے انور خاں کی گردن سے مہلک ڈیوائس اتار رہی تھی۔ بیشتر قیدی سر تھامے بیٹھے تھے۔ نوجوان لڑکی زار زار رو رہی تھی۔ یقیناً اس کے رونے کی وجہ فوری موت سے بچ جانے کا احساس تھا...... اور وہ خوشی تھی جو کسی ریلے کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

انور خاں سے بغل گیر ہونے کے بعد، میں اور عمران زیریں منزل کی طرف لپکے۔ ہمیں ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر چوہان زندہ ہوگا...... لیکن اس "آس امید" کا کیا کیا جائے۔ یہ آخر تک انسان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ ہمارے دلوں میں بھی یہ جلتی بجھتی سی کرن موجود تھی کہ شاید چوہان کی زندگی کی راکھ میں کوئی چنگاری موجود ہو۔

ہم نیچے پہنچے۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے اسپیشل وارڈ میں داخل ہوئے۔ چوہان ایک بستر پر تھا۔ اس کی لاش پر ایک سفید چادر کھینچ دی گئی تھی۔ یہ چادر گواہی دے رہی تھی کہ راکھ ہی راکھ ہے۔ چنگاری کہیں نہیں۔ میں نے اس کے پاؤں کو چھوا۔ اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ وہ "سو رہا تھا"۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل کام کر رہا تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ بھوکا بھی تھا...... ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا اور اسی طرح "روانہ" ہو گیا تھا۔ یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت شروع ہو جاتا ہے، کسی بھی حالت میں۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور میرے دو آنسو اس کے خون اور آلود رخساروں پر گرے پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بالوں میں رینگ گئے۔

قلعے سے باہر ہونے والے زوردار دھماکوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اینڈرسن نے حملہ شروع کروا دیا ہے۔ چوہان کے چہرے پر چادر ڈال کر میں اور عمران واپس مڑے۔ اس اسپیشل وارڈ کے بستروں پر مریض نہیں تھے، خونچکاں لاشیں تھیں۔ چوہان کی لاش کی طرح ان لاشوں پر بھی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں تقریباً ایک گھنٹا پہلے پانڈے نے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنے مقتولوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں اور عمران سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے واپس بالائی منزل پر پہنچے۔

عبدالرحیم کو گہری بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔ پانچوں انگریز قیدیوں کو واپس ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ باقی لاشیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ ان میں خونچکاں کھوپڑی اور ٹوٹی ہوئی ناک والا رنجیت پانڈے بھی تھا۔ وہ پستول ابھی تک اس

کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے عمران کو شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مرنے کے بعد بھی وہ جیسے اسی پستول کے ذریعے اپنی مزاحمت جاری رکھنا چاہتا تھا...... عمران نے پستول پانڈ کے مردہ ہاتھ سے چھڑایا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کر دیا۔

انور خاں نے کہا۔ ''اینڈرسن نے حملہ شروع کروا دیا ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس مزید راکٹ ہیں تو وہ ''مین'' دروازے پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوشش کی جائے کہ یہ راکٹ دروازے کے قرب پہنچنے ہی نہ پائیں۔ فصیل کے اوپر سے لمبی رینج کی رائفلوں کے ساتھ راکٹ لانچروں کو نشانہ بنایا جائے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ ان لوگوں کے پاس اب زیادہ راکٹ نہیں ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''عمران! میرا خیال ہے کہ ہمیں لڑائی والی جگہ پر پہنچنا چاہئے۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مبارک اور بھرت کو ہدایت کی کہ وہ انور خاں کے قریب رہیں اور اس کی سکیورٹی کی ذمے داری اٹھائیں...... اس کے علاوہ انور خاں کے پیغامات کو کمان داروں تک پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ میں، عمران اور حسنات احمد قلعے کے اس حصے کی طرف روانہ ہوئے جہاں زوردار لڑائی ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں ہر طرف شعلہ فشاں دھماکے ہو رہے تھے اور پگھلا ہوا سیسہ آتشیں بارش کی طرح برس رہا تھا۔

ایسی لڑائیوں کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا لیکن آج ہم خود اس قدیم طرز کی لڑائی کا حصہ تھے۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ ایسی لڑائیوں کا تناؤ اور خوف لڑائی سے قبل زیادہ ہوتا ہے۔ جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے، جب نعرے بلند ہوتے ہیں اور خون اچھلتا ہے تو پھر صورتِ حال کا ڈر بتدریج دل سے نکلتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں سے ''ڈر'' یوں بھی بہت دور تھا کہ اس کی جگہ ایک بھڑکتے ہوئے طیش نے لی ہوئی تھی۔ ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے گیتا مکھی اور ڈاکٹر چوہان کی لاشیں اٹھائی تھیں اور اس سے بھی بہت بڑی بات یہ تھی کہ ہم نے معصوم بالو کی ماں کی لاش اٹھائی تھی...... سلطانہ کی لاش اٹھائی تھی۔ وہ لاش جیسے ابھی تک میرے ہاتھوں پر دھری تھی۔ اتنے دن گزرنے کے باوجود میرے بازوؤں پر نہ اس کی گرمی کم ہوئی تھی، نہ اس کا لمس مدھم پڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی...... مجھے بھولنا نہیں...... میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں آپ سے ملوں گی اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں اور......

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ اعصاب تن گئے۔ جسم میں پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک اک آگ سی پھیل گئی۔ جلد ہی ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ قلعے کی فصیل کا وہ حصہ تھا جو مین دروازے کے عین اوپر تھا۔ قریباً بارہ فٹ چوڑی اس فصیل پر حسنات اور اس کے قریبی ساتھیوں نے زبردست مورچا بندی کر رکھی تھی۔ وہ فصیل کے رخنوں میں سے نیچے، اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے دستی بم بھی نیچے پھینکے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ پیٹرول اور ڈیزل بم تھے۔ مٹی کے ہنڈولوں اور شیشے کی بوتلوں میں تیل بھر کر اور ان میں آگ کی بتی رکھ کر نیچے پھینکا جاتا تھا اور آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ کچھ بڑے سائز کی تھری جی ٹاپ گنز بھی یہاں موجود تھیں۔ ان کے عقب میں زرگاں کے ماہر نشانے باز بیٹھے تھے اور ان کے چلائے ہوئے برسٹ حملہ آور فوجیوں کے لئے زبردست مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ میں نے یہاں عورتوں اور نوعمر لڑکوں کو بھی دیکھا۔ وہ لڑنے والے سپاہیوں کی اعانت کر رہے تھے۔ ایمونیشن کی نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ رائفلوں، میگزینز میں گولیاں بھر رہے تھے۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ حسنات کے مشورے سے عمران اور میں نے بھی ایک جگہ پوزیشن سنبھال لی۔ حملہ آوروں کا اجتماع بہت بڑا تھا۔ وہ قلعے کے چاروں طرف چیونٹیوں کی طرح موجود تھے۔ وہ اپنے راکٹ لانچرز کو بار بار قلعے کے دروازے کے سامنے لانے کی کوشش کر رہے تھے اور فصیل پر سے ہونے والی زوردار فائرنگ انہیں اس عمل سے روک رہی تھی۔ اس لڑائی میں جانی نقصان بھی ہو رہا تھا اور زیادہ نقصان حملہ آوروں کا ہی تھا۔ قلعے کے دروازے سے قریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے کئی لاشیں نظر آئیں۔ شعلوں کی سرخ روشنی میں یہ خون آلود لاشیں سنسنی خیز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بارود کا زہریلا دھواں، شعلے...... دھماکے اور للکارے۔ ایک داستانی سا منظر تھا۔

دروازے کے عین سامنے سے قریباً سو ڈیڑھ سو قدم کی دوری پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بکتر بند ٹاپ گاڑی تھی۔ اندازہ ہوا کہ اس گاڑی کے پیچھے ایک ٹریکٹر ٹرالی باندھی گئی ہے اور اس ٹرالی پر دو تین راکٹ لانچر رکھ کر دروازے کی طرف لائے جا رہے ہیں تاکہ مناسب فاصلے اور زاویے سے دروازے کو نشانہ بنایا جا سکے۔ ایک بار پھر فصیل پر موجود نشانے بازوں نے زبردست نشانے لگائے اور گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیئے...... تب یکایک گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی ٹرالی اور راکٹس کو بچانے کے لئے گورے سپاہیوں نے ٹرالی کو پھرتی سے جلتی ہوئی گاڑی سے علیحدہ کیا اور پیچھے لے گئے۔ اس کوشش میں کئی افراد کو گولیاں

لگیں اور ان میں سے تین چار میدان میں ہی کھیت رہے۔ مگر اس ناکام کوشش کے فوراً ہی بعد ایک اور گاڑی حرکت کرتی نظر آنے لگی۔

عمران نے کہا۔ ''یہ لوگ حوصلے میں تو کم ہو سکتے ہیں لیکن تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور باقاعدہ تربیت یافتہ بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر اس دروازے کو بچا نہیں سکیں گے۔''

عمران کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ رائفل کا ایک برسٹ ہمارے بالکل قریب فصیل کے پتھروں سے ٹکرایا۔ بہت سی دھول اور سنگریزے ہمارے اردگرد بکھر گئے۔ حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے فائر کر رہے تھے۔

حسنات احمد ہم سے کچھ فاصلے پر سپاہیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی، وہ جھک کر دوڑ رہا تھا۔ مبادا کوئی آوارہ گولی اس کے مزاج نہ پوچھ جائے۔ اس کے عقب میں ایک اور سپاہی بھی تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ یہ وہ مسلمان سپاہی تھے جو حکم کی فوج میں شامل تھے مگر بغاوت ہونے کے بعد مزاحمت کاروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ ایسے کم و بیش پانچ سو سپاہی اس وقت قلعے کے اندر موجود تھے اور حکم کے خلاف لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔

حسنات نے آ کر مجھے بتایا۔ ''جناب! انگریزوں کی طرف سے ایک ایلچی آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے لایا جائے؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھ کر اس کے تاثرات سے اس کا عندیہ لیا اور حسنات احمد سے کہا کہ اسے لایا جائے۔

دو منٹ بعد ایک انگریز کی صورت نظر آئی۔ وہ لڑائی کے لباس میں تھا لیکن فی الوقت غیر مسلح نظر آ رہا تھا۔ اس لمبے تڑنگے انگریز کے ساتھ ایک درمیانے قد کا انڈین بھی تھا یہ بھی فوجی لباس میں تھا۔ حسنات احمد اور اس کے دو ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب افراد گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے جھک کر چل رہے تھے۔ ہم دونوں ایلچیوں سمیت ایک محفوظ برجی میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

انگریز اور انڈین فوجی نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ انگریز فوجی کا عہدہ کیپٹن کا جبکہ انڈین کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کا تھا۔ انگریز کیپٹن نے انگلش میں کہا۔ ''میرا خیال ہے جناب کہ میں اس وقت قلعے کے کمانڈر سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔''

''کمانڈر انور خاں ہے۔ میں اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم کام کی

بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ جناب اینڈرسن نے آپ کے لئے ایک نامہ ارسال کیا ہے۔ اسے پڑھ لیجئے۔''

اس نے اپنی وردی کے اندر سے خاکی لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا میں نے لفافہ چاک کیا، اس میں ایک خط تھا۔ تاہم خط کے علاوہ بھی ایک چیز تھی۔ اس چیز نے مجھے تھوڑا سا چونکایا مگر میں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میں نے خط نکالا اور عمران سے کہا کہ وہ اسے پڑھے۔ عمران نے حسنات احمد اور دیگر ساتھیوں کے سامنے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ اینڈرسن کی طرف سے تھا اور اردو میں تھا۔ نیچے اینڈرسن کے دستخط تھے اور کمانڈر کی حیثیت سے اس کی مہر بھی لگی تھی۔ اینڈرسن نے لکھا تھا۔

''دوستو! تم نے ہماری طاقت دیکھ لی ہو گی اور یہ بھی جان لیا ہو گا کہ ہمیں ہر صورت قلعے کے اندر داخل ہونا ہے۔ یہ کام ایک دو گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا ہے۔ بہرحال، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خونریز لڑائی ہو گی اور اس میں دونوں طرف سے جانی نقصان ہو گا۔ ہم اس دوطرفہ جانی نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں یہاں جو بھی مرے گا، وہ بھانڈیل کا باشندہ ہو گا۔ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا برٹش، وہ اس دھرتی کا بیٹا ہو گا۔ ہم اسے مزید دکھ سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک معاہدے کے تحت تم لوگ قلعے کے دروازے کھول دو اور عالی جناب حکم جی کے دستوں کو قلعے میں داخل ہونے دو۔ ایسی صورت میں ہماری طرف سے ہر بچے، بوڑھے اور عورت کو جان کی امان دی جائے گی۔ لڑنے والے لوگوں میں سے بھی جنہوں نے کوئی جنگی جرم نہیں کیا، ان کے لئے عام معافی کا اعلان ہو گا۔ کسی بھی مجرم کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اسے عام عدالت میں صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ اس معاہدے کی دیگر شرائط ہم ابھی مل بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے اس خط کا جواب ہمارے ہی ایلچی کے ذریعے دینا چاہتے ہیں تو ہمارا ایلچی انتظار کر لیتا ہے۔''

عمران نے خط ختم کیا تو ہم سب خاموش تھے۔ میں عمران کو لے کر سیڑھیاں اترا اور نیچے ایک خالی کمرے میں آ گیا۔ یہ جگہ زخمیوں کی آمد کے پیشِ نظر خالی کرائی گئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ خاکی لفافہ دکھایا جس میں سے خط برآمد ہوا تھا۔ لفافے کے کاغذ پر اندر کی طرف بھی باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک موٹے سرخ مارکر سے لکھا گیا یہ فقرہ فوراً

پڑھا جاسکتا تھا۔ ''یہ صرف تابش اور عمران صاحب کے لئے۔''
''یہ کیا ہے بھئی؟'' عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔
''یہ خط کے اندر خط ہے جو لفافے کے اندرونی حصے پر لکھا گیا ہے۔''
ہم نے لفافے کو احتیاط سے چاک کیا۔ لفافے نے خط کی شکل اختیار کر لی۔ اس اندرونی خط کو لکھنے والا بھی انگریز کمانڈر مسٹر اینڈرسن ہی تھا۔ اس خط کی انگریزی تحریر کچھ یوں تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ تم دونوں کے اردگرد کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جن کے سامنے مجھے پوری بات نہیں لکھنی چاہئے۔ اس لئے اس دوسرے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہمارے درمیان پہلے بھی دوستی کا رشتہ رہا ہے۔ یہ دوستی یقیناً ہم سب کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی مگر ایک اچانک حادثے کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمیں محترمہ ماریا سے اور تمہیں ہلطانہ بی بی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہرحال، اب ہمیں ماضی کو بھول کر آگے دیکھنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں، قاسمیہ کے اہم کمان داروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور قلعے کے دروازے کھول کر خون خرابے کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ اور تم دونوں کو یہ کردار ادا کرنا بھی چاہئے۔ میں کرنل اینڈرسن...... عالی جناب محترم ''وشوا ناتھ حکم جی'' کی طرف سے تم دونوں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا کردار ادا کرو تو تمہارے اس عمل کی ''قدر'' تمہاری توقع سے بڑھ کر کی جائے گی۔ تم بھانڈیل اسٹیٹ میں رہنا چاہو یا بھانڈیل اسٹیٹ سے جانا چاہو، دونوں صورتوں میں تمہیں سہولت دی جائے گی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہمارے دوست تاحیات ہماری دوستی پر ناز کر سکیں......

جواب کا منتظر
خیر اندیش اینڈرسن''

خط پڑھنے کے بعد عمران نے دانت پیسے۔ ''سن آف اے بچ۔''
میں نے گہری سانس لے کر لفافہ تہ کیا اور اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ عمران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ خود میرے اندر بھی نفرت کی نئی لہر ابھر آئی تھی۔
عمران پھنکارا۔ ''یہ سفید کتا! ہمیں بکاؤ مال سمجھتا ہے...... ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے ہمیں بے غیرتی کے بازار میں، ہوس کے سکوں کے عوض بکنے کی پیشکش کی ہے اور...... میرا خیال ہے کہ یہ آج کی بات نہیں، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ان سفید بندروں نے ہمارے خطے پر دوسو سال حکومت کی ہے تو اسی مکاری کے زور پر کی ہے۔ انہوں نے ہمیں تقسیم کیا ہے۔

ہمارے اندر سے غدار ڈھونڈے ہیں اور پھر ہمارے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''سچ کہتے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس کے ذریعے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ خط میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہے۔''
''اس سفید بندر نے ہمارے سامنے ہڈی پھینکنے کی جو ناکام کوشش کی ہے، اس کا مطلب سمجھ رہے ہو نا تم...... تمہیں سہولت دی جائے گی۔ یعنی اگر ہم اسٹیٹ میں رہنا چاہیں تو ہمیں ہز ہائی نس کی طرف سے کوئی جاگیر شاگیر عطا فرمائی جائے گی اور اگر ہم اپنے ملک واپس جانا چاہیں تو شاید ہمیں زر و جواہر میں تول کر سب کچھ ہمارے حوالے فرما دیا جائے۔ لعنت...... ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک دفعہ لعنت۔'' اس نے خستہ دیوار پر تھوکا۔
''تمہارے خیال میں اس تاریخی خط کا جواب کیا ہونا چاہئے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔
''تم بتاؤ۔''
''چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں...... بلکہ لکھ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور عمران کی جیب میں سے قلم نکال لیا۔
باہر جنگی نعروں کی گونج تھی۔ دھماکوں کا شور تھا اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ، شاید یہ 1857ء کی ہی ایک جھلک تھی۔ انگریزوں اور سکھوں کی فوجیں دہلی کے لال قلعے کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک آخری ضرب لگانے کے لئے صفیں باندھ رہی تھیں اور ہتھیار تول رہی تھیں۔ میں نے تہ شدہ خط جیب سے نکالا۔ اسے کھولا اور اس کی پشت پر لکھ دیا۔ ''تم پر لعنت...... یہ انیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے۔ اس دفعہ نہیں اینڈرسن...... اس دفعہ نہیں۔''
یہ فقرہ لکھنے میں مجھے اتنا مزہ آیا جو شاید ہزارہا الفاظ پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھنے میں بھی نہ آتا۔ میں سرتاپا ایک عجیب سے اطمینان اور ولولے سے بھر گیا مجھے لگا اب جیت یا ہار...... زندگی یا موت کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل فتح یہی ہے کہ اکڑی ہوئی گردنوں والے ان شیطانوں سے پوری توانائی کے ساتھ لڑا جائے اور آخری سانس تک لڑا جائے۔
عمران نے بھی میرے فقرے کو سراہا۔ ہم نے یہ جواب انگریز ایلچی اور اس کے ہندو ساتھی کے حوالے کیا اور انہیں بحفاظت واپس بھیج دیا۔
ہم دوبارہ فصیل پر پہنچے۔ لڑائی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایلچی کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی انگریز اور مقامی حملہ آوروں نے قلعے پر ایک اور زوردار حملہ کر دیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ حملہ اس جواب کا نتیجہ ہے جو ہم نے بھینسے کے چہرے والے غصیلے اینڈرسن کو دیا ہے۔ اس کی غرور سے تنی ہوئی گردن، اس کی نیلی آنکھوں میں چھپی حقارت، اس کا طنزیہ لہجہ، سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ مجھے وہ جارج گورا ہی کی طرح قابلِ نفرت محسوس ہوا۔ جی چاہا وہ میرے سامنے ہو، میں اسے مار ڈالوں یا وہ مجھے مار ڈالے۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو وہی تھا۔

اسی دوران میں ہمیں یہ پریشان کن اطلاع ملی کہ مشرقی جانب سے مدِمقابل سپاہیوں کے دو دستے فصیل پر چڑھ آئے ہیں...... اور وہاں زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر اس جگہ تک پہنچ سکتے۔ مبارک علی اپنے بہترین ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور حسنات کو یقین تھا کہ وہ آسانی سے اینڈرسن کے ہرکاروں کو آگے نہیں آنے دے گا۔

فصیل پر ایک بڑی ٹیلی اسکوپ بھی موجود تھی۔ یہ گوروں سے چھینی ہوئی وہی ٹیلی اسکوپ تھی جس میں سے ہم نے مالا کی دادی ساس یعنی بڑی ماتا کو دھرم شالا کے مینارے پر پوجا کرتے دیکھا تھا۔ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگا رکھی تھیں اور اسے اسٹینڈ پر اِدھر اُدھر حرکت دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹیلی اسکوپ کو ایک جگہ فوکس کیا اور پھر مجھے اس میں دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ مجھے فصیل کے اس حصے کا منظر دکھائی دیا جہاں سے ہمارے ''مدِمقابل'' اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہاں واقعی زوردار لڑائی ہو رہی تھی۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ لاتعداد مشعلوں اور گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ فصیل پر دو جگہ بھڑکتی ہوئی آگ نے بھی اردگرد کے منظر کو روشنی فراہم کر رکھی تھی۔

''کچھ نظر آیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''کیا؟''

''چوکور برجی پر سے جو دو بندے فائرنگ کر رہے ہیں، ان میں سے ایک بھرت ہے۔''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ وہ بھرت ہی تھا۔ اس کا گلابی دھاری دار سویٹر اتنی دوری سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان گورے سپاہیوں کا بھرپور مقابلہ کر رہا تھا جو فصیل پر چڑھ آئے تھے اور اپنی پوزیشن پکی کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ یہاں کسی بھی وقت......'' ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے بھرت کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ دھاری دار سویٹر برجی کی آٹھ

دس سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا فصیل پر گرا۔ ''اوہ گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسے گولی لگ گئی۔'' میں نے کہا اور عمران کو دیکھنے کی دعوت دی۔

عمران نے اپنی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگائیں اور وہ بھی سکتہ زدہ رہ گیا۔ گیتا مکھی اور ڈاکٹر چوہان کی طرح بھرت کمار بھی اس لڑائی کا ایندھن بن چکا تھا؟ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائے لگائے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، یہ زخمی ہو لیکن بڑی خطرناک جگہ پر گرا پڑا ہے۔ یہاں کسی بھی وقت مزید گولیاں اسے لگ سکتی ہیں۔''

میں نے عمران کو پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھرت کھلی جگہ پر پڑا تھا، یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا...... سچویشن ایسی تھی کہ کوئی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک طرف سے ایک لڑکی جھک کر بھاگتی ہوئی آئی اور بھرت کے جسم کو ڈھال فراہم کرنے کے لئے اس کے اوپر جا گری۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شکل دیکھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہے...... یقیناً وہ چمپی تھی۔ وہ جو محبت کرتی تھی...... اور جو پوجا کرتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کی طرف آنے والی موت اپنے جسم پر سہنے کے لئے اس کے اوپر گری ہوئی تھی۔ اسے اپنے جسم سے ڈھانپے ہوئے تھی یہ وہ نیچ ذات کی ادنیٰ خادمہ تھی جس کا سایہ بھی اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھرشٹ کرتا تھا۔ لیکن یہ نیچ ذات، کمی کمین لڑکی اپنی نقد جان لے کر اپنے محبوب کی موت کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔

میں نے عمران کو یہ منظر دکھایا۔ وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ اس جگہ اردگرد یقیناً ہمارے سپاہی موجود تھے لیکن وہ لڑائی میں اس بری طرح انگیج تھے کہ چند لمحوں کے لئے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور بھرت اور چمپی موت کی زد میں تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اور ''پیار کہانی'' فرشتہ اجل کے نشانے پر تھی۔ ہم بے چین ہونے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

تب عمران چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر تک نگاہیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے چپکائے رکھیں۔ پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا...... منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ چمپی کے ساتھ ایک اور لڑکی آ گئی تھی۔ وہ دونوں بھرت کمار کے مردہ یا بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر دوطرفہ فائرنگ کی زد سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جھکی ہوئی تھیں اور بھرت کو بازوؤں سے گھسیٹ رہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ دوسری لڑکی ''بڑی ماتا'' کی پوتی بہو مالا تھی۔ میں نے اسے اس کے لباس اور بالوں سے پہچانا۔ وہی روشن دماغ لڑکی

جو ایک کٹر برہمن گھرانے کی بہو ہونے کے باوجود اپنے سینے میں ایک گداز اور انسان دوست دل رکھتی تھی۔ کڑے پہرے بھی جس کی سوچوں کو زنجیریں نہیں پہنا سکے تھے۔ اب وہ اپنے شوہر سمیت اس تہلکہ خیز مزاحمت کا حصہ تھی جو حکم اور اینڈرسن کے خلاف کی جارہی تھی۔
دونوں لڑکیاں دیوانہ وار لگی رہیں اور بھرت کو گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئیں۔

"کیا بنا؟" عمران نے اپنی "ایم 16" رائفل سے نیچے فائر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اسے لے گئیں۔" میں نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

"زبردست...... کاش میرے پاس کیمرا ہوتا۔"

ایک گولی عمران کے سر کے عین اوپر سے سیٹی بجاتی گزر گئی اور اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کچھ اور نیچے جھکنا پڑا۔ اب فصیل کے اوپر سے بھی فائر آرہا تھا...... اور یہ فائر یقیناً اینڈرسن کے ان دستوں کی طرف سے تھا جو مشرقی جانب فصیل کے اوپر جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ہماری ٹیلی اسکوپ کے عین اوپر سے بھی مختلف "کیلیبر" کی گولیاں سرلائے مارتی گزر رہی تھیں۔ موت سامنے تھی اور اس کی حقیقت اور دہشت اپنی اہمیت کھوتی جارہی تھی۔

میں نے دوربینی جائزہ جاری رکھا۔ بھرت کا جسم خطرناک رینج سے ہٹایا جاچکا تھا۔ وہاں اب بارش کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔ اینڈرسن کے باوردی سپاہی اب کچھ اور آگے آگئے تھے...... ایک جگہ فصیل پر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ دفعتاً میں نے دفاع کرنے والوں کی مزاحمت میں شدت محسوس کی۔ میں نے ایک بار پھر نوعمر طلال کو دیکھا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں ہم نے دو روز پہلے اسے پھانسی گھاٹ پر دیکھا تھا۔ جب بھرت اور انور خاں سمیت کم وبیش پندرہ افراد کو دردناک طریقے سے سولی چڑھایا جانے والا تھا۔ طلال اور اس کے نڈر دوست، عقابوں کی طرح حکم کے سپاہیوں پر جھپٹے تھے اور ان کی اس خونریز جھپٹ نے ہزاروں کے مردہ ہجوم کو زندہ کر دیا تھا۔

سلطانہ کا یہ چہیتا راجپوت بھانجا آج پھر اسی دلیری اور ولولے کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں یقیناً اس کی برادری کے جاں نثار ساتھی تھے۔ ان کی رائفلوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں صرف دیکھ سکتا تھا، مجھے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا...... وہ لوگ اپنی جگہ سے نکلے اور نعرے بلند کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ گھمسان کی لڑائی میں یہ جارحانہ انداز سمجھا جاتا ہے۔ عسکری زبان میں اسے "چارج کرنا" کہتے ہیں اس میں حملہ آوروں کی Casualties تو ہوتی ہیں لیکن دشمن پر دھاک بیٹھ جاتی ہے یہاں بھی

حملہ آوروں کو گولیاں لگیں اور وہ گرے بھی مگر وہ آناً فاناً گوروں اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں دست بدست لڑائی شروع ہوئی دستی بموں کے دھماکوں سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میری نظر کا راستہ مسدود ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "عمران! وہاں بہت سخت جھڑپ ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں مدد پہنچانی چاہیے۔"

تقریباً تین چار منٹ بعد ہم نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ اب فصیل کے اس حصے سے گہرا دھواں چھٹ گیا تھا اور صورتِ حال کی تھوڑی بہت جھلک نظر آرہی تھی۔ یوں لگا کہ طلال اور اس کے ساتھی اوپر چڑھ آنے والے دستوں کو کافی حد تک پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یقیناً پیچھے ہٹنے اور پسپا ہونے والوں میں سے بہت سے نیچے بھی گرے ہوں گے۔ زوردار فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ طلال اور اس کے ساتھیوں نے اب کافی آگے جاکر پوزیشنیں لے لی ہیں......

اسے اطمینان بخش صورتِ حال کہا جاسکتا تھا، تاہم یہ اطمینان تادیر برقرار نہیں رہا۔ بہت جلد پھر سے فصیل کے اس حصے پر گورے اور مقامی سپاہیوں کا اجتماع ہوگیا۔ دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔

عمران نے حسنات سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنا ہوگا۔ وہاں اپنی تعداد میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔"

"وہاں پہنچنا ہی تو مشکل ہے جی۔ مجھے اس کے لیے پہلے راستہ بنانا پڑے گا۔"

"تو پھر بنواؤ راستہ...... یہ ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

حسنات احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے فصیل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں ایمونیشن میں آگ لگنے کی وجہ سے مسلسل شعلے بھڑک رہے تھے اور راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

دل میں بار بار خیال آرہا تھا کہ کہیں ہم نے غلط فیصلہ تو نہیں کرلیا؟ کیا ہمیں اینڈرسن کی پیشکش پر مزید غور کرلینا چاہئے تھا؟ قلعے کی حفاظت کب تک کی جاسکے گی اور اگر اینڈرسن اور حکم کے دستے قلعے میں گھسنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر کیا صورتِ حال ہوگی؟ یہاں قاسمیہ کی بے شمار عورتیں اور بچے موجود تھے۔ فتح اور شراب کے نشے میں چُور سپاہی، خاص طور سے ہندو سپاہی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے بلند فصیل کے کنگروں کے اوپر سے دورتاریکی میں نظر دوڑائی۔ ایک دم یوں لگا میرے جسم کا سارا لہو میری بصارت میں سمٹ

آیا ہے۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے بہت آگے گہری تیرگی میں مجھے ایک روشن لکیر سی نظر آئی۔ یہ لکیر یہاں پہلے نہیں تھی...... یہ کیا تھا؟

میں نے لرزتے ہاتھوں سے آہنی اسٹینڈ پر وزنی ٹیلی اسکوپ کو گھمایا اور اسے اس روشن لکیر پر فوکس کرنے کی کوشش کی جو شمالی افق پر نمودار ہوئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کامیاب ہو گیا...... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہزاروں مشعلیں تھیں جو تیز رفتاری سے زرگاں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ وہ ''کمک'' تھی جس کا انتظار کرتے کرتے زرگاں کے باسیوں نے کئی برس گزار دیئے تھے...... یہ نل پانی کی سربکف فوج تھی اور اس کی قیادت یقیناً مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کر رہے تھے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب مصیبت میں گھرے ہوئے شخص کو اپنے دوستوں کی پکار سنائی دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ''ہمت نہ ہارو'' ہم آرہے ہیں، تو اس شخص کے اندر سے ہی اتنی توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی ''مصیبت'' کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ میں نے اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور یہ ایک یادگار کیفیت تھی۔ میں نے لرزاں آواز میں عمران سے کہا۔ ''عمران! وہ آگئے ہیں۔''

''کون؟'' اس نے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''خود دیکھو۔'' میں نے اسے ٹیلی اسکوپ کی طرف بلایا۔

اس نے میگزین کے آخری دو فائر کئے اور جھک کر ٹیلی اسکوپ کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا اور وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ ''زبردست۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا......

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی تعداد میں ہیں...... اور ابھی کچھ فاصلے پر ہیں۔ ہم بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ پا رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد عمران نے ٹیلی اسکوپ سے نگاہ ہٹائی اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا تابی! وہ ضرور آئیں گے۔ انہیں حرکت میں لانے کے لئے جس ڈنکے کی ضرورت تھی، وہ ڈنکا ہم نے یہاں بجا دیا تھا...... ڈنکے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تابی......''

O......❖......O

اس سے آگے کا احوال تفصیلات سے لکھا جائے تو اس کے لئے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔ وہ ایک خوں ریز لڑائی تھی۔ غالباً اینڈرسن کے دستوں کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ جب فتح کے قریب پہنچ چکے ہوں گے، اچانک ان پر عقب سے یلغار ہو جائے گی۔ درحقیقت چھوٹے سرکار اجیت رائے اور مراد شاہ بالکل درست وقت پر پہنچے تھے۔ وہ کم وبیش چار ہزار

سپاہیوں کے ساتھ ایک سیلاب کی طرح زرگاں میں داخل ہوئے اور بلاتوقف اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ قلعے کے اندر سے ہمارے جنگجوؤں نے بھی زوردار حملہ کیا۔ انور خاں بالائی منزل کی کھڑکی سے یہ سارا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رائے دی کہ اب قلعے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور باہر نکل کر گوروں پر ہلا بولا جائے۔

انور خاں کا یہ پیغام میرے ذریعے حسنات اور مبارک علی وغیرہ تک پہنچا۔ پھر چار پانچ منٹ کے اندر قلعے میں موجود ہزاروں پُرجوش سپاہیوں تک پہنچ گیا۔ قلعے کے دو دروازے کھول دیئے گئے۔ حسنات، مبارک اور دوسرے کمان داروں کی قیادت میں مسلمان سپاہی اور جنگجو بلائے ناگہانی کی طرح اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ اینڈرسن کی فوج بلاشبہ زبردست تربیت یافتہ تھی۔ ان کے پاس بہترین اسلحہ بھی موجود تھا، مگر جب وہ دوطرفہ حملے کی زد میں آئی تو اس گندم کی طرح پس گئی جو چکی کے پاٹوں کے درمیان آتی ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے زیادہ حصہ نہیں لیا۔ ہمیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ درحقیقت ہم اپنے کرنے والا کام کر چکے تھے۔ ہم نے حسنات، مبارک علی اور طلال جیسے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر وہ طبل، بجا دیا تھا جس کی گونج پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں پھیلی تھی۔ مردہ ساعتیں زندہ ہوتی تھیں اور لوگوں نے بدمست فرماں رواؤں کے لئے اس یوم کو یوم حساب بنا دیا تھا۔

اصل اور فیصلہ کن لڑائی قریباً ایک گھنٹا ہی جاری رہ سکی۔ اس میں خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ ظاہر ہے کہ زیادہ نقصان اینڈرسن اور حکم کے وفاداروں کا تھا۔ قلعے کے سامنے اور قاسمیہ کے گلی کوچوں میں ہر طرف گورے اور مقامی سپاہیوں کی لاشیں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ گورے سپاہیوں اور افسروں کی لاشیں نفرت اور انتقام کا نشانہ بنیں۔ انہیں تاراج کیا گیا اور گھسیٹا گیا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے اور لاتعداد افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اب مسلح سپاہیوں اور عام لوگوں نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ایک حصہ مراد شاہ اور حسنات وغیرہ کی قیادت میں بھگوڑے فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہوا، دوسرا زرگاں کے عظیم الشان راج بھون کی طرف بڑھنے لگا۔ وہی راج بھون جو دورِ قدیم کے شاہی محلات سے کہیں زیادہ شان وشوکت، دبدبہ اور رنگینی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ یہاں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ یہاں پریوں کے جمگھٹے تھے اور رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی، راجا اِندر کی طرح یہاں دادِ عیش دیتا تھا۔ اس ''راجا اِندر'' کے حواری وہی جارج گورا، سرجن اسٹیل، اینڈرسن اور منیارڈ جیسے لوگ تھے۔

میں اور عمران بھی اس نعرہ زن ہجوم کا حصہ تھے جو راج بھون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راج

بھون کے سامنے پہنچ کر مسلح دستے اور عام لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے راج بھون کو گھیر لیا تھا۔ یہاں بمشکل ڈیڑھ دو سو گارڈز ہوں گے یا پھر حکم کا خاص محافظ دستہ تھا جس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ کتنی بھی جاں نثاری دکھاتے، ان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ حکم کا دفاع کر سکتے۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ مبارک علی تھا۔ اس نے کہا۔ ''جناب! آپ کو چھوٹے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں جیپ میں بیٹھے ہیں۔'' مبارک علی نے بتایا۔

میں اور عمران لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس گرد آلود لینڈ روور جیپ تک پہنچے جس پر ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا اور مسلح گارڈز نے جسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میں اور عمران موقع پر پہنچے تو چھوٹے سرکار جیپ سے اتر آئے۔ وہ شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ نل پانی میں ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی لیکن آج وہ پہلی بار فوجی وردی میں تھے اور ان کے جسم پر اسلحہ سجا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معانقہ کیا پھر عمران سے ہاتھ ملایا۔ میں نے عمران کا تعارف کرایا تو پھر اس سے بھی ''شاہی معانقہ'' ہوا۔ چھوٹے سرکار کے ذاتی گارڈز نے مجھے باقاعدہ سیلیوٹ کیا۔ اس سیلیوٹ کو دیکھ کر عمران نے بہت برا سا منہ بنایا اور مجھے سرگوشی میں مخاطب کر کے بولا۔ ''زیادہ بانس پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح جہانگیر کی کامیابیوں کے پیچھے نور جہاں کا ہاتھ تھا، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔''

ہمیں بڑے اہتمام کے ساتھ اس شاہی جیپ میں سوار کیا گیا۔ چھوٹے سرکار نے سب سے پہلے مجھ سے انور خاں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔ ''انور خاں زخمی ہے جناب...... لیکن خطرے سے باہر ہے۔ وہ اس وقت قلعے میں ہے۔''

''بھگوان کا شکر ہے۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔ ان کی اونچی ناک کا بانسہ کامیابی کی خوشی میں ہمیشہ سے زیادہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''ہم جانت ہیں، اس سمے یہاں تمہاری حیثیت ایک کمان دار کی ہے۔ لوگن تمہارے اشاروں پر چل رہے ہیں...... بلکہ شاید تم دونوں کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔'' چھوٹے سرکار نے آخری الفاظ عمران کی طرف دیکھ کر کہے۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں عمران نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔''

''ہاں، ہمیں بہت سی جانکاریاں ملی ہیں۔ بہرحال، ان تفصیلی باتوں کے لئے سے

چاہئے۔ اب ہم نے تمہیں ایک خاص بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔''

''جی فرمایئے۔''

''لوگن راج بھون میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم چاہت ہیں کہ صرف خاص لوگن ہی اندر داخل ہوں اور اگر بھائی صاحب واقعی اندر موجود ہیں تو ان کو زندہ گرفتار کیا جاوے...... اور ان کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہ ہو۔''

میں نے چونک کر چھوٹے سرکار اجیت رائے کی طرف دیکھا۔ بڑے بھائی حکم کی طرف سے چھوٹے بھائی پر کیا ظلم روا نہیں رکھا گیا تھا۔ ناانصافی اور نفرت کی حد کر دی گئی تھی لیکن اس کے دل میں پھر بھی کسی نہ کسی درجے میں بھائی کا احترام موجود تھا۔ یہ اس چھوٹے بھائی کے بڑے پن کی نشانی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ جو حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا چھوٹے سرکار! اب آپ آ گئے...... ہیں جناب! اب میں، عمران یا انور خاں کچھ نہیں ہیں اب جو کچھ ہیں آپ ہیں۔''

چھوٹے سرکار نے میرا کندھا تھپکا۔

...... کچھ دیر بعد میں راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے ایک جیپ کی چھت پر موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک لاؤڈ اسپیکر تھا۔ میں نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ چھوٹے سرکار کے حکم کے مطابق سب لوگ راج بھون کے سامنے سے ہٹ کر کم از کم دو سو گز پیچھے چلے جائیں...... راج بھون کا صرف ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس دروازے میں سے بھی صرف ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوگا جس کی کمان میں خود کروں گا۔

میں نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے اور پھر معقول حد تک پیچھے چلے گئے۔ میں، عمران اور مبارک علی کمانڈوز کی تین ٹولیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ہم نے میگا فونز پر بار بار وارننگ دی کہ راج بھون کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور کسی طرح کی مزاحمت بیکار ہے۔ لہٰذا اندر موجود گارڈز فائر نہ کریں اور خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔ حکم سے بھی کہا گیا کہ وہ باہر نکل آئے اور اپنی گرفتاری پیش کر دے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ ہم راج بھون کے وسیع و عریض احاطے سے گزر کر اس شاندار شاہی بالکونی کے سامنے پہنچے جہاں چند ہفتے پہلے حکم کی چہیتی بیوی رتنا دیوی کے ہاں بچے کی ولادت کی خوشی منائی گئی تھی اور حکم نے مٹھیاں بھر بھر کے نیچے کھڑے لوگوں پر سونا چاندی نچھاور کیا تھا۔ آج یہ بالکونی سنسان پڑی تھی مگر بالکل سنسان بھی نہیں تھی۔ یہاں شاہی گارڈز کی پوزیشنیں موجود تھیں۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہماری

طرف سے بھی بھر پور جواب دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر بالکونی خاموش ہو گئی اور وہاں آگ بھڑک اٹھی۔

ہم راج بھون کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ مزاحم گارڈز کو شوٹ کر دیا گیا اور باقی کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ درجنوں ملازماؤں، خواجہ سراؤں اور خوب صورت لڑکیوں نے محل کے اندرونی حصوں سے نکل کر خود کو ہماری حفاظت میں دیا۔ مرد خادموں کی تعداد بھی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی۔ حکم اور اس کی بیوی رتنا کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں پہنچ کر ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ قالین پر خواتین اور بچوں کی کم و بیش بیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان لوگوں پر اندھا دھند مشین گن کے برسٹ چلائے گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور تھے۔ دیواروں اور فرنیچر وغیرہ پر گولیوں کے اَن گنت نشان دکھائی دے رہے تھے۔ مرنے والے بچوں کی عمریں تقریباً پندرہ اور دو تین سال کے درمیان تھیں۔

مبارک علی نے کہا۔ ''یہ حکم کے اہلِ خانہ ہیں جی۔ یہ اس کی تینوں رانیاں ہیں۔ یہ بچے ہیں۔ یہ بچوں کی بڑی پھوپی ہے...... یہ شاید چھوٹی ہے......'' مبارک بتا رہا تھا اور ہم حیران کھڑے تھے۔ رعایا کی عزت آبرو کو کھلونا سمجھنے والے لوگ اپنی آن عزت کے حوالے سے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ جب یوم حساب آتا ہے اور انہیں اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ مکافاتِ عمل کی وجہ سے ان کی اپنی عزت پر حرف آئے گا تو وہ خود سے وابستہ خواتین اور دیگر لوگوں کو بیدردی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔

مبارک علی اور دو دیگر افسر الٹ پلٹ کر خونچکاں لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ مبارک علی نے ایک کونے میں پڑی اکٹھی چار لاشوں کو دیکھ کر بتایا۔ ''یہ اس آخری جشن والی پریاں ہیں۔ لگتا ہے کہ حکم جی نے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔''

خوب صورت لڑکیاں، نو دمیدہ کلیوں جیسے چہرے، خوش گول، خوش اندام و خوش اطوار۔ انہیں حکم اور اس کے حواریوں کی راتوں کو رنگین کرنے کے لیے سخت ترین تربیت اور آزمائشوں سے گزارا گیا تھا۔ نہ جانے یہ کن کن آنگنوں سے یہاں لائی گئی تھیں؟ کن کن آنکھوں کا نور تھیں؟ ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی لیکن وہ مری پڑی تھیں...... فراعین مصر کی طرح حکم نے اپنی ان جواں سال کنیزوں کو اپنے انجام کے مقبرے میں زندہ دفن کرنے کی رسم نبھائی تھی۔

''ان میں رتنا دیوی بھی ہے؟'' میں نے مبارک سے پوچھا۔

''ناہیں جی۔ وہ کہیں نظر ناہیں آ رہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ان لوگوں کو آدھ پون گھنٹے پہلے مارا گیا ہے۔'' مبارک کے ساتھی افسروں نے اس کی تائید کی۔

ہم دیگر کمروں کی طرف بڑھے۔ دروازے توڑ کر حکم کے پُرشکوہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ یہ بیڈ روم جدید اور قدیم طرزِ آرائش کا شاندار نمونہ تھا جدید ترین بستر، قیمتی شرابوں سے بھرا ہوا اور خودکار طور پر گھومنے والا ''بار''...... آڈیو اور ویڈیو سسٹم، گھوڑا گاڑیوں اور لالٹینوں والے اس شہر میں جو کچھ بھی تھا مگر اس بیڈ روم میں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں پہنچ کر ہمیں پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ شاید حکم یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔ ہماری نگاہیں ایک بھاری بھرکم خفیہ سیف کے ادھ کھلے دروازے پر پڑیں۔ وہاں اب بھی دو چار مرصع طلائی زیور اور قیمتی پتھر موجود تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ حکم نے اس سیف کا قیمتی ساز و سامان افراتفری میں نکالا ہے اور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

ہمارے ساتھ آنے والے قریباً ڈیڑھ سو مسلح کمانڈوز راج بھون میں چاروں طرف پھیل گئے اور اہم افراد کی تلاش شروع ہوئی۔ میں اور عمران کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اس وسیع و عریض عشرت کدے میں پہنچے جہاں ساتویں کا جشن اپنے کلائمیکس پر پہنچا تھا...... وہی آبشار جو ایک بلوری تالاب میں گرتا تھا۔ جس کی چاروں جانب شاندار نشستیں تھیں اور دن میں بھی رات کا سماں نظر آتا تھا۔ عشرت کدے کی گنبد نما چھت تاریک آسمان کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور اس پر چاند تارے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ بہرحال، فی الوقت یہ سب کچھ نہیں تھا۔ ایک عجیب سی اداسی اور خاموشی نے در و دیوار کو گھیرا ہوا تھا۔ آبشار بند تھی، وہ تالاب جس میں سنہری شراب چمکتی تھی، خالی پڑا تھا...... پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبنے ابھرنے والی عریاں مورتی بھی بے حرکت تھی۔

''یہ دیکھو تابی!'' عمران نے میری توجہ ایک گوشے کی طرف دلائی۔

ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے جسم نیلے پڑ کر اکڑ گئے تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ اذیت جھیل کر مری ہیں۔

ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی مبارک بولا۔ ''ان بے چاریوں کو یقیناً درد کا ٹیکا لگایا گیا ہے جی۔ یہ ڈبل ٹیکا بندے کی جان لے لیوت ہے۔''

پھر اس نے ایک لڑکی کے عریاں بازو پر ٹیکے کے دو تازہ نشان دریافت کر لئے...... لڑکیوں کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مری تھیں۔ ان کی ایڑیوں

سے خون رس رہا تھا۔ جان کنی کی بے پناہ اذیت ان کے خوبرو چہروں پر یوں نقش ہو گئی تھی کہ دیکھنے والی نگاہ کانپ جاتی تھی۔

مبارک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹے پہلے ان لڑکیوں کو کسی جرم کی سزا دی گئی ہے۔ شاید ان پر مخبری وغیرہ کا شبہ ہو۔''

اچانک ایک دروازہ کھلا اور میں میڈم صفورا کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا...... اس نے خود کو ''ہینڈز اپ'' کر رکھا تھا۔ اس کے عقب میں آٹھ دس سہمی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ انہوں نے میڈم کے پیچھے خود کو یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے وہ ان کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی ہو۔

مجھے اور عمران کو پہچاننے کے بعد میڈم نے ہاتھ نیچے گرا دیئے اور آگے بڑھ آئی۔ وہ ہم سے گلے ملی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی نمی دیکھی۔ اس نے کہا۔ ''ہم نے اپنی لائف بڑی مشکل سے بچائی ہے۔ حکم نے اپنے بہت سے گھر والوں اور خدمت کرنے والی لڑکیوں کو مار دیا ہے۔ میں ان لڑکیوں کو لے کر یہاں اس سٹور میں چھپ گئی تھی۔ حکم اور کرنل اینڈرسن کے ذاتی گارڈز یہیں آس پاس سرچ کرتے رہے۔ پھر چلے گئے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کسی طرح یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''اینڈرسن بھی ساتھ تھا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ جب حکم نے اپنے فیملی ممبرز کو گولیاں ماریں تو اینڈرسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم نے اسٹور روم کے پاس بھی اس کے گرجنے برسنے کی آوازیں سنیں۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ کے خیال میں راج بھون میں کوئی ایسی جگہ جہاں وہ چھپ سکتا ہو؟''

''آپ لوگوں نے لیبارٹری کا ایریا دیکھ لیا ہے؟'' میڈم نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔ میڈم نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم نے خوف زدہ لڑکیوں کو مبارک علی کی حفاظت میں دیا اور خود میڈم کے ساتھ لیبارٹری کی طرف بڑھے۔

ایک کوریڈور میں ہمیں ایک اور لڑکی کی نیلگوں لاش نظر آئی۔ شدید اذیت کے سبب اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ اس بری طرح تڑپی پھڑکی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔

میڈم نے کہا۔ ''حکم نے اپنے پانچ ملازموں کو زہر والا ٹیکا لگوایا ہے۔ یہ گرین رنگ کا

وہی Pain Giving Injection ہے جو جسم میں شدید ترین تکلیف پیدا کرتا ہے۔ ان پانچ ملازموں میں سے چار لڑکیاں تھیں اور ایک خواجہ سرا۔ ان کے بارے میں حکم کو شک تھا کہ انہوں نے باغیوں سے رابطہ رکھا ہوا ہے اور راج بھون کی نیوز باہر دے رہے ہیں۔''

ایک سپاہی نے لڑکی کی اکڑی ہوئی لاش پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ ہم ایک سلائڈنگ دروازے کو کھول کر سرجن اسٹیل کی وسیع لیبارٹری میں داخل ہوئے۔ اس لیبارٹری کے تین چار پورشن تھے۔ یہاں جدید ساز و سامان موجود تھا۔ وہ تمام ''شعبدے'' یہیں پر تخلیق پاتے تھے جو بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے۔

ہم نے چار درجن مسلح کمانڈوز کے ساتھ مل کر اس لیبارٹری کا چپا چپا چھان مارا مگر حکم، رتنا دیوی یا اینڈرسن کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس لیبارٹری کو کھنگالنے کے دوران میں ہم نے کئی اہم چیزیں دیکھیں۔ ہمیں وہ خاص الیکٹرانک چپس اور ان کے سگنلز وصول کرنے والے انٹیناز بھی نظر آئے۔ اس سبز رنگ کی دوا کے درجنوں وائلز بھی جن سے درد کا انجکشن تیار ہوتا تھا۔ زہریلی گیس، اعصاب شل کرنے والی گیس، طاقت بخش ادویات اور اس طرح کی نہ جانے کتنی اشیاء یہاں موجود تھیں۔

میڈم صفورا مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گئی۔ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ ''حکم اور اینڈرسن یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ کہیں بھی چلے جائیں، ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے وہ اپنے قیدیوں کو ڈھونڈ لیتے تھے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''میں نے حکم کا طریقہ اسی پر الٹ دیا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''حکم جہاں بھی ہے، اپنے ساتھ ایک الیکٹرانک چپ لے کر گھوم رہا ہے۔ ہم انٹیناز کے ذریعے اس کا سگنل وصول کر سکتے ہیں۔''

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی...... ''چپ کیسے رکھی آپ نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''آخری وقت میں مجھے شک ہو گیا تھا کہ حکم اپنی وائف کے ساتھ یہاں سے بھاگنا چاہ رہا ہے۔ یہاں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میں یہاں لیبارٹری میں آئی اور یہاں سے دو الیکٹرانک چپس نکال لیں۔ ان کے نمبر میرے پاس نوٹ ہیں۔ ان میں سے ایک چپ میں نے اس سفری بیگ میں ڈال دی جو حکم کے کمرے میں تیار

رکھا تھا......"

اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو یہ زبردست بات تھی۔ میڈم صفورا کی فہم وفراست اور معاملہ فہمی پر ہمیں بھی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہر طرح کے ماحول میں جینے کی راہیں نکال سکتی تھی اور پیچیدہ گرہیں اپنے ناخنِ تدبیر سے کھول لیتی تھی۔

عمران نے پوچھا۔ "ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ چپ ہماری مدد کرسکتی ہے؟"

میڈم نے ہم سے صرف پانچ منٹ مانگے۔ وہ جن لڑکیوں کے ساتھ چیمبر کے اسٹور روم میں چھپی ہوئی تھی، ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ لڑکی سرجن اسٹیل کی اسسٹنٹس میں سے ایک ہے۔ میڈم صفورا نے چند منٹ کے اندر ایسے دو انٹیناز ڈھونڈ لئے جو اس خاص چپ کو ٹریپ کرسکتے تھے جو حکم کے سفری بیگ میں موجود تھی۔ ان دونوں انٹیناز کی بیٹریاں پہلے سے چارج تھیں۔

○......❖......○

......اور اب ہم ایک بند جیپ پر سوار شہر کے نواح کی طرف جارہے تھے۔ ہمارے ساتھ مسلح کمانڈوز والی پانچ چھ گاڑیاں اور کوئی دو درجن گھڑسوار تھے۔ انٹینا سگنل وصول کررہا تھا۔ ان سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم یہاں سے قریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل میں موجود ہے اور شمال کی طرف حرکت کررہا ہے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزرے۔ یہاں جشن کا سماں تھا۔ ہزاروں شہری ہتھیار لہرا رہے تھے اور نعرہ زنی کررہے تھے۔ حکم اور اس کے انگریز حواریوں سے ہمدردی رکھنے والے لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ان میں سے جنہوں نے زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش کی تھی، انہیں برے نتائج بھگتنا پڑے تھے۔

ایک جگہ ہمیں بڑا ہجوم نظر آیا۔ راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ ہماری گاڑیاں رک گئیں۔ یہاں ہمیں تین لاشیں الٹی لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لاش ہم نے دور ہی سے پہچان لی۔ یہ اس اسٹیٹ کے سب سے سفاک پولیس آفیسر رنجیت پانڈے کی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ ایک شخص لپک کر ہمارے پاس آیا۔ یہ کانسٹبل امرناتھ تھا...... وہی سانولا سلونا غریب صورت شخص جس نے ایک رات اپنے چہرے پر پانڈے کا نفرت بھرا تھپڑ وصول کیا تھا...... اور پھر اس تھپڑ کی بازگشت بڑی دور تک گئی تھی۔ قاسمیہ کے "قاسمیہ چوک" میں میری کلائیوں کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں اس تھپڑ کی بازگشت سے ہی ٹوٹی تھیں۔ ایسے نفرت بھرے تھپڑوں کے اثرات بڑی دور تک جاتے ہیں...... ہر دور کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

امرناتھ ہماری جیپ کی کھڑکی سے آ لگا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ "جناب! لوگن نے پانڈے کی لاش کو گلیوں میں گھسیٹا ہے اور یہاں الٹا لٹکا دیا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ قلعے میں گیتا مکھی کے شریر کو سگریٹوں سے جلانے والا اور اس کی ہتھیا کرنے والا یہی پانڈے صاحب ہے۔"

"اس بات کا کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"قلعے کی نچلی منجل (منزل) پر کام کرنے والے دو چاکروں نے سب کچھ بتایا ہے جی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ جلم ہوتے دیکھا تھا۔" امرناتھ کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں اور سیاہ چہرے پر انتقام کا جوش تھا۔

سپاہیوں نے ہجوم میں سے راستہ بنایا اور ہمارا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ جلد ہی ہم زرگاں کے نواحی علاقے سے گزرے اور پھر جنگل میں پہنچ گئے۔ جس جیپ میں، میں اور عمران تھے، مبارک علی بھی اسی پر سوار تھا۔ شہر میں سگنل مدھم تھے مگر جونہی ہم کھلے علاقے میں پہنچے، یہ واضح ہوتے چلے گئے۔ حکم اور اینڈرسن غالباً کسی جیپ پر سوار تھے اور یہ ایک دشوار گزار علاقے میں سفر کررہی تھی۔ یہاں ٹیلے تھے اور ان کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی طرح تھے۔ اگر ہمیں سگنلز کی راہنمائی نہ ہوتی تو ہم شاید حکم کی گرد بھی نہ پاسکتے۔

کہیں کہیں سگنلز مدھم بھی ہوجاتے اور ہمیں پریشانی ہوتی لیکن جلد ہی ان کی کوالٹی پھر سے لوٹ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سگنلز کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں اندازہ ہورہا تھا کہ حکم جس چیز پر سواری کررہا تھا، وہ ٹھہر چکی ہے۔ یہ اونچے نیچے ٹیلوں سے اٹا ہوا جنگل تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ ہم ان نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ سگنلز اب بالکل صاف ہوتے چلے جارہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم نے دوربینوں سے جگہ کا معائنہ کیا۔ قریباً دو کلومیٹر کی دوری پر ایک ٹیلے کے دامن میں ہمیں کسی رہائشی مکان کی جھلک نظر آئی۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا بوسیدہ گھر اس ویرانے میں پتا نہیں کیوں موجود تھا۔ یقیناً وہ جیپ بھی اس گھر کے آس پاس ہی موجود تھی جس پر حکم اور غالباً گورا اینڈرسن یہاں پہنچے تھے۔ درختوں کی وجہ سے وہ جیپ ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اب گاڑیوں سے اتر جانا چاہئے۔" عمران نے تجویز پیش کی۔

میرے ذہن میں بھی یہی خیال آرہا تھا۔ میری ہدایت پر مبارک علی نے کمانڈوز کو اترنے کا حکم دیا۔

ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم پھیلتے بھی جا رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایریا کور کیا جا سکے۔ جلد ہی ہم نے اس بوسیدہ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہمیں وہ شاندار لینڈ کروزر بھی نظر آ گئی جس پر شاہی جوڑا یہاں پہنچا تھا...... میں نے کہا۔ ''مبارک علی! چھوٹے سرکار کی طرف سے سخت ہدایات ہیں کہ حکم کو زندہ گرفتار ہونا چاہئے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہووے گا جناب...... اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے جناب کہ حکم کا کمانڈر اینڈرسن صاحب بھی اندر ہے۔'' مبارک دبے دبے جوش سے بولا۔ مبارک علی نے مجھے لینڈ کروزر کے قریب ہی کچی مٹی پر بڑے سائز کے فوجی بوٹوں کے نشانات دکھائے اور کہا۔ ''مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ یہ اینڈرسن صاحب کے بوٹوں کا نشان ہی ہے...... اور یہ بھی فوجی بوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لوگن کے ساتھ ایک یا دو فوجی بھی ہیں۔''

ہم ایک کٹے ہوئے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ہمارے کمانڈوز چاروں طرف پوزیشنیں لے چکے تھے۔ میں نے میگافون کے ذریعے بلند آواز میں کہا۔ ''رائے وشوا ناتھ اور اینڈرسن صاحب! آپ چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بھاگنے یا چھپنے کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔''

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ عمران کے مشورے سے میں نے یہ اعلان دو بار مزید کیا۔ آخری اعلان میں، میں نے کہا۔ ''ہم آپ کو فیصلہ کرنے کے لئے پانچ منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اگر آپ باہر نہیں آئے تو ہمیں اندر گھسنا پڑے گا اور اس صورت میں اپنے نقصان کی ساری ذمے داری آپ پر ہو گی۔''

اعلان کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی اور انتظار کرنے لگے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ کچے کے ساتھ والا علاقہ ہے۔ آپ نے جلا ہوا جنگل دیکھا ہے نا...... وہ یہاں سے بس سات آٹھ میل کی دوری پر ہے...... اور...... آپ کو پتا ہے، یہ گھر کس کا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے پُرتجسس انداز میں کہا۔

''یہ ایک اچھوت بلو رام کا گھر ہے جی۔ چار پانچ سال پہلے تک یہ بندہ راج بھون کے بھنگی خانے میں کام کرتا تھا۔ بھون کا خاندانی چاکر تھا۔ پھر اس بے چارے کو کوڑھ ہو گیا۔ اس کو راج بھون کی نوکری سے نکال دیا گیا بلکہ شہر سے ہی نکلنے کا حکم دیا گیا۔ کافی سمے تک تو بلو

رام کا کچھ پتا ناہیں چلا۔ پھر زرگاں کے دو شکاریوں نے بتایا کہ بلو رام اپنی پتنی اور دو بچوں کے ساتھ ''کچے'' کے قریب جنگل میں کٹیا بنا کر رہت ہے۔ یہ اسی بلو رام کا گھر ہے جی۔'' مبارک کے لہجے میں طنز تھا۔

میں اور عمران حیران رہ گئے۔ جان بچانے کی خاطر انسان کیا کچھ کرتا ہے...... اور کبھی کبھی کس درجے تک گر جاتا ہے۔ زرگاں کے اونچی شان والے راجا وشوا ناتھ عرف حکم کو پناہ ملی بھی تھی تو کہاں؟

مبارک علی نے کہا۔ ''اگر ہمیں ان سگنلز کی مدد حاصل ناہیں ہوتی تو ہم کبھی یہاں تک نہ پہنچتے۔ اور اگر پہنچ بھی جاتے تو شاید یہ نہ سوچتے کہ حکم جی اور اینڈرسن صاحب بہادر نے اس کمین کوڑھی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہووے گا۔''

...... پانچ منٹ گزر گئے۔ چھٹا اور ساتواں منٹ بھی گزر گیا۔ اب حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مبارک علی کے اشارے پر کمانڈوز نے گھر کی کھڑکیوں اور دروازے پر چند راؤنڈ فائر کئے۔ جواب میں اندر سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں...... اور ہمارا ایک کمانڈو کندھے پر گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر والے بھرپور مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اب اپنا لائحہ عمل سوچنا تھا۔ سورج ڈھل گیا تھا اور اب جلد ہی شام کے سائے تاریکی میں بدلنے والے تھے۔ تاریکی کے بعد گھر کے اندر گھسنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس کے لئے صلاح مشورہ شروع کر دیا۔

جونہی تاریکی گہری ہوئی، ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کام کے لئے عمران نے سب سے پہلے پہلے خود کو پیش کیا۔ مبارک علی بھی اندر جانے پر آمادہ تھا مگر پھر اسے باہر کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ اس کی جگہ میں کارروائی میں شامل ہوا۔ میرے اندر اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لئے بے پناہ آگ تھی۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو یہی نیلی آنکھوں اور بھینسے کے جسم والا انگلش کمانڈر تھا۔ ہمارے ساتھ چھ اور منتخب جوان اندر جانے کے لئے تیار تھے۔

پروگرام کے مطابق، مبارک علی اور اس کے ساتھیوں نے گھر میں موجود افراد کو سامنے کی طرف سے فائرنگ میں انگیج کیا۔ یہ بڑی زوردار فائرنگ تھی۔ ہم بغلی طرف سے گھر کی بیرونی چاردیواری کی طرف بڑھے۔ یہاں درخت زیادہ تھے جو ہمیں کیموفلاج کر رہے تھے۔ سب سے پہلے عمران گھر کے اندر کودا...... اس نے ایک کھڑکی نما دروازہ کھول دیا۔ ہم بھرا مار

کر اندر گھس گئے۔ شدید فائرنگ کی زد میں آ کر دو بکریاں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھیں۔ تیسری شاید ہلاک ہو چکی تھی۔ عمران نے ایک کھڑکی کو زوردار لات رسید کی۔ وہ کھل گئی۔ ایک رائفل بردار گورا عمران کے سامنے آیا مگر اس کی تیزی عمران کی تیزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ عمران کا چلایا ہوا پانچ گولی کا برسٹ اس گورے کو چھلنی کر گیا۔ ہم کمرے میں کود گئے۔

یہی وقت تھا جب ہم پر بائیں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ ایک گولی میرے سامنے کھڑے کمانڈو اشرف کے سر میں لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ ایک دوسرے کمانڈو کو بھی میں نے اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ میں نے رائفل کے شعلے سے حملہ آور کی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلائی اور ساتھ ہی اس پر جست کی۔ میری چلائی ہوئی گولی تو اسے نہیں لگی لیکن میری رائفل کی سنگین اس کے سینے میں اندر تک گھس گئی۔ میں نے لات رسید کر کے اسے اپنی رائفل سے علیحدہ کیا۔ اس کی اپنی رائفل اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

اسی دوران میں ایک کمانڈو مجھ سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''یہ دیکھیں جی۔''

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ گولیوں کے بہت سے خولوں اور ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے ٹکڑوں کے درمیان کچے فرش پر رتنا دیوی اور اس کے بچے کی لاش پڑی تھی۔ رتنا دیوی اس حال میں بھی گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اندھا دھند ہونے والی ''کراس فائرنگ'' میں گولی لگی ہے۔ یہ ایک ہی گولی تھی جو پہلے اس کے بچے کو لگی پھر اس کے اپنے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک پاؤں بھی اس کی شاہی جوتی سمیت خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔

''حکم اور اینڈرسن آس پاس ہی ہوں گے۔'' عمران نے عقابی نظروں سے اردگرد دیکھ کر کہا۔

یہی وقت تھا جب دو کمانڈوز حکم کو پکڑ کر لے آئے۔ یہ نظارہ بھی عبرت ناک تھا۔ زرگاں کا تاجدار جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مٹی میں لت پت نظر آتا تھا۔ اس کی کام دار سنہری پگڑی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

''یہ بھوسے والے کمرے میں چھپے ہوئے تھے جی۔'' کمانڈو نے اطلاع دی۔

''یہ پستول ان کے لباس سے نکلا ہے۔'' دوسرے کمانڈوز نے بھرا ہوا قیمتی بریٹا پسٹل میری طرف بڑھایا۔

لگتا تھا کہ گرفتاری کے وقت وشوا ناتھ عرف حکم جی نے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی

ہے۔ اس کا چغا نما لباس ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور انگلیاں بھی زخمی تھیں۔

''تلاشی لے لی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ناہیں جناب۔'' کمانڈو آفیسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تلاشی لو۔'' میں نے کہا۔

حکم گرجا۔ ''اپنے گندے ہاتھ ہم سے دور رکھو۔ ہمارے پاس کچھ ناہیں۔''

میں نے رائفل کی نال حکم کے سینے کی طرف کی اور انگلی ٹریگر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ہاتھ کتنے بھی گندے ہوں گے مگر اس شخص کے ہاتھوں سے گندے نہیں جسے تم اچھوت اور کوڑھی کہتے ہو......اور جس کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہو۔''

میرے اشارے پر کمانڈو آگے بڑھا اور اس نے حکم کی مزاحمت کی پروا کئے بغیر اس کی تلاشی لی۔ حکم کی آنکھوں میں ہر وقت جلتی ہوئی آگ کی جگہ اب راکھ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی نہایت قیمتی لیکن ٹوٹے ہوئے فانوس کی طرح تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کی چہیتی پتنی اور بچے کی لاشیں پڑی تھیں۔ غالباً اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک نظر انہیں دیکھ ہی سکے۔ کمانڈوز اسے گن پوائنٹ پر باہر لے گئے۔

مبارک علی ایک کمرے سے یہاں کے مکینوں کو نکال کر لے آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے دو لڑکے تھے۔ لڑکوں کی عمریں اٹھارہ بیس سال رہی ہوں گی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ عورت کے ہاتھ کوڑھ زدہ ہیں۔ یہ غریب صورت عورت صورتِ حال کی سنگینی کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''ان کو بھی باہر لے جاؤ۔'' میں نے مبارک علی سے کہا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ عمران نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں سے بھی گولی چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صاحب بہادر اینڈرسن صاحب وہیں پر چھپے ہوئے ہیں۔''

اگلے دو تین منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ اینڈرسن وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس ایک ''ایل ایم جی'' تھی اور یقیناً کافی تعداد میں راؤنڈز بھی تھے۔ مگر جو کچھ بھی تھا، اپنی تمام تر ہوشیاری اور دیدہ دلیری کے باوجود وہ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک چوہے کی طرح ٹریپ ہو چکا تھا۔ ایک گوشت خور سفید چوہا ذہانت اور دلیری میں خود کو حرفِ آخر سمجھتا تھا اور بات بات پر تاریخی حوالے بھی دیتا تھا۔ وہ یہاں زرگاں میں کمانڈر انچیف کی حیثیت رکھتا تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک بوسیدہ چوبی دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! باہر آ جاؤ۔ اس کے سوا تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں ہے۔''

چند سیکنڈ بعد یہی بات عمران نے بھی دہرائی۔

کچھ دیر تک اندر خاموشی طاری رہی۔ پھر اینڈرسن کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ برٹش لب و لہجے میں بولا۔ ''کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ میں گرفتاری دے دوں تو تم گولی نہیں چلاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! تم کوئی بھی شرط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔ ہم تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔''

ہمارے درمیان مختصر مکالمہ ہوا۔ پھر ہماری ہدایت کے مطابق اینڈرسن نے اپنی خطرناک ''ایل ایم جی'' کھڑکی سے باہر پھینکی۔ تب اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اسے تین اطراف سے مسلح کمانڈوز نے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کے لئے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کا ایک کندھا خون آلود ہے۔

''گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔'' میں نے گرج کر کہا۔

وہ ذرا سا جھجکا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے۔ فوری موت سے بچنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ بالکل سیدھے کھڑے کر رکھے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی توقع اینڈرسن کو نہیں تھی۔ میری چلائی ہوئی گولی اینڈرسن کے سینے پر لگی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ گولی کے جھٹکے سے اس کی کیپ اچھل کر دور جا گری۔

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! یاد کرو۔ اس طرح کا سین پہلے بھی دہرایا جا چکا ہے۔ اٹھرا گاؤں میں سلطانہ راجپوت نے بھی اسی طرح ہتھیار پھینکے تھے اور خود کو تمہارے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن تم نے اس کی حوالگی قبول نہیں کی تھی۔ تم نے اسے مار ڈالا تھا۔''

اینڈرسن کی حالت ایک زخمی درندے کی سی تھی مگر اس کی بے پناہ تکلیف کے سامنے اس کی درندگی بے بس تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری گولی اس کے سر پر ماری۔ وہ اس کا رخسار توڑ کر سر میں گھس گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو ایک ریلے کی طرح دروازے کی طرف بہتا چلا گیا۔

میری آنکھوں میں آتشیں سی نمی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی

جائیں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ عمران کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس کی بھرپور تائید کرتا ہے۔

''یہ بھی مر گیا ہے جی۔'' مبارک علی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک اور مقامی کی لاش پڑی تھی۔ کالے رنگ کا یہ دبلا پتلا شخص اس گھر کا سربراہ بلو رام تھا۔ اس کے جسم پر بھی کوڑھ تھا اور یہ کافی بڑھ چکا تھا۔ حکم نے اپنے اس حقیر ملازم کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا لیکن اس شخص نے حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک رائفل بھی پڑی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ آخری لمحوں میں حکم اور اینڈرسن وغیرہ کے ساتھ مل کر وہ بھی ہم پر گولی چلاتا رہا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں رتنا دیوی کی لاش سے نکلنے والا خون اور اس کوڑھی اچھوت کا خون گھل مل گئے ہیں...... سچ کہتے ہیں، موت ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو برابر کر دیتی ہے۔ ساری اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بڑی عبرت ناک صورتِ حال تھی۔ زرگاں کے فرماروا اور اس کے سپہ سالار نے جان بچانے کے لئے ایک ایسے شخص کے گھر میں پناہ لی، عام حالات میں جس کا سایہ بھی وہ خود پر پڑنے نہ دیتے۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ وہاں کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ہاں، گندم رکھنے والے ایک بڑے مٹکے کے اندر سے ایک گٹھڑی دستیاب ہوئی۔ ایسی ہی ایک گٹھڑی ایک چارپائی کے نیچے سے ملی۔ یہ گٹھڑیاں زیورات اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی مالیت لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں تھی۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگوں کا خون پسینہ تھا۔

''یہ دیکھو، ہمارا دوست اور راہنما۔'' عمران نے اس سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا جو ایک جستی ٹرنک پر رکھا ہوا تھا۔ یہی بیگ تھا جس میں حاضر دماغ میڈم صفورا نے الیکٹرانک چپ ڈالی تھی۔ مبارک علی اور عمران نے تین چار منٹ کی کوشش سے وہ چپ ڈھونڈ نکالی۔

ہم باہر پہنچے تو وشوا ناتھ عرف حکم جی کو بند جیپ میں بٹھایا جا چکا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''کتنا ہمدرد راجا ہے، زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔''

''زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر نہیں، اپنی چہیتی پتنی اور بچے کی موت پر۔'' میں نے کہا۔ ''زرگاں میں تو اس سے دس گنا نقصان بھی ہو جاتا تو اس کے کان پر جوں نہ رینگتی۔''

وہ بولا۔ ''دیکھو، تم کہتے ہو کہ ہم ٹی وی چینلز والے ہر واقعے کا منفی پہلو دیکھتے ہیں۔

اب تم خود منفی پہلو دیکھ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو راجا صاحب کے رونے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بعد زرگاں کے انجام کا غم کر رہے ہیں۔ اب شراب خانوں میں دھڑا دھڑ شراب بنانے والے مزدوروں کے گھروں کے چولہے کیسے جلیں گے؟' اب کون خیال رکھے گا غریبوں کا اور ان کی خوب صورت بیٹیوں کا؟ اب مسکین انگریز پردیسیوں کی مہمان نوازیاں کس کے ذمے ہوں گی؟ اب یہاں ناچ گھروں میں رات دن خون پسینا ایک کرنے والی شریف عورتیں اور نیک خواجہ سرا زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے؟ اُف......ایسی پتا نہیں کتنی سوچیں چکرا رہی ہیں حکم صاحب کے دماغ میں۔''

ہماری آواز حکم تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کمانڈوز اس کے لئے جو توہین آمیز نعرے لگا رہے تھے، وہ ضرور اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ یہ انجام تھا اس آرام طلب و عیش پرست شخص کا جس نے دنیاوی لذتوں کے بدلے دھیرے دھیرے اپنے سارے اختیار عیار گوروں کے حوالے کر دیئے تھے......اور یوں اپنے عوام کی بربادی کا سبب بنا تھا۔

عمران نے کہا۔'' مجھے حکم کو دیکھ کر برادر محترم شہنشاہ جہانگیر صاحب یاد آ رہے ہیں۔''

'' کیا مطلب؟''

'' سنا ہے کہ بھائی جہانگیر صاحب نے بھی آخری دنوں میں اپنے سارے اختیارات میڈم نور جہاں......مم......میرا مطلب ہے ملکہ نور جہاں کے حوالے کر دیئے تھے۔ لگتا ہے کہ یہاں زرگاں میں حکم نے بھی انگریزوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا پیکیج کیا ہوا تھا۔ کچھ نرم ملائم ''کچا گوشت''...... دو تین کلو بھنا ہوا گوشت اور انگریزی شراب کی دو چار بوتلیں باقی سب کچھ انگریزوں کے پاس۔''

○......❖......○

یہ اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ چوہان کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اپنے اس دیرینہ دوست اور ساتھی کو الوداع کرتے ہوئے میں کرب کے کئی جانکاہ مرحلوں سے گزرا......راج بھون میں اب جشن کا سماں تھا۔ راج بھون کے عظیم الشان دروازے عام لوگوں کے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ بھون کے اندرونی حصوں کے سوا وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔ نعرہ زنی کی گونج سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاص و عام ہمیں مبارک بادیں دے رہے تھے...... ہماری تعریف کے پُل باندھ رہے تھے اور میں اس ہجوم میں اس چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا جو عام لوگوں کے لئے اجنبی تھا لیکن زرگاں کی خون ریز لڑائی میں جس کا کردار اہم ترین تھا۔ میں طلال کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور میری

ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد اس کی تلاش میں تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں کھو گیا تھا۔

چھوٹے سرکار کو راج بھون کے شاندار تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے دائیں بائیں درجنوں مصاحب اور خواص کی کرسیاں تھیں۔ مجھے اور عمران کو بھی وہیں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے قریب نشستیں دی گئی تھیں۔ لیکن میں پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ میں طلال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

آخر طلال کا کھوج قبرستان میں ملا۔ ایک ہرکارے نے آ کر بتایا کہ طلال کے حلیے سے ملتا جلتا ایک لڑکا قبرستان میں موجود ہے اور ایک قبر سے لپٹا رو رہا ہے۔ میں دو محافظوں اور اس ہرکارے کے ساتھ قبرستان میں پہنچا۔ میں نے طلال کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ سلطانہ کی قبر پر موجود تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا اور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

باقی لوگ فاصلے پر ہی کھڑے رہے۔ میں آگے گیا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے اپنا تر بتر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ کہے جا رہا تھا۔'' خالو جان......وہ چلی گئیں۔''

اس نے میری آنکھیں بھی ایک بار پھر نم کر دیں۔ ہم کافی دیر تک اس کی قبر پر موجود رہے اور اسے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔

راج بھون میں واپس آ کر میں نے طلال کو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ میں نے کہا۔'' جناب! زرگاں کی جنگ میں طلال کا کردار بڑا اہم رہا ہے۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو سر تا پا دیکھا۔ پھر اسے اپنے قریب بلایا اور کندھا تھپکا۔ مراد شاہ صاحب بولے۔'' ہم نے سنا تھا کہ جب قاسمیہ چوک میں انور خاں اور کچھ دوسرے قیدیوں کو سولی چڑھایا جا رہا تھا تو چند راجپوت لڑکوں نے ہجوم سے نکل کر اچانک ہلا بول دیا تھا۔ کیا یہ ان میں شامل تھا؟''

میں نے کہا۔'' جناب! یہ نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ ان کا لیڈر بھی تھا۔ یہ ان میں سب سے آگے تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں جناب کہ اس ساری لڑائی کا نقشہ بدلنے میں وہ واقعہ سب سے اہم تھا۔ یہ وہی موڑ تھا جہاں سے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور انہوں نے گارڈز پر حملہ کرنے کا حوصلہ کیا۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو بے حد تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ دوبارہ شاباش دی اور اس بار شاباش کے ساتھ ہی اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور طلال کو دیا۔ بہت جھجکتے ہوئے اس نے یہ ہار لے لیا۔ طلال کو اگلی نشستوں پر جگہ دی گئی۔ مراد شاہ صاحب نے

اسی وقت طلال کے زندہ رہ جانے والے اور جان دینے والے ساتھیوں کے لئے مختلف انعامات اور مراعات کا اعلان کیا۔

ہمارا مقامی دوست کھشتری بھرت کمار زخمی ہوا تھا اور سیکڑوں دوسرے زخمیوں کی طرح اس کا علاج بھی راج بھون کے ساتھ واقع شفاخانے میں ہو رہا تھا۔ میں اور عمران بھرت کو دیکھنے پہنچے۔ وہ اسی دھاری دار سویٹر میں تھا جس میں اسے گولی لگی تھی اور وہ چوکور برجی کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا مگر اس کی حالت ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں تھی۔ گندمی رنگت والی خوش شکل چمپی اب بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبا رہی تھی اور ساتھ ہی ان پاؤں پر اپنے آنسو بھی گرا رہی تھی۔ مالا بھی وہیں موجود تھی اور تیمارداری میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ درحقیقت یہ دونوں لڑکیاں ہی تھیں جو بھرت کو یقینی موت کے منہ سے کھینچ کر لائی تھیں۔ میں نے چمپی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دلاسا دیا۔

’’گھبراؤ نہیں، چمپی! یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری محبت نے اس بچایا ہے اور تمہاری محبت ہی اسے زندہ بھی رکھے گی۔‘‘

چمپی کے آنسو اور تیزی سے گرنے لگے۔ وہ یوں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی جیسے بہت بڑی مجرم ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، بس اسی کی بدقسمتی کا نتیجہ ہے۔ ہم بڑے ڈاکٹر سے ملے اور اسے بھرت کمار کے علاج اور نگہداشت کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں۔

جب ہم واپس جانے والے تھے، اچانک چونک گئے۔ ہم نے بھرت کے والد کو دیکھا۔ وہ سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتا اور مسلسل کھانستا ہوا بھرت کی طرف آ رہا تھا۔ چمپی نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کے عقب میں تھا کھانسی کی آواز سن کر چمپی پلٹی اور ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

بھرت کے والد نے دیکھ لیا تھا کہ چمپی بھرت کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ تڑخ کر بولا۔

’’تُو یہاں کیا کرت ہے؟ تُو نے چھوٹے مالک کو ہاتھ کیوں لگائے؟ تجھے دیا ناہیں آئی؟ کیا کام تھا تیرا یہاں؟ کیا کام تھا؟‘‘ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے چمپی کو ٹھوکے دیئے۔

مالا جھپٹ کر آگے بڑھی۔ اس نے بھرت کے پتا کو روکا اور کہا۔ ’’چاچا جی! یہ لڑکی آپ کے بیٹے کو ہاتھ نہ لگاتی تو یہ اس وقت زندہ بھی نہ ہوتا۔ یہی ہے جو اسے برستی گولیوں سے نکال کر لائی ہے۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘

عمران نے کہا۔ ’’مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔ یہاں شور شرابا کرو گے تو اسپتال والے چپت مار مار تمہارا گنج لال کر دیں گے۔‘‘

بھرت کا پتا ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میری طرح عمران نے بھی چمپی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ بھرت کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری جاری رکھے۔ مسلح گارڈز بھرت کے پریشان حال پتا کو لے کر باہر آ گئے۔ میں نے انچارج گارڈ کو سمجھایا کہ وہ بھرت کے اس خرد ماغ باپ کو ساری بات بتائے اور اسے وارننگ دے کہ اگر اس نے چمپی یا اس کی والدہ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ایک گارڈ نے بھرت کے والد کو بتا دیا تھا کہ اس سے مخاطب ہونے والے کون ہیں۔ میرا اور عمران کا تعارف بھرت کے والد کو ہکا بکا کرنے اور لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔

زرگاں کی لڑائی کا ایک اہم غدار...... ہمارا سابقہ ساتھی عبدالرحیم بھی اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ عمران نے اس کے سر پر رائفل کے دستے سے ایک تباہ کن ضرب لگائی تھی...... جس کی وجہ سے وہ چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اب وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی مرہم پٹی بھی ہو چکی تھی۔ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس کے دو چار مزید ساتھی بھی اس مخبری والے ’’کارِ خیر‘‘ میں اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔ تاہم ابھی تک عبدالرحیم نے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں تھا۔ وہ کافی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔

ہم عبدالرحیم کے کمرے میں پہنچے۔ اسے ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ زنجیر کا سرا بیڈ کے ساتھ منسلک تھا۔ عبدالرحیم کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور شکل ڈراؤنی ہوگئی تھی۔ عبدالرحیم سے پوچھ گچھ کی ساری ذمے داری حسنات احمد پر تھی۔ وہی پچھلے بارہ گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ ہم پہنچے تو عبدالرحیم کا سر جھک گیا۔ وہ ہم سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا......

حسنات احمد مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے رازداری سے کہا۔ ’’بڑا سخت جان ہے۔ ابھی تک کوئی جانکاری ناہیں دی اس نے...... لیکن جانکاری بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی وجہ سے ہمیں مزید نقصان پہنچ سکت ہے۔ بہرحال، آپ بڑے اچھے سمے پر آئے ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ٹیکا لگوایا ہے۔ اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زبان کا تالا کھل جاوے گا۔‘‘ میں چونک گیا۔ ٹیکے سے حسنات کی مراد وہی درد والا ٹیکا تھا۔

دوسرے کمرے میں عبدالرحیم کے کراہنے کی آوازیں آنے لگی تھیں...... یہ آوازیں

بتدریج بلند ہو رہی تھیں۔ آج ہم پہلی بار اس سبز رنگ کے مہلک انجکشن کے اثرات ملاحظہ کر رہے تھے جو زرگاں میں دہشت کی علامت تھا۔ اس مہلک انجکشن کی ڈبل ڈوز کا مطلب ایک دردناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں تین خوبرو لڑکیوں کی وہ اکڑی ہوئی لاشیں یاد آ گئیں جو ہم نے ایک دن پہلے راج بھون کے عشرت کدے میں دیکھی تھیں۔

اور اب یہ سنگل ڈوز والا انجکشن عبدالرحیم کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا...... حسنات احمد نے اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کروا دیئے تھے تا کہ عبدالرحیم کی آہ و بکا باہر نہ سکے۔ عبدالرحیم کے چہرے پر دھیرے دھیرے اذیت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ ''میں مر گیا...... مجھے بچاؤ...... میں مر گیا۔'' وہ بار بار یہی الفاظ کہہ رہا تھا۔

وہ کبھی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ کبھی سینے پر...... اسے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تکلیف ہو کہاں رہی ہے۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ لاحاصل کوشش تھی۔ وہ تین منٹ کے اندر اندر اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ بیڈ پر سے ایک ایک بالشت اچھلنے لگا۔ وہ کند چھری سے ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ اس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ پھر وہ چلاتے چلاتے بستر سے گر گیا۔ تڑپ تڑپ کر اس نے اپنے پاؤں زخمی کر لئے۔ جب تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بالکل جیسے سرکٹ بریکر کی وجہ سے مشین بند ہو جاتی ہے۔ لیکن سرجن اسٹیل کے بنائے ہوئے اس انجکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ بندے کو حتی الامکان حد تک ہوش میں بھی رکھتا تھا یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

''خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔'' عبدالرحیم ہولناک آواز میں پکارا۔

حسنات احمد کے اشارے پر ایک کمپاؤنڈر نے تین ایم ایل کا ایک انجکشن بھرا......

حسنات نے عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہیں درد کا انجکشن لگایا گیا ہے۔ اس دوسرے انجکشن سے پہلے انجکشن کا اثر ختم ہو جائے گا۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔''

''میں بتاتا ہوں۔ خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔'' اس کا زیریں لباس گیلا ہو چکا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔

حسنات احمد نے جو جو کچھ پوچھا، عبدالرحیم بتاتا چلا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ رحم کی بھیک بھی مانگتا جا رہا تھا...... اس کی آواز کرب کی شدت سے پھٹ رہی تھی اور اس کے الفاظ سمجھنے میں

دشواری ہو رہی تھی۔ حسنات کے اشارے پر فربہ اندام کمپاؤنڈر نے مخصوص قسم کی پین کلر دوا عبدالرحیم کے مسل میں انجیکٹ کی۔ اس کام کے لئے تین افراد کو بڑی مضبوطی سے عبدالرحیم کو دبوچنا پڑا۔ ایک دو منٹ بعد عبدالرحیم کی غیر معمولی اذیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ تاہم وہ حسنات کے سوالوں کے جواب روانی سے دے رہا تھا۔

میں اور عمران اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ عمران نے کہا۔ ''کاش میرے پاس کیمرا ہوتا، میں عبدالرحیم کے تڑپنے پھڑکنے کی فلم بنا سکتا۔ کتنا مزہ آتا اگر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی پندرہ بیس چینل کام کر رہے ہوتے۔ عبدالرحیم کی فلم بننے کے فوراً بعد میں اپنے ''فساد چینل'' پر پٹی چلانا شروع کر دیتا۔ ناظرین ہمیں مظلوم عبدالرحیم پر بدترین تشدد کی فوٹیج موصول ہو گئی ہے۔ جلد ہی آپ دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تک تو ناظرین کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ''کہیں جایئے گا مت۔'' ڈیڑھ دو گھنٹے میں کم از کم پندرہ سوا شتہارات دکھانے کے بعد ہم یہ فوٹیج چلاتے اور ساتھ میں بتاتے کہ 18 بچوں کے باپ عبدالرحیم نے چونکہ مبینہ طور پر اعلیٰ افسروں کو رشوت نہیں دی تھی اس لئے اس پر ظلم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ ہم فوٹیج پر سرخ دائرے لگا لگا کر بتاتے کہ یہ عبدالرحیم کو ٹیکا لگایا جا رہا ہے...... یہ تکلیف اور خوف کی وجہ سے اس کا پاجامہ گیلا ہوتا جا رہا ہے...... یہ دیکھئے یہ دیکھئے...... یہ مزید گیلا ہو گیا ہے۔ اور یہ دیکھئے، اس تیسرے سرخ دائرے کے اندر یہ بندہ مسکرا رہا ہے۔ اسی نے رشوت طلب کی تھی۔ رات کے ٹاک شو میں ہم چار دانشوروں سے اس فوٹیج پر تبصرہ کراتے اور وہ بڑی آسانی سے درد کے اس انجکشن کے ڈانڈے امریکا کی اندرونی بے چینی اور نیو ورلڈ آرڈر سے جوڑ دیتے۔ عبدالرحیم کسی بڑے ایرانی سائنس داں کا اسسٹنٹ قرار پاتا۔''

''لیکن دو روز بعد یہ سب کچھ غلط ثابت ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیا ہوتا۔ یہ ایک اور بریکنگ نیوز بن جاتی...... عبدالرحیم مظلوم کے بجائے ظالم نکلا۔ اس سے کسی نے رشوت طلب نہیں کی تھی...... اس کی بے وفائی اور غداری کے ٹھوس ثبوت منظرِ عام پر آ گئے...... وغیرہ وغیرہ۔''

''چلو، تمہارا یہ چینل چینل کھیلنے والا شوق بھی جلد پورا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں ہماری واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

''ہائے۔'' عمران نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تیر مارا ہے تم نے دل پر۔ ایک دم ریما جی کی یاد آ گئی...... وہ لاہور کی سڑکیں، وہ سردیوں کی سنہری دھوپ، وہ نہر کا کنارہ۔ وہ مزے

مزے کے ریستوران......"

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے بھی خاموشی نے گھیر لیا۔ سامنے ہی زرگاں کا قبرستان نظر آیا تھا۔ وہ قبرستان جہاں سلطانہ دفن تھی۔ اپنی تمام تر سادگی، دلیری اور محبت کے ساتھ۔ مجھے پتا تھا کہ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مجھے یہ جگہ بہت یاد آئے گی۔ شیشم اور بیری کے پیڑوں کے نیچے وہ کچی قبر جس میں میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سو رہی تھی۔ قریباً تین برس تک وہ شب و روز سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ اس کی قربانیوں نے مجھے زندہ رکھا اور اس کی بے لوث محبتوں نے میرے دل و دماغ میں انمٹ رستے بنائے۔ لیکن اب مجھے ہمیشہ کے لئے اسے یہاں چھوڑ کر جانا تھا۔ خوش آئند بات بس ایک ہی تھی۔ اس کی ایک نشانی میرے پاس موجود تھی۔

اچانک مجھے اور عمران کو چونکنا پڑا۔ اسپتال کی طرف سے دو گھڑسوار گھوڑے بھگاتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، ان کے عقب میں کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا بھی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ تینوں ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بہت خاص بات تھی۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

"یا اللہ خیر۔" عمران نے کہا۔ "کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے؟"

○......❖......○

دونوں گھڑسوار اور مالا ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ اتنے میں پانڈے کا اچھوت ماتحت امر ناتھ بھی بھاگا ہوا آیا اور ہمارے پاس آ کر رک گیا۔

مالا نے ہانپی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ "آپ کا کیا خیال ہے، ماتا جی کہاں ہوں گی؟"

میں نے کہا۔ "میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج صبح کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ نہیں بچیں۔"

"یہ غلط ہے۔" مالا نے کہا۔ "میں پورے وشواس سے کہہ سکت ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں ابھی ابھی اسپتال سے ملا ہے۔"

"کیسا ثبوت؟" عمران نے پوچھا۔

"پتا چلا ہے کہ رات کو کچھ لوگن اسپتال میں آئے تھے۔ انہیں جانکاری ملی تھی کہ یہاں اسپتال میں کوئی ایسی ناری موجود ہے جو ودھوا ہے اور اس کی عمر تیس بتیس ورش کے لگ بھگ ہے۔ ان لوگن کو اسپتال میں تو ایسی عورت ناہیں ملی مگر پھر پتا چلا کہ اسپتال کے صحن میں جو

چھوٹا سا مندر ہے، وہاں ایک ایسی ودھوا عورت سیوا کا کام کرت ہے۔ یہ لوگن اس عورت کے پاس پہنچے اور اسے ایک گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ دیکھنے والے نے بتایا ہے کہ گھوڑا گاڑی میں ایک بوڑھی عورت بھی موجود تھی جس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیکھنے والے کا وچار ہے کہ وہ کالے کپڑوں والی عورت ماتا جی ہی تھی۔"

"تم اپنی اس ساری بات سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو مالا؟" عمران نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں یہ بتانا چاہت ہوں کہ ماتا جی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی عادت کے مطابق کوئی خطرناک شوشہ چھوڑنے والی ہیں۔ وہ اسپتال کے اندر سے ایک تیس ورش کی بیوہ عورت کو ڈھونڈ کر لے گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ میں نے تیس ورش کی بیوہ کا ذکر ماتا جی کی زبانی کسی پرانی رسم کے سلسلے میں سنا تھا۔ کوئی ایسی رسم جو بہت بری تھی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد ناہیں آ رہا ہے۔ پر میرا من کہہ رہا ہے کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ ماتا جی کا کٹڑپن اور ان کا "میں نہ مانوں" والا رویہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے والا ہے۔"

امر ناتھ نے لجاجت سے کہا۔ "میں اس قابل تو ناہیں ہوں جی لیکن اگر آپ کی اجاجت ہو تو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ ہم کو اس بارے میں پنڈت مہاراج سے پوچھنا چاہئے۔ ان کو بہت سی پوتھیاں اور شاستریں منہ جبانی یاد ہیں۔ پنڈت مہاراج ہمیں فوراً بتا سکت ہیں کہ اگر بھگوان نہ کرے ماتا جی کوئی بری رسم ادا کرنے والی ہیں تو وہ کیا ہووے گی۔"

مالا نے فوراً تائید کی۔ "میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں فوراً ماتا جی کے ارادے کے بارے میں جاننا چاہئے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کچھ لوگن اسپتال سے تیس ورش کی ودھوا ناری کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ اور اگر اسے لے جانے والوں میں ماتا جی بھی ہیں تو پھر ہمیں جانکاری ہونی چاہئے کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی ہیں۔"

تھوڑے سے مزید مشورے کے بعد ہم سیدھے راج بھون میں پنڈت مہاراج کے پاس پہنچے۔ پنڈت مہاراج کو عارضی طور پر راج بھون کے ایک رہائشی پورشن میں نظر بند کیا گیا تھا۔ پنڈت مہاراج اپنے لمبے بالوں اور اپنے گلے میں جھولنے والی درجنوں مالاؤں کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ جارج گورا کے ساتھ میرے سامبر مقابلے سے پہلے اور مقابلے کے بعد بھی پنڈت مہاراج نے کچھ اچھے فیصلے دیئے تھے اور ہمارے دل میں جگہ بنائی تھی لیکن آخر میں وہ بھی موقع پرستی اور مصلحتوں کا شکار ہوا تھا۔ دھرم کا منہ بند کرنے کے لئے پہلے مجھے، عمران اور حمیدہ کو آزاد کیا گیا تھا اور جب ہم ایک خاص حد سے

آگے نکلے تھے تو ہمیں پھر سے پکڑنے کے لئے گھوڑے دوڑا دیئے گئے تھے۔

آج اگر پنڈت مہاراج شرمسار اور سرنگوں نظر آ رہا تھا تو اس کی وجہ وہی واقعات تھے۔

بہرحال، اس موقع پر ہم نے پنڈت مہاراج کو مزید شرمسار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے اسے تسلی تشفی دی اور اسے باور کرایا کہ دیگر دھرمی لوگوں اور پنڈتوں پجاریوں کی طرح اس سے بھی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مالا نے پنڈت مہاراج سے وہ سوال پوچھے جو بڑی شدت سے اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ اس نے تیس سالہ بیوہ کا ذکر کیا اور اس خونی رسم کا ذکر کیا جس کے بارے میں اس نے کوئی ادھوری سی بات کہیں سنی تھی۔

پنڈت مہاراج کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں سے ایک موٹی تگڑی قدیم شاستر کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک تحریر کی نشاندہی کی۔ یہ سنسکرت میں تھی۔ مالا کی درخواست پر پنڈت مہاراج نے تحریر کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھانڈیل کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں جب بھی بھگوان کے سینکوں (سپاہیوں) کو دشمن کے خلاف یدھ (جنگ) میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ہورا کی رسم کا سہارا لیا۔ ہورا کی رسم بلیدان کی وہ رسم ہے جس سے ہمیشہ ہاری ہوئی جنگ جیتی گئی ہے۔ یہ بلیدان ایشور کو اتنا پسند آتا ہے کہ وہ کایا پلٹ دیتا ہے۔ انہونی، ہونی ہو جاتی ہے۔ اتہاس (تاریخ) میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

...... نیچے کچھ مثالیں لکھی ہوئی تھیں۔

آخر میں درج تھا۔ ''ہورا کی رسم کے مطابق کالے رنگ کی تینتیس بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے مردہ جسم مٹی میں دبا دیئے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آ سکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ بھینسوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرنے کے باوجود بھی ورودھیوں (دشمنوں) کی شکست اور اپنی فتح کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ ہورا کی اس دوسری رسم میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان تینوں ناریوں کو ودھوا ہونا چاہئے اور ان کی عمریں تیس سال سے کم نہ ہوں۔ یہ ناریاں دھرم کے پالن کے لئے اپنی خوشی اور اکھشا سے اپنا جیون قربان کریں..... تو یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔''

اس کے علاوہ بھی اس رسم کے حوالے سے دو چار شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

مالا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پورے یقین سے بولی۔ ''اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا

ہے۔ بے شک...... بے شک یہی باتیں تھیں جو میں نے اپنے گھر میں اپنی دادی ساس سے سنی تھیں اور مجھے پورا وشواس ہے کہ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا کام ہونے جا رہا ہے۔''

''لیکن آپ تو ایک عورت کی بات کر رہی ہیں۔ یہاں تین عورتوں کا ذکر ہے۔'' میں نے مالا سے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہو سکت ہے کہ میری دادی ساس نے دو عورتوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا ہو۔ وہ جو کام کرنے کی ٹھان لیوت ہیں پھر وہ کر گزرتی ہیں۔''

''اب سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام کب اور کہاں ہوگا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی ہجوم والی جگہ پر ہووے گا۔ جہاں بہت سارے لوگن اس کو دیکھ سکیں اور ان کے اندر جوش اور شکتی پیدا ہو سکے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ شہر کے ''زیادہ ہندو آبادی'' والے علاقے میں ماتا جی کو تلاش کرایا جائے۔ بہت سے بندوں کو فوری طور پر اس کام پر لگا دیا جاوے۔ یہ بھی ہو سکت ہے کہ ماتا جی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے کسی مندر یا دھرم شالے میں پناہ لے رکھی ہو۔''

مالا کی رائے میں وزن تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے مشورہ کیا فوری طور پر مبارک علی کو بلایا گیا اور اسے ساری صورتِ حال بتا کر تلاش کی ذمے داری سونپ دی گئی۔

ہم دوبارہ راج بھون کے دربار میں پہنچے تو وہاں فتح کا جشن جاری تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اپنے ایک پرانے ساتھی اجے سے بھی ہوئی۔ اجے نل پانی کی فوج میں کپتان تھا۔ وہ انور خاں کے ساتھ ہی یہاں زرگاں میں پہنچا تھا۔ اب یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی تھی کہ زرگاں کے حکمراں وشوانا تھ عرف حکم جی نے جان بچانے کے لئے ایک کوڑھ زدہ بھنگی کے گھر میں پناہ لی تھی اور اسے وہیں سے پکڑا گیا ہے۔ رتنا دیوی کی اتفاقیہ موت کی خبر بھی ہر جگہ پھیل چکی تھی۔ انگریز کماندار اینڈرسن کی لاش راج بھون میں لائی جا چکی تھی۔ اس کی لاش کو کڑی حفاظت میں رکھا گیا تھا ورنہ منیارڈ اور پانڈے کی لاش کی طرح وہ بھی لوگوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنتی۔

چھوٹے سرکار نے اپنے بڑے بھائی حکم جی کے لئے فی الحال نظربندی کے احکام جاری کئے تھے۔ اس سے ضروری کاغذات پر دستخط وغیرہ کرانے کے بعد اسے اپنے اہلِ خانہ کی آخری رسومات میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا راج بھون کا تہ خانہ تھا۔ کچھ دیر بعد حسنات احمد بھی دربار میں پہنچ گیا۔ وہ اسپتال میں انور خاں کے غدار ساتھی عبدالرحیم سے تفتیش کر کے یہاں پہنچا تھا درد کا انجکشن جو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرتا

تھا،عبدالرحیم کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

حسنات احمد نے بتایا۔''عبدالرحیم نے انگریز افسر منیارڈ کے ساتھ معاملہ طے کیا تھا۔ راج بھون کی ایک ''پری'' عبدالرحیم کے پیچھے لگائی گئی۔اس نے ایک ہی رات میں نہ صرف عبدالرحیم کو شیشے میں اتار لیا بلکہ عبدالرحیم کے ذریعے انور خاں کے دو تین اور ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔منیارڈ کی طرف سے ان افراد کو فی کس پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ ہوا اور ایک ایک لاکھ روپیا نقد فراہم کیا گیا۔عبدالرحیم کو خصوصی رشوت کے طور پر زرگاں کی ایک قیمتی زمین دینے کا وچن بھی دیا گیا۔''

''باقی لوگ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ انور خاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ان کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے جا رہے ہیں اور شہر کے ناکوں پر ان کے لئے خاص ہدایتیں جاری کر دی گئی ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پیغام رساں بڑی تیزی سے وہاں پہنچا۔اس نے حسنات کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ گفتگو کی۔حسنات نے مجھے اور عمران کو بھی بلا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''بڑھیا کی کارستانی سامنے آ گئی ہے جی۔'' حسنات نے جذباتی لہجے میں کہا۔''وہ قاسمیہ کے قریب دھرم شالے میں موجود ہے۔وہی دھرم شالہ جس کے مینار پر چڑھ کر اس نے تین دن پہلے پوجا پاٹ کی تھی۔''

''کیا کسی نے اسے دیکھا ہے وہاں؟'' کپتان اجے نے پوچھا۔

''ابھی دیکھا تو ناہیں لیکن امید ہے کہ وہ خانہ خراب بھی وہیں پر ملے گی۔جس ودھوا عورت کو وہ اسپتال کے مندر سے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، وہ دھرم شالے کے مینارے پر موجود ہے۔اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔دونوں عورتیں آتما ہتھیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔وہاں بہت سے ہندو جمع ہو گئے ہیں اور نعرے وغیرہ لگا رہے ہیں...... مجھے لگت ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تیسری عورت بھی مینارے پر چڑھ جاوے گی اور پھر رسم کے مطابق یہ تینوں ودھوائیں آتما ہتھیا کر لیویں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہورا کی رسم کے مطابق، ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کے لئے قربانی دیں گی۔'' میں نے کہا۔

حسنات نے اثبات میں سر ہلایا۔''بالکل ایسا ہی ہے جی۔لگت تو یہی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگن کے سامنے مینارے سے چھلانگ لگا دیویں گی...... اور شہر میں ایک نئے فساد کی

شروعات ہو جاوے گی۔''

''نہیں،اب کوئی فساد نہیں ہوگا۔'' عمران نے یقین سے کہا۔''فساد کرنے والوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔پھر بھی ہمیں اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لینا چاہئے اور فوری سدِباب کرنا چاہئے۔''

حسنات نے کہا۔''مجھے یقین ہے جی کہ فساد کی اصل جڑ بڑھیا بھی دھرم شالے کے اندر ہی ہے۔وہی ان تین عورتوں کو اس خونی کھیل کے لئے تیار کر رہی ہے۔''

میں،عمران،اجے اور حسنات فوراً وہاں سے روانہ ہوئے۔ایک بند فوجی گاڑی میں ہم بیس منٹ کے اندر ایک بار پھر قاسمیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔یہ سہ پہر کا وقت تھا۔لوگ جگہ جگہ ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے۔نل پانی کے سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ہر طرف طربیہ ماحول کی جھلکیاں تھیں مگر جب ہم دھرم شالے کے نواح میں پہنچے تو وہاں کچھ اور طرح کی فضا دکھائی دی۔وسیع دھرم شالے کے بیچوں بیچ ایک تالاب میں کھڑا چوکور مینار لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا......اردگرد کی چھتوں اور گلیوں میں چار پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے اور بھی مزید آ رہے تھے۔بلند و بالا مینار پر ہمیں دو عورتیں نظر آئیں۔دونوں نے گہرے زرد رنگ کے چولے پہن رکھے تھے۔انہوں نے بال کھولے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو ہیجانی انداز میں ہلا کر کچھ اشلوک وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔

''تیسری عورت نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے حسنات احمد سے پوچھا۔

''شاید اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔'' حسنات احمد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔'' عمران نے کہا۔

ہم بند فوجی گاڑی کے اندر ہی بیٹھے تھے۔اردگرد کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ اس گاڑی میں اہم لوگ موجود ہیں لیکن پھر بھی دھرم شالا کے ایک پجاری کی نظر ہم پر پڑ گئی۔یہ ادھیڑ عمر شخص تیزی سے گاڑی کی طرف آیا اور کھڑکی کے شیشے سے چمٹ گیا۔اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ فریادی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ساتھ ساتھ وہ مینار کی بلندی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''اسے اندر آنے دو۔'' عمران نے حسنات احمد سے کہا۔

حسنات نے دروازہ کھول لیا اور اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور فریاد کناں لہجے میں بولا۔''ان دونوں ناریوں کا جیون بچاؤ جی۔یہ آتما ہتھیا کر لیویں گی۔ بڑی ماتا ان کو آتما ہتھیا پر مجبور کر دیوے گی۔یہاں جو کچھ ہونے جا رہا ہے......وہ بڑی ماتا

ہی کروا رہی ہے۔ پرنتو! وہ وہی کچھ کرت ہے جو اس کے اپنے من میں آوت ہے۔"

عمران نے پوچھا۔ "وہ ان کو آتما ہتھیا پر کیوں مجبور کر رہی ہے؟"

جواب میں ادھیڑ عمر پجاری نے قریباً وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مالا نے بتایا تھا۔ ادھیڑ عمر پجاری نے "ہورا" کی رسم کا ذکر کیا اور بتایا کہ کچھ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اگر تین ودھوا ناریاں جن کی عمریں تیس سال سے زیادہ اور پینتیس سال سے کم ہوں، اپنی مرضی سے اپنے جیون کی بلی دیں تو ہاری ہوئی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ادھیڑ عمر پجاری نے یہ بھی بتایا کہ دو ودھوا عورتیں مینار پر چڑھ گئی ہیں۔ دھرم شالا کے اندر سے ہی ایک تیسری عورت کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ بس چند منٹ میں وہ بھی مینار کے اوپر نظر آئے گی اور پھر تینوں عورتیں مینار سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیں گی۔

عمران نے کہا۔ "ہمیں ہورا کی اس رسم کے بارے میں پنڈت مہاراج نے ایک شاستر میں سے پڑھ کر بتایا تھا۔ کیا تمہارے پاس بھی کوئی ایسی شاستر یا پوتھی ہے؟"

"کیوں ناہیں جی...... دھرم شالا میں ایسی کئی پوتھیاں ہیں جن میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔"

"کیا تم کوئی ایسی پوتھی ہمیں دکھا سکتے ہو؟"

"بالکل دکھا سکتا ہوں جی...... مگر ابھی سمے بہت کم ہے۔ آپ پہلے ان ناریوں کا جیون بچانے کے لئے کچھ کریں۔"

"جیون ضرور بچے گا، تم گھبراؤ مت۔ تم فٹافٹ اندر سے کوئی پوتھی لے کر آؤ۔ جلدی کرو۔" عمران نے پجاری کو تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ چار و ناچار گاڑی سے اترا اور اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دھرم شالے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دھرم شالے کے اردگرد ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ مینار پر چڑھی ہوئی عورتوں کا انداز مزید ہیجانی ہو گیا تھا۔

ادھیڑ عمر پنڈت فقط دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور کتاب کی ورق گردانی کرتا چلا آ رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے گرم صافوں میں چھپائے اور کپتان اجے کے ساتھ گاڑی سے نکل آئے۔ ہم کے ادھیڑ عمر پجاری کو بھی ساتھ لے لیا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم مینار کے داخلی دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی ہندو اور مسلمان سپاہی موجود تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔

ہم نے طویل سیڑھیاں طے کیں اور مینار کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے زرگاں کی آبادی دور تک دکھائی دیتی تھی۔ قاسیہ کا پرانا قلعہ، راج بھون کے چمکتے ہوئے کلس، لال بھون کی اونچی چھتیں، شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی نہر اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

گہرے زرد لباس والی دونوں عورتیں ہمیں دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ ان دونوں کے سانولے چہروں پر عجیب سی جنونی کیفیت تھی۔ "کک...... کون ہو تم؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"میں اجے کمار ہوں، آپ دونوں کی مدد کے لئے مجھے بڑی ماتا نے کہا ہے۔" اجے کمار آگے بڑھ کر بولا۔

"ہماری تیسری بہن کہاں ہے؟" عورت نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔ تیسری بہن سے اس کی مراد اپنی تیسری ساتھی تھی۔

"وہ بس آ رہی ہے۔" اجے نے مبہم جواب دیا۔

جب اجے کمار دونوں عورتوں سے مکالمہ کر رہا تھا، میں اور عمران پندرہ بیس سیڑھیاں نیچے اترے اور بڑی ماتا کو تلاش کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی حجرہ نما جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ مینار کے اندر ہی واقع تھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں ستیش کی کھوسٹ دادی یعنی بڑی ماتا تین عورتوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تینوں عورتیں یہاں کی پجارنیں تھیں۔ ایک چوتھی عورت فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کے سانولے سلونے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے جا رہے تھے۔ اس فرش بوس عورت نے بھی اوپر والی عورتوں کی طرح گہرے زرد رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ہمیں دیکھ کر بڑی ماتا اور اس کی ساتھی عورتیں بری طرح ٹھٹکیں۔ "کون ہو تم؟" بڑی بی یعنی بڑی ماتا نے کڑک کر پوچھا۔

"ہمیں اوپر والے نے بھیجا ہے۔" عمران بڑے اطمینان سے بولا۔ "دراصل آپ دھرم کے لئے اتنا کچھ کر رہی ہیں کہ اوپر والے کو آپ پر پیار آ گیا ہے۔ وہ اب آپ کی ساری پرکھشائیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ سورگ کی ٹھنڈی ہوائیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"کیا بکتے ہو...... کون ہو تم؟" بڑھیا پھر کڑکی۔

"میں موت کے دیوتا کا اردلی ہوں۔ آپ کو سنسار کے دکھوں سے نجات دلانے آیا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں...... مکتی دلانے آیا ہوں۔"

غیر معمولی پیرانہ سالی کے باوجود بڑھیا کی یادداشت غضب کی تھی۔ اس نے عمران کی آواز پہچان لی۔ ''کون ہو تم؟ میں کہتی ہوں یہ کپڑا ہٹاؤ اپنے منہ سے۔''

عمران نے کپڑا ہٹا دیا۔ میں نے بھی ہٹا دیا۔ بڑھیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو تم یہاں بھی آ گئے ہو منحوس...... موئے...... مردود۔''

''بس آپ کا پیار کھینچ لایا ہے ہمیں۔ ہم آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتے۔'' عمران نے اپنے لباس میں سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تینوں عورتیں چلا کر ایک کونے میں سمٹ گئیں۔

بڑھیا عمران کو مارنے دوڑی۔ عمران نے اس کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چلانے لگی۔

اس کی ایک ساتھی عورت لرز کر بولی۔ ''بھگوان کی مار سے ڈرو۔ چھوڑ دو ان کو۔ تم کو کچھ پتا ناہیں تم کیا کر رہے ہو۔''

''ہمیں پتا ہے، ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی پتا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے دو عورتوں کو قربانی کی بکریاں بنا لیا ہے اور انہیں اوپر چڑھا دیا ہے۔ اب اس تیسری کو تیار کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ یہ بے چاری موت کے خوف سے بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ تم اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہو تا کہ اسے دھرم کا واسطہ دے کر آخری سفر پر روانہ فرما سکو۔''

بڑھیا خود کو چھڑانے کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مدد کے لئے پکار بھی رہی تھی۔ ہم اسے حجرے سے باہر لے آئے۔ باقی عورتوں کو اندر ہی رہنے دیا۔ حجرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ ہم شور مچاتی بڑھیا کو لے کر اوپر اس جگہ آ گئے جہاں بلی دینے والی دونوں بیوہ عورتیں موجود تھیں۔ ادھیڑ عمر پجاری اور اجے ان کو باتوں میں مصروف رکھے ہوئے تھے۔ بڑی ماتا کو ہمارے ساتھ دیکھ کر یہ دونوں عورتیں بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ بڑی ماتا عمران کو بددعائیں دے رہی تھی اور بدترین گالیوں سے نواز رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس کا منہ نوچنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ عمران کی گردن سے خون رِسنے لگا تھا۔ تاہم وہ یہ سب کچھ تحمل سے برداشت کر رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر عمران نے بڑھیا کی دونوں کلائیاں اجے کمار کے حوالے کر دیں تا کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے پھر اس نے پجاری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''پجاری جی! تم ''ہورا'' کے بارے میں پوتھی کی تحریر پڑھ کر سناؤ۔''

پریشان حال پجاری نے تحریر پڑھی۔ یہ پوری تحریر کچھ اس طرح تھی۔ ''رسم کے مطابق تینتیس کالی بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے جسم مٹی میں دبا دیئے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آ سکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی اگر وجے (فتح) کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ اس میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے ان ناریوں کو ودھوا ہونا چاہئے اور ان کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں۔ یہ ناریاں اپنی مرضی سے اپنا جیون قربان کریں...... تو یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔ اگر کسی کارن تیس سال کی تین ودھوا ناریاں نہ مل سکیں تو پھر مجبوری کی صورت میں تیس سال سے تین گنا عمر والی ودھوا ناریاں بھی یہ بلیدان دے سکت ہیں۔''

عمران نے اجے کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجے! مجھے لگتا ہے کہ اس دھرمی تحریر میں یہ آخری فقرہ سب سے اہم ہے......''

میری طرح بات اجے کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عمران بھائی۔ اس طرف تو پہلے ہم میں سے کسی کا دھیان ہی ناہیں گیا۔''

پھر اجے ادھیڑ عمر پجاری سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کا کیا وچار ہے پجاری جی۔ اگر شرط کے مطابق تین ناریاں نہ مل سکیں تو پھر ایک ہی بڑی عمر کی ناری کی قربانی ہو سکت ہے؟''

گھمبیر صورتِ حال کی وجہ سے پجاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تحریر کو پھر پڑھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا...... ''جی ہاں...... ایسا ہو سکت ہے۔ شبدوں میں یہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے پنڈت مہاراج سے بھی اس بارے میں سنا تھا۔''

پجاری کی بات سن کر زرد لباس والی دونوں عورتوں کے دھواں دھواں چہروں پر ہلکی سی چمک نظر آئی۔ بڑی ماتا کی صورت مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن جیسی ہو گئی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''اپنی بک بک بند کرو۔ منحوسو! چھوڑ دو مجھے......'' پھر وہ نیچے کھڑے سیکڑوں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے واویلا کرنے لگی لیکن اس کی آواز وضاحت سے نیچے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں کپتان اجے، ادھیڑ عمر پجاری اور بڑی ماتا کے درمیان زوردار

مکالمہ ہوا۔ پہلے اجے اور پھر پجاری نے بھی بڑی ماتا کو قائل کرنا چاہا کہ اگر وہ ہوڑا کی رسم ادا کرنا ہی چاہتی ہے اور اس کے لئے شبھ گھڑی بھی نکال چکی ہے تو پھر خود یہ قربانی دے دے...... کیونکہ شرائط کے مطابق تین عورتیں میسر نہیں ہیں۔ نہایت سنگین اور عبرت ناک ہونے کے باوجود یہ صورتِ حال کسی حد تک دلچسپ بھی تھی۔ بڑی ماتا اپنے جیون کی نوے سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ اس کی انتہا پسندی اور کٹرپن کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے نوجوانوں کی جانیں گئی تھیں لیکن وہ اب بھی جینا چاہتی تھی۔ ''وہ ہورا'' کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ہمارے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اجے نے ابھی تک اسے دونوں کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اب اجے کا چہرہ غصے سے سرخ دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑی ماتا کی ایک گندی گالی کے جواب میں وہ چیخ کر بولا۔ ''دھرم تمہاری مرضی کا نام ناہیں ہے بڑھیا۔ دھرم کے پالن کے لئے اور ہندو جاتی کا نام اونچا کرنے کے لئے اگر یہ عورتیں قربانی دے سکت ہیں تو تم بھی دے سکت ہو۔ تم ودھوا ہو۔ تمہاری عمر بھی تیس سے تین گنا یعنی نوے ورش سے اوپر ہے۔ پھر تم کیوں آگے ناہیں آتی ہو؟ تم دوسروں کو سورگ کی خوش خبریاں سناوت ہو، اب جب سورگ کے لئے تمہاری اپنی ٹکٹ پکی ہو رہی ہے تو تم بھاگ رہی ہو۔''

وہ پوپلے منہ سے اجے کو کوس رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے اجے کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ ایک جگہ اچانک اجے کا پاؤں پھسلا۔ بڑی بی بی کی کلائیوں پر اس کی گرفت کمزور ہوئی۔ وہ ایک دم اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنا چاہیں مگر اس کی اپنی ہی سفید ساڑھی اس کے پاؤں میں الجھی۔ اس سے پہلے ہم میں سے کوئی اسے تھامتا، وہ دس پندرہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے گری۔ اس کا سر شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔ میں لپک کر اس تک پہنچا، اسے اٹھایا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ وہ شدید زخمی ہو چکی تھی۔

اسی دوران میں امرناتھ اور مالا بھی کچھ دیگر افراد کے ساتھ مینار پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بڑھیا کو حجرہ نما کمرے میں لٹا دیا۔ امرناتھ تو نیچے دوڑا تا کہ اس کے لئے طبی امداد لا سکے۔ اندازہ ہوا کہ بڑھیا آخری سانسیں لے رہی ہے۔ مالا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ پکارتی چلی گئی۔ ''دادی جی...... دادی جی۔'' اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

دادی نے اپنی سفید سفید آنکھوں سے مالا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں

میں اپنی پوتی بہو کے لئے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھرم شالا کا ایک سیوک گنگا جل لے آیا۔ مالا نے گنگا جل بڑی ماتا کے منہ میں ٹپکانا چاہا مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ اپنا سر مالا کی گود سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ یہی وہ کہنہ ہٹ دھرمی ہے جو ہزار ہا سال سے انسان کے اندر سفر کر رہی ہے۔ یہ جب ایک بار دل میں جگہ بناتی ہے تو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس ہٹ دھرمی کا سرچشمہ اکثر فرسودہ عقیدے ہی ہوتے ہیں۔

مالا سمجھ گئی کہ وہ اپنی دادی ساس کے آخری لمحات کو مزید اذیت ناک بنا رہی ہے۔ اس نے دادی ساس کا لہولہو سر چوما اور پھر یہ سر ایک خدمت گار عورت کی گود میں دے دیا۔ بڑی بی نے خدمت گار عورت کے ہاتھ سے گنگا جل پیا۔ کچھ دیر کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی پھر بے ہوش ہو گئی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں چند منٹ بعد اس کی نبض رک گئی۔ وہ جا چکی تھی...... جذبات میں آ کر رسم کے لئے تیار ہو جانے والی دونوں بیوہ عورتیں اب اجے کمار کے سپاہیوں کی تحویل میں تھیں۔ انہیں حفاظت سے نیچے اتار لیا گیا۔

○......❖......○

دو تین روز کے اندر زرگاں میں حالات معمول پر آنے لگے۔ ہمارا یار غار اسد اب فتح پور سے زرگاں پہنچ چکا تھا۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسد نے بتایا تھا کہ تاؤ افضل اپنی بیٹیوں سمیت بالکل خیریت سے ہے۔ فتح پور کے نئے مکھیا نے تاؤ افضل اور اس کی بیٹیوں کی حفاظت کی پوری ذمے داری لی تھی۔ اسد اور نوری کو سلطانہ کی موت کی اطلاع مندر میں ہی مل گئی تھی مگر انہیں ابھی تک اس کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دیر تک روتے رہے۔ وہ اس بات پر بھی ششدر تھے کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا چوکیدار آفتاب ایک اس انتہا پسند گروہ کا حصہ تھا......اور وہ اپنی موت کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔

اقبال نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مجھے ایک پوٹلی تھمائی اور بولا۔ ''اس میں سلطانہ بھابی کی چیزیں ہیں اور وہ زیور بھی جو وہ مندر کے تہ خانے میں چھوڑ آئی تھیں۔''

میں نے لرزتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی۔ ایک تھیلی میں رکھے ہوئے وہ گہنے میری نگاہوں میں جگمگانے لگے جو اس کے جسم اور چہرے پر دمکا کرتے تھے۔ میں نے تھیلی بند کر دی گٹھڑی کی دیگر اشیا میں اس کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں تھوڑی سی نقدی جو ایک رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی شیشی جو میں نے اسے نل پانی میں دی تھی۔ کچھ تصویریں جن میں ایک بڑی تصویر ہمارے بالو کی تھی بالو سے دور ہو کر اس نے نہ جانے کتنی بار اس تصویر کو چوما ہوگا، اس کے لئے روئی ہوگی۔ اس تصویر کی دید نے میری آنکھیں بھی نم کر دیں۔

میں اسد کو لے کر ایک بار پھر سلطانہ کی قبر پر گیا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اسے آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے۔ وہ جو کچھ بھی تھی، جارج گورا اور حکم جیسے لوگوں کے جبر کا ردِعمل تھا۔ پھر وہ آفتاب اور ہاشم جیسے شدت پسندوں کے ہتھے چڑھ گئی اور نادانستہ کہیں سے

کہیں پہنچ گئی۔

میں اور اسد قبرستان سے واپس آئے تو حسنات میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ پی کیپ والے اس لڑکے کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر لی وان کا بھتیجا تھا۔ عمران نے اس کی جان بڑے ڈرامائی انداز میں بچائی تھی۔ ہاشم اس لڑکے کو شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر بالکل آخری لمحات میں عمران نے ایک سچا نشانہ لگا کر ہاشم کو شوٹ کر دیا تھا۔

میں نے لی وان کے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔ حسنات نے کہا۔ ''جناب! یہ آج صبح مجھ سے ملا تھا۔ اس کے پاس آپ کے لئے ایک چیز تھی۔ اس نے مجھے دی اور کہا کہ آپ تک پہنچادوں لیکن میں نے کہا کہ تم خود ہی پہنچاؤ تو بہتر ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے ایک تہ شدہ لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''یہ آپ کے لئے ہے۔ مجھے آپ کی وائف نے دیا تھا۔''

''سلطانہ نے؟''

''جی ہاں۔''

''کب دیا تھا؟''

''جب ہم اسپتال میں بند تھے۔''

میں نے اس بارے میں لی وان کے بھتیجے سے تھوڑی سی تفصیل پوچھی۔ پتا چلا کہ اٹھرا گاؤں میں جب آفتاب اور ہاشم نے ہندو اور مسلمان مریضوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور حالات خراب سے خراب ہو رہے تھے تو سلطانہ نے یہ رقعہ اس کو دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔

لی وان کے بھتیجے اور حسنات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کمرے میں آیا اور بلب کی روشنی میں یہ تحریر پڑھی۔ میری نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ سارے واقعات ذہن میں پھر تازہ ہو گئے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کے نسخہ جات والے پیڈ کا کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر سلطانہ نے نیلی روشنائی سے لکھا تھا۔ ''مہروج! امید بندھ کر پھر ٹوٹ گئی ہے۔ حالات خراب ہو گئے ہیں۔ ہاشم رازی اس بات پر بالکل تیار ناہیں کہ ہم ماریا کو یہاں آزاد کریں۔ وہ اسے نل پانی

جا کر رہا کرنا چاہتے ہیں۔ ماریا کے وارثوں کو یہ بات قبول ناہیں۔ اللہ جانے اب کیا ہوئیں گا۔ ایک ایک کر کے لوگن مرنا شروع ہو جائیں گے اور پھر...... شاید...... میری باری بھی آ جائے۔ مہروج! اگر ایسا ہو گیا تو تم میرے بالو کا بہت خیال رکھنا۔ اسے زندگی میں کوئی دکھ نہ ہونے دینا۔ اسے یہ بھی کبھی نہ بتانا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا اور کیوں ہوا تھا۔

"اور ہاں مہروج! ایک بہت اِچ ضروری بات بھی تم سے کرنی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت بہت اچھے ہو۔ تم نے میرا بہت بہت خیال رکھا ہے۔ لیکن تم محبت صرف اور صرف اس لڑکی سے کرتے ہو جو پاکستان میں تم سے بچھڑ گئی تھی۔ تم بھول گئے ہو لیکن میں ناہیں بھولی۔ جب تم اپنے ہوش میں ناہیں تھے، میں نے راتوں کے اندھیروں میں تمہیں اس لڑکی کے لئے سسکتے اور روتے دیکھا ہے۔ اس کے لئے تڑپتے دیکھا ہے۔ جیسے کوئی بے کل پرندہ اپنا پنجرہ توڑ کر نکلنا چاہتا ہو۔ تم بھی اس راجواڑے کا پنجرہ توڑ کر ثروت تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اور مجھے وشواس ہے، تم اب بھی چاہتے ہو گے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو مہروج۔ اور اگر تم کرتے ہو تو وہ کیوں نہ کرتی ہوئے گی۔ وہ جہاں بھی ہوئے گی، تمہاری راہ دیکھ رہی ہوئے گی۔ ضرور دیکھ رہی ہوئے گی۔ تم اسے ڈھونڈو مہروج۔ وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی، میں جہاں بھی ہوں گی ضرور خوش ہوں گی۔ اگر دنیا میں نہ ہوئی تو میری روح خوش ہوئے گی۔ پھر اگر ہو سکے تو میرے بالو کو اس کی گود میں دینا اور اسے میرے بارے میں بتانا...... اور اس سے کہنا کہ دور اتر پردیش کے ایک راجواڑے میں اس کی ایک بہن تھی۔ وہ بن دیکھے اس سے بہت پیار کرتی تھی...... تمہاری سلطانہ۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نظر دھندلا گئی۔ میں دیر تک اس خط کے تاثر میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام ہو گئی۔ عمران کی آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اٹھ جاؤ، کب تک ایسے بیٹھے رہو گے؟ دیکھو تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ نل پانی میں دیوان کی ملازمہ صفیہ کھڑی تھی۔ اس کی گود میں ننھا بالو تھا۔ عمران نے بالو کو اپنی بانہوں میں لیا، اس کا منہ چوما اور پھر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس ننھی جان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے اندر جذب ہو گیا، میرے جسم کا حصہ بن گیا۔ مجھے اس کے بدن سے اس کی ماں کی مہک آئی۔ وہ اپنی گول مٹول مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

وہ معصوم اس جانکاہ حادثے سے بے خبر تھا جو اس پر گزر چکا تھا۔ اس کی قریب ترین

ہستی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسے اب کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور اس کا پیار کیا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کیا ہوتی ہے جو کوکھ سے جنم دیتی ہے اور پھر زندگی کی ہر مشکل کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی بے خبری پر میرا دل خون ہو گیا۔

میں نے اسے بہت پیار کیا۔ پھر اسے صفیہ کے حوالے کر کے ضروری ہدایات دیں۔ صفیہ کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ وہ بالو کے ساتھ طویل سفر کر کے ابھی کچھ ہی دیر پہلے نل پانی سے یہاں پہنچی تھی۔

عمران نے مجھے بتایا۔ "مراد شاہ صاحب کل زرگاں سے واپس نل پانی جا رہے ہیں مگر چھوٹے سرکار پانچ چھ مہینے یہیں گزاریں گے۔ وہ یہاں مختلف انتظامات کریں گے۔ اپنا نائب مقرر کریں گے اور بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کا عمل شروع ہو گا۔ انہوں نے برٹش باشندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں...... ٹھیک تیس روز بعد جو غیر ملکی یہاں ہو گا، وہ گرفتار ہو جائے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ نکل جائیں گے؟"

"نکل جائیں گے نہیں...... وہ لوگ نکل رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اڑ کر یہاں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اب یہاں ان کے اور ان کے بچوں کے سروں پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے۔"

میڈم صفورا بہت پریشان تھی۔ وہ ابرار صدیقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میڈم صفورا نے ہمیں صدیقی کے بارے میں جو آخری اطلاع دی تھی، وہ یہی تھی کہ صدیقی ایک قریبی پگوڈا میں خدمت گار کی حیثیت سے اپنی اسیری کے دن کاٹ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ صدیقی کی سزا کو معطل کرانے کی کوششیں بھی کرتی رہی تھی...... اور اب جبکہ ہم سب کی سزائیں ختم ہو چکی تھیں اور سزائیں دینے والے خود سزاؤں کی زد میں تھے، مولانا صدیقی ناپید ہو چکے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید پانچ چھ روز تک جاری رہنے والے خونی فسادات کے دوران میں صدیقی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہو یا پھر وہ خود ہی کہیں روپوش ہو۔ صدیقی اپنی طرز کا ایک عجیب کردار تھا۔ دین دار اور پارسا بھی۔ لالچی اور موقع پرست بھی۔ وہ نوادرات میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اسی دلچسپی کے سبب وہ بدھا کے مجسمے کی چوری میں ملوث ہوا اور میڈم صفورا کے ساتھ پاکستان سے یہاں لا پٹخا گیا۔

اگلے روز میڈم صفورا نے ایک اہم اطلاع دی۔ اس نے بتایا۔ "پگوڈا کے ایک عمر

رسیدہ بھکشو کا کہنا ہے کہ صدیقی چار پانچ روز پہلے زرگاں سے نکل چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک اسٹیٹ سے ہی نکل چکا ہو۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"پہلے تو نہیں تھا لیکن آج کل ہے۔ خاص طور سے جن دنوں زوردار لڑائی ہو رہی تھی، سرحدی پوسٹوں پر سارا سسٹم درہم برہم تھا۔ بہت سے لوگ جن پر مقدمے چل سکتے ہیں، ان چار پانچ دنوں میں اسٹیٹ سے نکلے ہیں۔ ان میں برٹش افراد بھی ہیں۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔" میں نے کہا۔ "بہرحال، آپ اس بارے میں پوری تسلی کر لیں۔ ابھی ہماری یہاں سے روانگی میں پانچ چھ روز باقی ہیں۔"

"پانچ چھ نہیں...... آٹھ دس روز۔" عمران نے فوراً کہا۔ "ابھی ہمیں یہاں ایک شادی میں شرکت کرنی ہے اور کچھ دیگر ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

"کس کی شادی؟"

"بھرت کمار اور چمپی کی۔ اس کے لئے مہورت نکالا جا چکا ہے۔ اونچی ذات کے لڑکے اور اچھوت لڑکی کی یہ شادی اس اسٹیٹ میں نئے رجحانوں کی بنیاد رکھے گی۔ اس جاہلیت پر ایک بڑی کاری ضرب لگائے گی جس کے علمبردار حکم اور بڑی ماتا جیسے لوگ ہیں۔"

"لیکن بھرت تو زخمی ہے شاید؟" میڈم صفورا نے کہا۔

"اس کی حالت اب بہتر ہے۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ سکتا ہے۔ سینئر ڈاکٹر نے کہا ہے، وہ تین چار روز تک ڈسچارج ہونے کے قابل ہو گا۔"

اجیت رائے عرف چھوٹے سرکار کے بارے میں اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے ہیں، یا ہونے والے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں کوئی مصدقہ بات تو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم اس بات میں تو شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ایک انصاف پسند اور روشن خیال شخص ہیں۔ جن دنوں میں سلطانہ کے ساتھ پہلی بار نل پانی گیا تھا، میں نے چھوٹے سرکار کے انصاف کا ایک یادگار منظر دیکھا تھا۔ ایک شاہی ہاتھی نے ایک غریب مزدور کو کچل دیا تھا۔ یہ ہاتھی چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کا تھا۔ چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کنور کو وہی سزا دی تھی جو کسی عام شخص کو دی جاتی۔ اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔

یہاں زرگاں میں چھوٹے سرکار نے بھرت کمار اور چمپی کی شادی کو آفیشل شادی قرار دیا اور اس کی سادہ سی باوقار تقریب راج بھون میں ہوئی۔ گندمی رنگت والی اچھوت لیکن

دلکش چمپی دلہن بن کر کشتری بھرت کمار کی حویلی میں پہنچ گئی۔ چھوٹے سرکار نے چمپی کے داج یعنی جہیز کا انتظام اپنی طرف سے کیا۔ اور یہ انتظام اتنا بیش قیمت تھا کہ بھرت کمار کے پتا کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ یقیناً ساری عمر کے لئے اس کا اور اس کے پورے خاندان کا منہ بند ہو چکا تھا...... اور پھر چمپی کی ڈولی راج بھون سے اٹھی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھیں اسے معمولی بات سمجھنے والا آنے والے دنوں میں زبردست مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔

ابرار صدیقی کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا اور اب میڈیم صفورا کے نزدیک ستر اسّی فیصد امکان اس بات کا تھا کہ صدیقی خونی ہنگاموں اور لڑائی کے دوران میں یہاں سے نکل چکا ہے۔ اب ہم اپنا رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ رخصت ہونا تھا۔ چھوٹے سرکار کے خصوصی حفاظتی دستے نے ہمیں اپنی نگرانی میں لینا تھا اور ایک طویل سفر کے بعد ہمیں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نکالنا تھا۔ اسٹیٹ کی حدود سے آگے کا چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں کپتان اجے کے ساتھ کرنا تھا۔ کپتان اجے کی ذمے داری تھی کہ ہمیں الہ آباد میں ایک مستقیم نامی شخص تک پہنچائے۔ یہ چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں اپنے رسک اور اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ بے شک اس سفر میں ان راستوں کا شناور کپتان اجے ہمارے ساتھ تھا پھر بھی اس سفر کے بہ خیریت طے ہونے میں ہماری قسمت کو بہت عمل دخل تھا۔ ہمیں مقامی طرز کے دیہاتی لباس فراہم کر دیئے گئے تھے۔ یہ چرواہوں کے لباس تھے اور زنانہ مردانہ دونوں طرح کے تھے۔

وہ ایک سرد شب کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زرگاں سو رہا تھا۔ اپنے سارے گلی کوچوں، شبستانوں اور جلوہ گاہوں سمیت۔ اس کے بارونق بازار خالی پڑے تھے۔ اس کے گھر غنودگی کے جھونکوں میں تھے...... اور ہم زرگاں کو اس حالت میں چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ہمارا اپنا فیصلہ تھا کہ ہماری رخصتی خاموشی سے ہو گی۔ اگر یہ علی الاعلان ہوتی تو شاید ہزاروں لوگ ہمارے راستوں پر جمع ہو جاتے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے جن کے لئے ہماری واپسی حوصلہ شکن ہوتی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگ ہم دونوں اور خاص طور سے مجھے بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر خاص و عام کی یہ خواہش تھی کہ ہم یہاں سے روانہ نہ ہوں۔ کم از کم...... چند ماہ تک تو کہیں نہ جائیں۔

لیکن ہمیں جانا تھا۔ یہاں ہمارا دانہ پانی پورا ہو چکا تھا۔ کچھ نئے راستے ہمیں پکار رہے تھے...... اور ہم اس آخر شب کے دُھند آلود سناٹے میں زرگاں کو الوداع کہہ رہے تھے......

زخمی انور خاں، طلال......بھرت کمار......ستیش......عبدالغنی......حسنات اور مبارک وغیرہ نے ہمیں بڑی محبت اور بڑے دکھ بھرے انداز میں الوداع کہا۔ چھوٹے سرکار اور ان کے قریبی مصاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس موقع پر مجھے چھوٹے سرکار کی طرف سے ایک گراں قدر تحفہ بھی دیا گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے جارج گورا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ جب اٹھرا گاؤں سے ہمیں پانڈے وغیرہ نے گرفتار کیا تھا تو یہ چاقو میرے لباس سے نکال لیا گیا تھا۔

سب سے رخصت ہو کر ہم بند جیپ میں آ بیٹھے۔ ایک نم ناک سی فضا میں ہمارا قافلہ چل پڑا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو ایک طرف سے طلال دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی کھڑکی سے لپٹ گیا۔ میں نے دروازہ کھلوایا۔ وہ زار زار رو رہا تھا۔ ”مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ چلی گئیں، آپ بھی جا رہے ہیں۔ میرے لئے اب یہاں کچھ بھی نہیں۔“

میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اسے پیار سے سمجھایا۔ ”تم یہاں سے نہیں جا سکتے طلال۔ تم تو آنے والے کل کی امید ہو۔ تم نے یہاں ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ آنے والے وقت میں یہاں کچھ اور رنجیت پانڈے، جارج گورے اور حکم جی پروان چڑھ سکتے ہیں۔ تمہیں انہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔ تم یہیں رہو گے طلال۔“

پتا نہیں وہ میری باتیں سمجھا یا نہیں لیکن میرے تسلی بخش انداز نے اسے حوصلہ دیا......

عمران نے کہا۔ ”طلال! ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تم سے رابطہ رکھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ہم یہاں کے حالات سے باخبر رہیں گے......تم سے وعدہ ہے۔“

ہم طلال کو بمشکل سنبھالنے اور الوداع کہنے میں کامیاب ہوئے۔

......ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے مڑ کر زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا۔ انہی روشنیوں میں کہیں وہ قبرستان تھا جہاں ایک بے مثال لڑکی اپنی تمام تر دلیری، شجاعت اور وفاداری کے ساتھ ابدی نیند سو رہی تھی۔

”خدا حافظ سلطانہ۔“ میں نے زیر لب کہا اور آنکھیں موند لیں۔

O......❖......O

اگلا دن ابر آلود تھا۔ ٹھٹھرا ہوا سورج چند منٹ کے لئے اپنی بیمار صورت دکھاتا اور پھر بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ ہمارا سفر درمیانی رفتار سے جاری رہا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حکم

ے بچے کھچے سپاہی کہیں کہیں جو مزاحمت کر رہے تھے، وہ بھی کچلی جا چکی تھی۔ پھر بھی گھڑسوار سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔

شام کو ہم نے گھنے سنسان جنگل میں پڑاؤ کیا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بلند و بالا درخت بھیگے ہوئے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی بات پر شرمسار ہوں۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اچانک میں چونکا۔ یہ جگہ جانی پہچانی لگی۔ تھوڑا سا غور کیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں نے جارج گورا کی حراست سے فرار ہونے کے بعد دو نہایت مشکل راتیں گزاری تھیں۔ ہاں، یہ وہی جگہ تھی۔ یہ چھوٹی سی آبی گزرگاہ جو جنگل کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی جاتی تھی اور جس کے کنارے جنگلی جانوروں کے قدموں کے بہت سے نشان تھے۔

دفعتاً مجھے ایک اور بات یاد آئی اور میں پھر چونک گیا۔ عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ وہ بولا ”تم تو اس جگہ کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پچھلے جنم میں یہاں کسی ہندوناری کے ساتھ لوسین کرتے رہے ہو۔“

”ہندوناری کے ساتھ تو نہیں مگر اپنی تنہائی کے ساتھ لوسین کرتا رہا ہوں۔“

”یہ کیا بے ہودہ بات ہے۔ ”تنہائی“ نے کوئی ساڑھی تھوڑی پہن رکھی ہوتی ہے۔ نہ ہی تنہائی کے سر پر لمبے ریشمی بال ہوتے ہیں۔ نہ ہی پتلی کمر ہوتی ہے۔ لوسین کے لئے ایسی دو چار چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے، جب میں جارج گورا کی رہائش گاہ سے فرار ہوا تھا تو انہی جگہوں پر بھٹکتا رہا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر کیا کیا تھا؟“

”وہی کیا ہو گا جو تمہارے آباؤ اجداد گاؤں کے کھیتوں میں کرتے رہے ہیں۔“

”یار! تم مذاق سمجھ رہے ہو......لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ اس وقت بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کبھی اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہیں سکوں گا۔ دوڑ دوڑ کر اور پھڑ پھڑا کر مر جاؤں گا لیکن مجھے آزادی نہیں ملے گی۔ اس وقت یہاں پانی کے کنارے بیٹھ کر میں نے ایک عجیب کام کیا میں نے ایک خط لکھا اور اسے بوتل میں بند کر کے اس ندی میں بہا دیا۔ وہ بوتل میرے سامنے بہتے بہتے دور چلی گئی۔ دریا کی طرف۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکل گئی ہو۔ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہو......اور دریاؤں کا آخری ٹھکانا تو سمندر ہی ہوتا ہے۔ کیا پتا کہ وہ سمندر تک پہنچی ہو۔ کسی کشتی راں یا کسی جہاز

کے سواروں نے اسے دیکھا ہو۔ پانی سے نکالا ہو۔ میرا خط پڑا ہو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا نے اپنا ساتواں بحری بیڑا تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا ہو۔ وہ الٹے پانیوں میں چلتا چلتا دریائے آمو میں پہنچا ہو اور پھر اگلے منگل تک یہاں اس جنگل میں پہنچ جائے۔ زبردست...... کتنا مزہ آئے کہ یہ بیڑا یہاں آ کر ریت میں پھنس جائے۔ بیڑے کے سارے مرد فوجیوں کو تیندوے کھا جائیں یا ہاتھی کچل دیں۔ بس لڑکیاں بچ جائیں۔ ہو ہو ہو...... ہر بندے کے حصے میں پانچ پانچ لڑکیاں اور وہ بھی امریکن۔ نیو ورلڈ آرڈر......''

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا، ہمیں اجے کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بوندا باندی سے بچنے کے لئے اس نے چھتری لے رکھی تھی۔ ایک اضافی چھتری وہ ہمارے لئے لا رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے یہ چھتری مجھے تھما دی۔

''کیا کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جانا تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک جنگل باسی کی جھونپڑی ہے۔ ایک عمر رسیدہ مسلمان بزرگ ہے، اپنے دو مریدوں کے ساتھ عرصے سے یہیں رہتا ہے۔ مسافر محفوظ سفر کے لئے اس سے دعائیں کرواتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی کروا سکتے ہیں۔''

''اگر زیادہ دور نہیں تو چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ ہم رم جھم میں ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اجے کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس جھٹپٹے میں اس طرح چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد ہم گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر واقع ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جھونپڑی تین درختوں کے تنوں کے اوپر زمین سے قریباً دس فٹ کی بلندی پر تیار کی گئی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لئے بانس کی سیڑھی موجود تھی۔ اندر مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھی کے قریب ایک نوجوان باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے دستے والی کلہاڑی تھی...... ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس نے ہم سے دو چار سوال کئے۔ وہ اس بات پر کچھ حیران بھی تھا کہ ہم اس ابر آلود شام میں کیچڑ زدہ راستے پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچے ہیں۔ وہ سیڑھی چڑھ کر اوپر گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمیں بھی اوپر بلا لیا۔

بزرگ کی عمر اسی پچاسی برس رہی ہوگی۔ لمبی سفید داڑھی، بھاری پلکیں، وہ ایک بوسیدہ

کمبل لئے بیٹھے تھے۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نیکوکار اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں گم رہنے والے شخص ہیں۔ اجے کے بقول یہ بات مشہور تھی کہ ان کی دعا سے سفر کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور بھٹکے ہوئے راہیوں کو راستے ملتے ہیں۔

ہم نے بھی ان سے اپنے لئے دعا کرائی...... انہوں نے گڑ اور سوکھی کھجوروں سے ہماری تواضع کی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے، اچانک میری نظر ایک چیز پر پڑی اور میں حیران رہ گیا...... میں نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ کچھ دیگر اشیا کے ساتھ وہ شیشے کی بوتل بھی ایک کونے میں پڑی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے چلتے پانی میں بہایا تھا...... ہاں، یہ وہی بوتل تھی...... سو فیصد وہی تھی۔ میں نے اسے کسی دور دراز کے سفر کے لئے ندی میں بہایا تھا۔ مگر...... وہ دور دراز کے سفر پر نہیں گئی تھی۔ یہ تو بس ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا سفر طے کر کے اس جھونپڑی کے گوشے میں پڑی تھی۔

میں حیران رہ گیا۔ بوتل کے اندر وہ مڑا تڑا کرنسی نوٹ بھی اسی طرح موجود تھا جو میں نے اس میں ڈالا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بیٹا جی!'' عمر رسیدہ شخص نے میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... یہ بوتل...... آپ کو کہاں سے ملی؟''

عمر رسیدہ شخص نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ہولے سے بولے۔ ''سامنے والی ندی سے...... گھاس میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں وضو کر رہا تھا۔ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے نکال لی۔''

میں نے بزرگ کی اجازت سے بوتل اٹھائی۔ اس میں دو انگلیاں ڈال کر اپنا لکھا ہوا خط نکالا۔ بزرگ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مجھ کو لگتا ہے کہ تم یہ بوتل پہچانتے ہو...... کہیں...... تم نے ہی تو اسے پانی میں نا ہیں بہایا تھا......''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ ندی کنارے اداس بیٹھا تھا۔ کنارے پر اٹکی ہوئی اس بوتل پر نظر پڑ گئی۔ یونہی وقت گزاری کے لئے میں نے نوٹ پر یہ رقعہ لکھ کر اس میں ڈال دیا اور پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں کی یہیں رہے گی......''

بزرگ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''دیکھو، کتنا عجیب اتفاق ہے۔ تم نے اس بوتل کو جہاں پھینکا تھا، یہ وہیں سے تم کو مل گئی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ کہیں نہیں گئی

لیکن اس نے کہیں نہ جا کر بھی بہت لمبا سفر کیا ہے اور اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ کیا یہ بڑی بات نا ہیں ہے؟''

''میں سمجھا نہیں بزرگوار۔''

وہ بولے۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ ہزاروں میل کا سفر کر کے بھی کسی کی نظر میں نہ آ سکتی...... کسی کی توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ لیکن یہ ایک بالکل چھوٹا سا سفر کر کے مجھ تک آ گئی۔ میں نے تمہاری تحریر پڑھی...... تمہارے درد کو محسوس کیا۔ میرے ناچیز ذہن میں تمہارے لئے فکر جاگی۔ میں نے تمہارے لئے اپنے رب کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ وہ غفور الرحیم ہے...... سنتا ہے۔ مجھ جیسا حقیر بندہ بھی جب ''دل'' سے کچھ مانگتا ہے تو وہ عطا کرتا ہے۔''

میں گم صم کھڑا تھا، عمران اور اسد بھی خاموش تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بزرگ کا سرخ و سپید چہرہ کسی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں بزرگوار...... وہ عطا کرتا ہے۔ ہم نے پچھلے چند ہفتوں میں اس کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ہم سخت مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہمیں آگے بھی کچھ سخت مرحلے درپیش ہیں۔ ہمیں آپ کی مزید دعاؤں کی ضرورت ہے جناب۔ آپ ہمارے لئے خصوصی دعا فرمائیے......''

بزرگ کے پاس گزرے ایک دو گھنٹوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس درویش صفت شخص سے رخصت ہو کر واپس اپنے پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ بوتل اب میرے پاس تھی۔ اس کے اندر رکھا جانے والا رقعہ میری جیب میں تھا۔ عمران نے کہا۔ ''بھئی واہ...... آج تک تو ہم نے ایسی بوتلوں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ لمبے سفر کر کے دور دیس کے نامعلوم لوگوں تک پہنچتی ہیں اور پھر ان میں موجود خطوں سے کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پہلی بوتل ہے جو کہیں گئی بھی نہیں اور پھر بھی اپنا کام دکھا گئی ہے...... پڑھ کر تو سناؤ اس میں لکھا کیا تھا تم نے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ بس دو تین فقرے تھے۔'' میں نے کہا اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر عمران کے سامنے پڑھا۔ اس کاغذ یعنی کرنسی نوٹ کے کنارے پر میں نے شاخ کے قلم اور اپنے زخم کے خون سے لکھا تھا۔ ''میرے پیارو! میں زندہ ہوں میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا...... تابش۔'' نوٹ پر تین نام یعنی فرح، عاطف اور ثروت بھی لکھے تھے۔ ہم دیر تک اس نوٹ اور اس کی تحریر پر تبصرہ کرتے رہے۔ اپنوں سے ملنے کا سپنا آنکھوں میں اجاگر ہو گیا۔

...... بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنا ایک سپنے جیسا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی بہت بڑی جیل سے اچانک آزاد فضاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تقریباً پچاس کلومیٹر کا سفر چرواہوں کے بھیس میں طے کرنا تھا۔ ہم ایسے چرواہے تھے جنہیں بھیڑ بکریاں چرانے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ فی الوقت بھی ہمارے پاس بھیڑ بکری نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہم نے چرواہوں کے لباس پہن لئے۔ سروں پر پگڑ بھی رکھ لئے۔ مسلسل سفر نے حلیے پہلے ہی خراب کر رکھے تھے۔ مزید خرابی کے لئے بالوں میں دھول ڈالی گئی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا گیا۔ مردوں نے کانوں میں بالیاں ڈالیں۔ میڈم صفورا، نوری اور صفیہ نے کنگن پہنے۔ میڈم صفورا کا حلیہ دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ پینٹ شرٹ اور بوائے کٹ بالوں والی ایک اسٹائلش عورت تھی۔ چرواہی کے بھیس میں اسے چولی اور گھاگرا پہننا پڑا۔ اپنا منہ سر، بھاری اوڑھنی میں چھپانا پڑا۔ اسے دیکھ کر عمران کی ہنسی چھوٹی تو اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ وہ منہ پھیر کر ہنستا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میڈم جانتی تھی مگر خاموش رہی۔ اسے اب عمران کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ عمران اپنی طرز کا انوکھا بندہ ہے۔ وہ عمران کا احسان بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ عمران نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک نہایت زہریلے سانپ کا زہر میڈم کے بدن سے چوسا تھا۔ وہ سنگین واقعہ ہم سب کی یادداشت میں درج تھا۔

ہمارے لئے بھیڑ بکریوں کا انتظام اسٹیٹ کی حدود ختم ہونے سے دو تین میٹر پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ریوڑ تھا۔ اس میں ایک اصلی چرواہا اور چرواہی بھی موجود تھے۔ ہمارے لباسوں کے اندر اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے میرے اور عمران کے علاوہ اسد نے بھی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ریوڑ میں ایک خچر بھی موجود تھا۔ اس پر کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ میں وہ شاندار دور مار رائفل بھی موجود تھی جس سے عمران نے پچھلے دنوں میں چند یادگار نشانے لئے تھے۔

بہرحال، ہمارا یہ سفر خیریت سے گزرا۔ راستے میں دو تین جگہ ہمارا گزر چیک پوسٹوں کے قریب سے ہوا۔ ایک جگہ ہمیں روکا بھی گیا۔ صفورا، نوری اور صفیہ لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ ہماری صورتوں پر شک کیا جا سکتا تھا مگر ہماری جگہ اصلی چرواہے نے ہی بی ایس ایف کے اہلکاروں سے بات کی اور ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے لئے ہمیں بی ایس ایف کے اہلکاروں کو معمولی رشوت بھی دینا پڑی۔ یعنی بکریوں کا چار پانچ کلو دودھ اور ایک چھوٹا سا میمنا۔

کپتان اجے کمار ہمارا بہترین راہنما اور مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی مقامی چرواہے کے بھیس میں تھا، تاہم ہمارے خیریت کے اس سفر میں اس کی راہنمائی کے علاوہ چھوٹے سرکار کے انتظامات کو بھی عمل دخل تھا۔ ہم جہاں پہنچتے تھے، ہمارے پروگرام کے مطابق ہمارے لئے اسباب پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ الہ آباد سے تقریباً تیس کلومیٹر دور ماچھی گڑھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک مسلمان زمیندار کے گھر میں ہماری شب بسری کا انتظام کیا گیا تھا۔ ماچھی گڑھ میں ہم چرواہوں کے بھیس سے دوبارہ عام لوگوں کے بھیس میں آ گئے۔ اصلی چرواہا اور چرواہی اپنی بھیڑ بکریوں سمیت ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں بڑے سادہ اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا سفر بڑا اچھا گزرا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ دونوں سگے بہن بھائی تھے۔ بہن ایک سال بڑی تھی۔ بھائی چھوٹا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بہن کی نسبت ہمیں بھائی کسی حد تک افسردہ نظر آیا تھا۔ بہن اسے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس نوجوان چرواہے کی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد اپنے نومولود بچے سمیت پانی کے ایک گڑھے میں گرنے سے مر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بچے سے بہت پیار کرتا تھا۔ ان کی موت نے اسے نیم دیوانہ کر دیا تھا مگر اب وہ بتدریج سنبھل رہا تھا۔

میرے سینے میں بھی تو ایک ایسا ہی غم انگاروں کی طرح دہکتا رہتا تھا۔ میری سلطانہ بھی تو مجھے چھوڑ گئی تھی لیکن مجھے اس چرواہے کا غم اپنے غم سے بڑا لگا...... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ نانک دکھیا سب سنسار۔

ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہمیں الہ آباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ عجیب اور ناقابلِ یقین۔ مجھے ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ عمران میں کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ رات کوئی ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا۔ میں اور عمران حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ مجھے گاؤں کی کسی قریبی گلی میں کتے کی آواز سنائی دی۔ یہ بھاری آواز مسلسل تاریکی کی لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ عمران اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ میں نے لالٹین کی لَو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اسی دوران میں گلی میں سے ایک بار پھر کتے کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ مجھے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس ہوئی...... مجھے لگا میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہوئی ہے۔ یہ وہی آواز تھی۔ یہ وہی جسیم کتا تھا جسے ہم نے اٹھرا گاؤں کے ٹھٹھرے ہوئے کھیت میں دیکھا تھا۔ میں چپل پہن کر تیزی سے برآمدے میں آیا۔ وسیع صحن کے

آخری سرے پر حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ میں دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آ گیا۔ یخ بستہ ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے عمران نظر آ گیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ایک سایہ سا اس کے پاؤں میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وہی کتا تھا۔ وہ عمران کے پاؤں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ الٹا سیدھا ہو رہا تھا۔ اس کی دُم بے ساختہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ عمران اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اور گردن کے بال سہلا رہا تھا۔

میں چند قدم آگے آیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کتا اٹھرا گاؤں سے قریباً ایک سو بیس کلومیٹر دور یہاں تک ہمارے پیچھے آیا ہے...... اچانک عمران کو احساس ہو گیا کہ میں اس سے کچھ فاصلے پر یہاں گلی میں موجود ہوں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ ''عمران! یہ وہی کتا ہے؟'' میری آواز حیرت سے لرز رہی تھی۔

''ہاں، یہ وہی ہے۔ مجھے کل رات بھی شک ہوا تھا کہ یہ ہمارے خیمے کے آس پاس موجود ہے۔ شاید یہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔''

''یار! یہ بڑی حیران کن بات ہے'' میں نے کہا۔

''کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں میں ''اینیمل ماسٹری'' بھی تو ہے۔ یہ تو تم ہی ناقدرے ہو جو گھاس نہیں ڈالتے ہو۔ جگر! اتنا پیار کسی پتھر سے بھی کروں نا تو وہ سچ مچ میرے پیچھے آنا شروع ہو جائے۔'' وہ ادا سے مسکرایا۔

میں الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا...... ان لمحوں میں اس کی آنکھوں کے شیشے میں واقعی ایسا کچھ نظر آیا جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ کچھ دیر تک اس جسیم کتے کو بہلانے اور پچکارنے کے بعد اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ اور وہ واقعی یوں واپس چل پڑا جیسے اس سے وداع ہو کر جا رہا ہو۔ کچھ دیر تک اس کا متحرک ہیولا ماچھی گڑھ کی تاریکی میں نظر آتا رہا پھر اوجھل ہو گیا۔ ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہم شہر رنگ و بو الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ایک طویل عرصہ کی الگ تھلگ جزیرے پر گزارنے کے بعد ایک جیتی جاگتی، ہنستی بستی دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ بڑے شہروں کے جانے پہچانے مناظر نگاہوں کے سامنے آئے۔ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک، انسانوں کا ہجوم، بارونق بازار، ٹی وی، سینما ہاؤس، چائے خانے، ریسٹورنٹ، پارک، تفریح گاہیں۔ میں ہر منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لئے ایک عجوبہ تھا۔ ہمیں ایک فور اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارا اندراج فرضی ناموں سے تھا۔ شام کے وقت

ہم بالائی منزل کی لابی میں بیٹھے نیچے سڑک پر رواں دواں زندگی کا نظارہ کرنے لگے۔ میڈم صفورا، اسد اور اے جے بھی وہیں تھے۔

عمران نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی اُلو کو اندھیری جگہ سے نکال کر اچانک روشنی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ نالائق شخص، ایسے ہر چیز کو ندیدوں کی طرح دیکھو گے تو مشکوک قرار پاؤ گے۔ خاص طور سے لڑکیوں کو دیکھنا تو بالکل ترک کر دو۔ تمہاری جگہ یہ کام میں کئے دیتا ہوں۔ میں یہ کام نسبتاً اچھے طریقے سے کرلوں گا۔''

اس نے جیب سے ہلکے رنگ والے سن گلاسز نکالے اور لگا لئے۔ سن گلاسز اسے ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''جیمز بانڈ لگ رہا ہوں یا نہیں؟''

''جیمز بانڈ تو نہیں، انعامی بانڈ لگ رہے ہو۔ اور وہ بھی ایسا جو پانچ سو قرعہ اندازیوں میں شامل ہونے کے بعد بھی نہ نکلا ہو۔''

''تم میری توہین کر رہے ہو اور یہ بھول رہے ہو کہ جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے...... بلکہ میں پورے کا پورا تمہارے پیچھے ہوں۔''

اسد بولا۔ ''یعنی...... تمہارا مطلب ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک عورت کا ہاتھ ہی ہو۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اس بندے میں تھوڑی سی بھی احسان شناسی ہوتی تو اپنے گلے میں ڈھول ڈالتا اور میرے آگے آگے ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے چلتا۔ اے الٰہی آباد کے رہنے والو! استقبال کرو میرے محسن کا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تابی کو تابی بنایا۔ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اتنا سکھایا اتنا سکھایا کہ ایک دن وہ جارج گورا جیسے شخص سے متھا لگانے اور اسے مار گرانے کے قابل ہوا۔ اور ایک جارج گورا ہی نہیں، اس نے تابی کو ہر ہر موڑ پر جارج گوروں اور سیٹھ سراجوں اور میڈم صفوروں سے لڑنا سکھایا ہے۔''

''میڈم صفوروں'' کا لفظ اس نے ہولے سے بولا تھا پھر بھی میڈم کو بھنک پڑ گئی۔ وہ کافی پیتے پیتے چونک کر بولی۔ ''تم نے میرے بارے میں کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں میڈم۔'' وہ صاف مکر گیا۔

''میں نے خود سنا ہے۔ تم نے میڈم کہا ہے۔''

''نن...... نہیں...... میں تو میڈم نور جہاں کی بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ تابی اور میڈم نور جہاں کی لڑائی ہوئی تھی نا...... تو میں نے صلح کرائی تھی۔ یہ بھی بڑا عجیب واقعہ ہوا تھا۔'' وہ تالی

بجا کر بولا۔ ''میڈم نور جہاں...... فلمسٹار ریما کو بیٹیوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی شریف، خوش شکل اور مخلص بندے سے شادی کر کے اپنا گھر بسائے۔ فلم لائن میں تو انہیں ایک بھی ایسا بندہ نظر نہیں آتا تھا۔ آ جا کے ان کی نظرِ کرم مجھ پر ہی جاتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو قریب لانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یا تو میں سرکس چھوڑ کر فلموں میں اداکاری شروع کر دوں یا پھر ریما جی فلمیں چھوڑ کر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلایا کریں۔ ایک روز اس سلسلے میں انہوں نے بات کرنے کے لئے مجھے بلایا۔ تابی بھی ساتھ تھا...... تابی نے غلطی سے میڈم کے سامنے ڈکار مار دی۔ بس انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے گرج کر کہا، وے توں ڈکار مار کر مینوں دس رہیا ایں کہ توں گھروں رج کے آیا ایں۔ یعنی تم ڈکار مار کر مجھے بتا رہے ہو کہ گھر سے کھا پی کر آئے ہو۔ تابی نے بہتیرا کہا کہ غلطی سے ڈکار نکل گئی ہے مگر وہ واقعی غصے میں تھیں۔ وہ تو ہمارے لئے لمبے چوڑے لنچ کا انتظام کر رہی تھیں...... وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں...... لیکن جب......''

اچانک عمران چپ ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ میں اب اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب میں نے ایک شخص کو تیزی سے ایک دروازے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عمران کے اندر جیسے اچانک ہی کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ اس کے بعد وہ چائے تو پیتا رہا اور باتوں میں بھی حصہ لیتا رہا مگر اس کی چہکار ختم ہو چکی تھی۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم اپنے اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں نے عمران کو پہلے اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے...... کچھ بتاؤ گے نہیں؟'' میں نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تمہارے ساتھ رہنے کے بعد اب میری نظر بھی کافی تیز ہو گئی ہے۔ میں نے لابی میں چائے پیتے ہوئے کچھ دیکھا ہے۔''

''کیا دیکھا ہے؟''

''وہی جو تم چھپا رہے ہو۔ کالی جیکٹ والا وہ بندہ جو تمہیں دیکھ کر اچانک سیڑھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد سے تمہارا چہکنا بالکل بند ہے۔''

''بولوں تب مصیبت، نہ بولوں تب مصیبت۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب خاموش رہنا چاہئے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا چاہئے۔''

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''وہ بہت خطرناک بندہ ہے یار۔''

''تم سے بھی خطرناک؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے تیرے جیسے اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ وہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ بندہ ہے...... اور میرا خیال ہے کہ وہ اب کسی بھی وقت یہاں ہمارے کمرے میں پہنچنے والا ہے۔''

''یہاں پہنچنے والا ہے؟ کیا کرے گا وہ یہاں آ کر؟''

''یہ تو پتا نہیں لیکن...... جو ہوگا بہت برا ہوگا۔''

''مگر یہ ہے کون؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

''سفید کپڑوں میں ایک پولیس والا۔ سجاد موہل نام ہے اس کا۔ بظاہر یہ تمہیں عام سا شخص لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں۔''

''یہ تمہیں پہلے سے کیسے جانتا ہے...... تم تو شاید پہلی بار انڈیا آئے ہو؟''

''تمہارے ساتھ پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے پہلے اپنے سرکس کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ روسی فن کار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے بمبئی کے علاوہ اور کئی شہروں میں بھی جھک ماری تھی۔''

''سرکس میں کام کرنا کوئی جرم ہے جو تم اس الہ آبادی پولیس والے سے ڈر رہے ہو؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔''

وہ اٹھا اور تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر چیک کرنے لگا۔ چیک کرنے کے بعد اس نے پستول دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یار! ہمارے لئے خطرناک قسم کے پولیس والے ہی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے پانڈے سے جان چھوٹی ہے تو اب تم اس نئی آفت کا ذکر فرما رہے ہو۔''

''اسی کو کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی اسٹیٹ سے باہر تشریف لائے دو ہی دن ہوئے ہیں اور اس نانہجار سے ملاقات ہوگئی ہے......''

اچانک ہمارے بائیں جانب والی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی۔ کسی نے اسے باہر سے ٹانگ رسید کی تھی۔ ایک نوجوان کود کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی سیاہ جیکٹ والا شخص تھا۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال رہی ہو گی۔ کھچڑی بال مہندی میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ صورت سے ہی کرخت مزاج اور غصیلا نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم یہ پستول اس کی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب

کے اندر ہی تھا۔ وہ بے پناہ اعتماد سے کھڑکی سے باہر ہی کھڑا رہا۔ اس کے ساتھی نوجوان نے مقامی لب و لہجے میں دھمکایا۔ ''خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ یو آر انڈر اریسٹ۔''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں جھپٹ کر اس نوجوان پر حملہ کر سکتا ہوں۔ دوسری طرف عمران کھڑکی کے پاس تھا۔ وہ جست لگا کر کالی جیکٹ والے کو دبوچ سکتا تھا لیکن جب میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں لکھا ہوا پیغام صاف نظر آیا۔ وہ مجھے حملہ کرنے سے روک رہا تھا اور خود بھی ہرگز حملے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے...... ''بظاہر یہ تمہیں عام سا بندہ لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں......''

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ درحقیقت میرے اور عمران کے درمیان ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ پیدا ہو چکا تھا میں اس بارے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بہت رمز شناس ہو گئے تھے۔ میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ عمران مجھے ری ایکٹ کرنے سے روک رہا ہے اور خود بھی ری ایکٹ کرنے کا رسک نہیں لے رہا۔

پستول بردار نوجوان جو بعدازاں خود بھی پولیس والا نکلا، دروازے کی طرف گیا اور پھر اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ جیکٹ والا اندر آ گیا۔ ہمارا کمرا طویل کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ اتفاقاً اردگرد کے چند کمرے خالی تھے۔ باقی کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہاں ہونے والی کارروائی کا پتا کسی کو نہیں چلا۔ جیکٹ والے نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''مجھے وشواس نہیں تھا کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ پاؤں گا...... اور وہ بھی پھر اسی شہر میں۔''

عمران بولا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں قانونی طور پر انڈیا آیا ہوں۔ میرے پاس کاغذات ہیں۔''

''تم قانونی طور پر انڈیا آئے ہو گے لیکن یہاں سے بھاگے تو قانونی طور پر نہیں تھے۔ تمہاری پوری فائل ہے میرے پاس۔ اور اب اسی فائل کے آخری صفحے پورے کرنے کا سمے آ گیا ہے۔''

''لیکن میری بات سنو......''

''باقی ساری باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ وہ وردی میں نہیں تھا، اس لئے مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس رینک کا افسر ہے۔

''مگر آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ......''

''تم ہمیں بھاشن مت دو اور نہ ہی قانون سکھاؤ۔ بس چپ چاپ چلو ہمارے ساتھ۔ اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔''

عمران مجھے دبا دبا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ ورنہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں ان دونوں سادہ پوش پولیس والوں پر قابو پانا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔ میں نے ایک بار پھر عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو یہ سجاد نامی شخص کہہ رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ تقریباً پانچ فٹ دس انچ قد والا ایک عام سے جسم والا، عام سا شخص ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جا رہا تھا اور عمران اس کی بات ماننے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔

ہم آگے پیچھے کمرے سے نکلے اور قالین پوش کوریڈور میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کچھ آگے جا کر عمران نے سجاد سے کہا۔ ''اگر یہ معاملہ ہمارے درمیان طے ہو سکتا ہے تو......''

''ہمارے درمیان کچھ طے نہیں ہو سکتا...... تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اگر تم نے یہ بات دوبارہ کی تو میں لوگوں کی پروا کئے بغیر تمہارے منہ پر تھپڑ جڑ دوں گا۔ بس چپ چاپ چلتے رہو۔'' سجاد نے کہا۔

اس کا رویہ میرے ذہن میں چنگاریاں سی چمکا رہا تھا۔ ہم مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ایک انتہائی سنگین دور سے گزر کر آئے تھے۔ زرگاں کی وہ خون آشام رات ابھی کل کی بات تھی جب پرانے قلعے کے سامنے نل پانی اور حکم کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا...... بارود کی بارش ہوئی تھی۔ لاشوں کا فرش بچھا تھا۔ ہم بھی اس میدانِ جنگ کا حصہ تھے اور سرخرو ہو کر نکلے تھے...... اور آج الٰہ آباد کا یہ چھریرے جسم والا پولیس اہلکار صرف اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ہمیں ہانک کر لے جا رہا تھا۔ عمران ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز اس صورتِ حال کو قبول نہ کرتا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک ہم اس طرح آئے کہ سجاد اپنا ہاتھ کالی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ڈالے ہمارے عین پیچھے چل رہا تھا جبکہ اس کے نوجوان ساتھی نے اردگرد کی پروا کئے بغیر پستول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اکا دکا راہ گیروں نے اس کے پستول کو دیکھا اور ان کے چہروں پر خوف و ہراس بھی نمودار ہوا تاہم کسی نے بھی اس صورتِ حال میں کسی طرح کی مداخلت کی ہمت نہیں کی۔

پارکنگ میں سفید رنگ کی ایک پرائیوٹ کار موجود تھی۔ کار میں ایک ڈرائیور پہلے سے

موجود تھا۔ "تم آگے بیٹھو۔" سجاد نے تحکم سے عمران کو مخاطب کیا۔

عمران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجھے پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ سجاد اور اس کا نوجوان ساتھی میری دونوں جانب بیٹھ گئے۔ نوجوان نے اپنا سرکاری پستول باقاعدہ میرے پہلو سے لگایا ہوا تھا۔ یہ لوگ ذرا سی رعایت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اچانک ایک اور کارروائی ہوئی۔ میری بائیں طرف بیٹھے سخت گیر نوجوان نے ایک آہنی کڑا میری پنڈلی کے نچلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی۔ ایسے کڑے عام طور پر تھانوں میں پولیس والوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

گاڑی میں پہنچنے کے بعد ان پولیس اہلکاروں نے آپس میں جو بات چیت کی، اس سے پتا چلا کہ کالی جیکٹ والا سجاد ڈی ایس پی ہے۔ نوجوان جس نے پستول میرے پہلو سے لگا رکھا تھا، سب انسپکٹر تھا اور یہ ڈی ایس پی سجاد کا قریبی عزیز بھی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دراز قد ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی اور الہ آباد کی بھری پری سڑکوں سے گزرنے لگی۔ رات ہو چکی تھی۔ بازار جگمگا رہے تھے اور ٹریفک رواں دواں تھا۔ راستے میں عمران نے ایک بار پھر ڈی ایس پی سجاد سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے سخت لہجے میں اسے خاموش کر دیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم جس جگہ پہنچے، وہ پولیس اسٹیشن نہیں تھی بلکہ رہائشی علاقے میں درختوں سے گھری ہوئی ایک کوٹھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ انڈیا اور پاکستان میں پولیس والوں کے نجی ٹارچر سیل اور تفتیشی مراکز بھی ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کوئی ایسی جگہ ہی تو نہیں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ گاڑی ایک نیم تاریک پورچ میں رکی۔ ایک چوکیدار نے پولیس والوں کے انداز میں سجاد کو سلوٹ کیا۔ ہمیں ایک اندرونی کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں دو بوسیدہ چارپائیاں اور لحاف پڑے تھے۔ ایک طرف پرانا سا جستی ٹرنک رکھا تھا۔ چھت سے لوہے کی دو زنگ آلود زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار میں دو آہنی کڑے نصب تھے۔ کمرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں لوگوں سے تفتیش ہوتی ہے اور انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کو اندر دھکیل کر کمرے کا وزنی آہنی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

میں اور عمران چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں آہنی دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں اندر کی طرف مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کھڑکی کے تین چوبی پٹ گرل سے باہر لگے تھے اور باہر کی طرف ہی کھلتے تھے۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک بڑا سا ایگزاسٹ فین بھی دکھائی دیا۔ کمرے میں بند

کرنے سے پہلے ہماری اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ بہرحال، سگریٹ کا پیکٹ اور ایک لائٹر عمران کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھے۔ عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔''

''خود کچھ پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہ لوگ کر دیں گے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میری جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ ''یار! یہ کوئی بات ہے۔ الٰہی آباد کے دو پلسیے ہمیں بکریوں کی طرح ہانک کر یہاں اس ٹارچر سیل میں لے آئے ہیں۔ کیا ہم......''

''معمولی پولیس والے نہیں۔'' عمران نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''اگر تم نے اس سجاد موہل کو معمولی سمجھا تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یہ شخص ہمیں اتنا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم غور کرو، اگر میں اس شخص کو اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔''

''یار! اگر کوئی وجہ ہے تو مجھے بھی بتاؤ نا۔ میری برداشت جواب دے رہی ہے۔ یہ نہ ہو میں دھوکے میں مارا جاؤں۔ تم سن ہی رہے تھے، وہ خبیث راستے میں کیا باتیں کر رہا تھا ہمارے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں۔ لگتا ہے کہ کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا ہے اس میں۔''

''آہستہ بولو یار یہ جنونی شخص ہے۔ دو سال پہلے میرا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ اور بہت برا پڑ چکا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اللہ آباد میں اس سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، تین چار افراد دندناتے ہوئے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل پولیس کی خاکی وردی میں تھا، باقی سادہ لباس میں تھے۔ دو افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ انہوں نے اپنی انگلیاں لبلبی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں دبلے پتلے جسم لیکن نہایت کرخت چہرے والا سجاد موہل چلا آ رہا تھا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اور وہ اس پر کسی نامعلوم شخص کی ماں بہن ایک کرتا چلا آ رہا تھا۔

سجاد نے فون بند کیا۔ اس کے اشارے پر ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ ''منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' سجاد نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو تم؟'' عمران نے پوچھا۔

''تمہارے پیچھے گولی مارنا چاہتا ہوں تاکہ تم شہید نہ بن سکو۔ پتا چلے کہ تم بھگوڑے ہو اور تم نے بھاگتے ہوئے گولی کھائی ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کی ماں کی ایسی تیسی۔ جو میں بک رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ ورنہ سچ مچ تمہارے اندر دو تین روشن دان کھول دوں گا۔'' سجاد کا لہجہ جنونی ہو گیا۔

عمران چند لمحے ہچکچایا پھر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ حالانکہ میں ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پنڈلی والی زنجیر ابھی تک میرے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔

اب ہم دونوں کے سامنے سپاٹ دیوار تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں ہمارے ہیولے بائیں جانب دکھائی دے رہے تھے۔ ''اپنے ہاتھ پیچھے موڑو۔'' سجاد موہل کی طرف سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی جانے والی ہے۔ عمران نے جیسے آخری کوشش کے طور پر اپنا رخ ڈی ایس پی موہل کی طرف پھیرا اور کہا۔ ''اگر تم میری پوری بات سن لو گے تو شاید اپنی رائے بدلنے پر تیار ہو جاؤ۔''

سجاد موہل کا جواب بڑا سخت تھا۔ ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے عمران پر اپنے سرکاری پسٹل سے گولی چلائی۔ یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری اور میرے سامنے دیوار کا تھوڑا سا اور پلاستر اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ سجاد موہل گرجا۔ ''کمینے! اگلی گولی تیرے کھوپڑے میں ماروں گا۔ منہ دوسری طرف کر...... دوسری طرف کر۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر رخ پھر دیوار کی طرف پھیر لیا...... اور ہاتھ پیچھے کر دیئے۔ میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے مجھے عندیہ دیا کہ میں سجاد کی ہدایت پر عمل کروں۔

میں نے بھی چار و ناچار ہاتھ پیچھے موڑ دیئے اور حقیقت یہی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے خود پر بے پناہ جبر کرنا پڑا۔

دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے کرخت انداز میں ہمارے ہاتھوں میں یخ بستہ ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگا جب ہم چائے پینے کے لئے ہوٹل کی بالکونی میں آئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس موہل نامی بلا نے ہمیں نیچے سڑک پر سے

ہی تاڑا ہوا اور پھر اوپر آ گیا ہو۔

''چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔'' موہل نے نیا حکم صادر کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ایک آٹومیٹک رائفل اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود چاروں افراد کے چہروں سے سفاکی برس رہی تھی اور خاص طور سے موہل کا چہرہ بے رحمی کی تصویر تھا۔ ''اب اپنی کس ماں کا بدلہ لینے آئے ہو یہاں؟'' موہل دانت پیس کر بولا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو موہل۔ میں کسی ایسی نیت سے یہاں نہیں ہوں۔ میں اور میرا یہ دوست......''

''یہاں دلیپ کمار سے ملاقات کے لئے آئے ہیں......'' موہل نے عمران کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔ اس کا آہنگ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''کاغذات کہاں ہیں تمہارے؟''

''ہمارے ٹریول ایجنٹ کے پاس ہیں۔''

''اور ٹریول ایجنٹ کون ہے؟''

''اس کا ایڈریس ہوٹل میں ہے۔'' عمران نے جھوٹ بولا۔

''تم بکتے ہو۔ تم غیر قانونی طور پر انڈیا آئے ہو اور تمہارا ٹارگٹ وہی منوج ہے۔ تمہارے اندر ضد ہے اور وہ ضد یہ ہے کہ تم منوج کی ہتھیا کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری یہی ضد تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے...... اور تمہیں وشواس دلاتا ہوں، اس مرتبہ تم پر دفعہ 356 نہیں دفعہ 302 لگنے والی ہے۔ تمہاری اس منحوس گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے والا ہے۔''

''کیوں، میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں نے کسی کی جان نہیں لی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے جان نہیں لی تھی، تم نے منوج کو صرف گھائل کیا تھا۔ تم نے اس کی ٹانگیں ضائع کر دی تھیں۔ ٹانگیں ضائع ہونے کے بعد وہ مٹی کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا جیون اس کے لئے بہت بڑا بوجھ بن گیا۔ اس کے زخم بھی خراب ہوتے چلے گئے اور پھر ان زخموں کی وجہ سے اس کا دیہانت بھی ہو گیا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ منوج مر گیا؟'' عمران نے قدرے حیرت سے کہا۔

''مر نہیں گیا حرامزادے...... تُو نے اسے مار دیا۔ تیرے دیئے ہوئے زخموں کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ اور یہ ہتھیا کا کیس بنتا ہے۔''

''اگر وہ واقعی مر گیا ہے تو...... پھر اسے اس کے کرموں کی سزا ملی ہے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ

رہے ہو موہل کہ میں اسے مارنے یا نقصان پہنچانے کے لئے یہاں آیا ہوں تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔''

''غلط فہمی ہے یا نہیں لیکن پھانسی کا پھندا تو اب تمہارے گلے میں پڑ گیا ہے...... بچُو جی...... اگر کسی اندھے بہرے جج کے کارن تم بچ بھی گئے تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی...... ساری عمر یہاں انڈیا کی کسی جیل میں سڑنا پڑے گا۔ اور اس دفعہ تمہیں یہاں سے بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے ریمانڈ سے پہلے ہی تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ نہ رہے گی ٹانگ، نہ بھاگے گا گنگو تیلی۔''

ہندو ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ ''میں تو کہتا ہوں جناب ابھی توڑیں۔ پُن (نیکی) کے کام میں دیری نہیں ہوین چاہئے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل ڈی ایس پی سجاد موہل کی طرف بڑھائی۔ اس نے رائفل کو الٹی طرف سے پکڑا اور بڑے زور سے عمران کی پنڈلی پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے یقیناً عمران کو زبردست چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ دوہرا ہو گیا۔

پہلی چوٹ کے بعد سجاد موہل ایک دم عمران پر پل پڑا۔ اس نے عمران کو رائفل کے کندے سے پے در پے ضربیں لگائیں۔ ساتھ ساتھ وہ اسے ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اب میرے لئے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر زوردار لات سب انسپکٹر کے سینے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر جستی ٹرنک پر گرا۔

حوالدار نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی ٹانگ رسید کر کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی بجلی تھی جو جیکی کی خوفناک تربیت سے میرے رگ و پے میں سمائی تھی۔ یہ ایک ایسی توانائی تھی جس نے میری کایا پلٹی تھی اور مجھے میرے حریفوں کے لئے خطرناک بنا دیا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ اس الٹی ہتھکڑی کا تھا جس نے میرے اور عمران کے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ میری زوردار مزاحمت نے پولیس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ انہیں سخت چوٹیں لگیں۔ خود ڈی ایس پی موہل بھی اچھل کر دیوار سے ٹکرایا لیکن پھر اس کے بعد کئی افراد بھرا مار کر کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے ہمیں بے بس کر دیا۔ کوئی دس افراد ہوں گے جو ہم سے کالی بھڑوں کی طرح چمٹ گئے۔ انہوں نے ہمیں بری طرح زدوکوب کیا۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا اور اس کا حتمی نتیجہ کیا نکلتا کہ ایک نسوانی آواز نے صورتِ حال تبدیل کر دی۔ یہ آواز کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے بلند ہوئی تھی۔ اس آواز کے سنتے ہی ہمیں مارنے والے ٹھٹک گئے۔ ڈی ایس پی سجاد موہل نے

بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔

آواز ایک بار پھر ابھری۔ کسی نے چلا کر کہا۔ ''موہل! جلدی آؤ...... پلیز۔''

موہل نے مڑ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ تب میری نگاہ بھی کھڑکی سے باہر باغیچے کی ایک روش پر پڑی۔ گارڈن لائٹ کی دودھیا روشنی میں ایک دراز قد عورت ذرا جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی نارنجی ساڑھی کا پلو زمین پر لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پہلو دبایا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح کے درد کا شکار تھی۔

سجاد موہل تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہمیں زدوکوب کرنے والے اس کے ماتحت بھی تتر بتر ہو گئے۔ ہم دونوں ٹھنڈے فرش پر پڑے خون تھوک رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر دو تین گومڑ ابھر آئے تھے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ میری ناک سے خون رِس رہا تھا۔ پسلیوں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے پھر لاک کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی سجاد کے ایک ماتحت نے ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بکتا جھکتا ہوا باہر چلا گیا۔ ''ہائے...... ہوئی اُف۔'' عمران نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ''رانی خاں کے سالوں نے بالکل بہنوئی سمجھ کر مارا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرا گُردہ زخمی ہو گیا ہے۔'' اس نے پیٹ کے درمیان ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''گُردہ یہاں نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یار! جتنی اٹھک پٹخ ہوئی ہے ہمارے ساتھ، گُردہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ دماغ کے سوا تمہارے سارے اعضا اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم نے جان بوجھ کر یہ ''چھینٹی کھاؤ'' پروگرام کیوں بنایا ہے۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہ بندہ جنونی ہے اور میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تو پھر کیوں پھنسے ہو اس کے شکنجے میں؟ کتنی فرماں برداری سے ہتھکڑی لگوائی ہے تم نے۔ اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بندھوا دیا ہے۔''

''جب تمہیں اس بندے کی اصلیت کا پتا چلے گا نا تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ میں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔''

''ٹھیک کیا ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کر رہے ہو؟''

''یار! تم تو بن چکے ہو آئرن مین۔ چھوٹی موٹی چوٹ تمہیں کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مار تم نے ایسے ہی کھائی ہے جیسے دودھ جلیبی کھاتے ہیں۔ سوچو اگر میں بھی

ہائے ہائے نہ کروں تو ان لوگوں کا پارا تو پہنچ جائے گا ساتویں آسمان پر۔ جو مارتا ہے وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ مار کھانے والا ہائے ہائے بھی کرے۔'' اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر ''اوئی اللہ'' کہہ کر لیٹ گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے تمہاری جنس تبدیل ہو گئی ہے۔'' میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''اتنی جلدی جنس تبدیل نہیں ہوتی۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اتنی جلدی جنس تبدیل ہونے لگے تو کوئی ماں اپنے بچے کو گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دے...... ادھر جھگڑا ہوا ادھر جنس تبدیل۔ ایک دفعہ پتا ہے کیا ہوا......''

''ہاں، مجھے پتا ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن یہ پتا نہیں کہ آج کیا ہوا ہے۔ یہ انڈین پولیس والا کیوں تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے...... اور یہ منوج کون ہے؟ کیا تم نے واقعی اس نام کے کسی بندے سے مار پیٹ کی تھی؟''

''ہاں یار! دو سال پہلے جب میں انڈیا آیا تھا تو یہاں بمبئی میں ایک ایسا جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ ایسا سنگین نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس بندے کی جان چلی جاتی۔ اس میں کوئی گڑبڑ گوٹالا ہے۔ شاید یہ بندہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی بلیک میل ہونا چاہ رہے ہو۔ راستے میں کئی موقع ایسے آئے تھے جب ہم گاڑی کے اندر ہی اس ڈی ایس پی صاحب کی طبیعت صاف کر سکتے تھے۔ کم از کم میں تو ایسا کر سکتا تھا۔''

''اور یہی تمہاری بھول ہے۔'' عمران نے ترت کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی جیکٹ کی زپ ٹوٹ چکی تھی اور قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ آئندہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

''یہ ہم ہیں کس جگہ پر اور یہ جوان عورت کون تھی؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں اور ابھی تمہیں ''گدڑ کٹ'' بھی میں نے ہی لگائی ہے۔ بھئی تمہاری طرح میں بھی یہاں ایک ''معزز'' مہمان کی حیثیت سے موجود ہوں اور تمہارے ساتھ ہی مہمان نوازی اور عزت افزائی کے مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔''

''یار! کچھ اندازہ تو ہو گا تمہارا؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اندازہ یہی ہے کہ یہ ڈی ایس پی موہل کی اپنی ہی رہائش گاہ ہے اور اس کے ایک

حصے میں خاص ملزموں سے پوچھ گچھ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ میرے دوسرے اندازے کے مطابق یہ عورت جو ابھی موہل کو آوازیں دے رہی تھی، اس کی گھر والی ہے یا پھر آدھی گھر والی یعنی سالی ہوگی...... یا پھر دو تہائی گھر والی یعنی منہ بولی بیوی ہوگی۔"

تھوڑی دیر پہلے ہونے والی مار پیٹ کا عمران پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا...... ہاں، موہل کے حوالے سے وہ اب بھی پریشان تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ موہل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا؟ ہمارے ہاتھ بدستور الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ خاصی تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنے چہرے سے رسنے والا خون بھی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار کمرے کی دیوار کا وہ حصہ آ رہا تھا جہاں گولی کا تازہ نشان موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ یہ گولی اور گولی کا نشان اس امر کا ثبوت تھے کہ عمران ڈی ایس پی موہل کی جنونیت کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہمیں موہل پھر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے دبلے چہرے پر بھاری مونچھیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے ساتھ صرف سب انسپکٹر تھا۔ دروازے پر کھڑے رائفل بردار حوالدار نے کمرے کا قفل کھولا اور موہل کے لئے ایک کرسی کمرے کے اندر رکھ دی۔ موہل اس کرسی پر براجمان ہو گیا۔ رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ موہل کا پارا جو آدھ پون گھنٹا پہلے ضرورت سے زیادہ اوپر چلا گیا تھا، اب قدرے نیچے محسوس ہوتا تھا۔ اس نے دانتوں میں ماچس کی تیلی چلاتے ہوئے آتشیں نظروں سے عمران کو گھورا اور کہا۔ "کیا ارادے ہیں؟ مزید مرمت کرانی ہے یا سب کچھ صاف صاف بتانا ہے؟"

"آپ لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں؟" عمران نے کہا۔

"ہمیں پتا چل چکا ہے۔ تم سات بندوں نے ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی، چار مرد تین عورتیں۔ مجھے یقین ہے تمہاری طرح تمہارے ساتھیوں نے بھی فرضی نام لکھوائے ہیں۔ تم دونوں کے پکڑے جانے کے بعد تمہارے ساتھی موقع سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن بھاگ کر حرامزادے جائیں گے کہاں؟ موہل انہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی نکال لے گا۔"

موہل کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جب یہ پولیس والے ہی گن پوائنٹ پر ہوٹل سے باہر لا رہے تھے تو اسد یا اجے نے یہ منظر دیکھ لیا تھا اور فوری طور پر اپنا تحفظ کیا تھا۔ موہل نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کہیں یہ کوئی دہشت

گردی کی پلاننگ تو نہیں ہے؟"

"دہشت تو تم پھیلا رہے ہو موہل صاحب! ہم پر بھیانک قسم کے الزام لگا رہے ہو۔ ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم فن کار لوگ ہیں۔ لوگوں کو تفریح فراہم کر کے روزی کماتے ہیں۔"

"بے شک...... بے شک...... تم جیسے آٹھ دس اور فن کار انڈیا میں آ جائیں تو پورے ملک میں تفریح کی لہر لہر ہو جائے۔ دو سال پہلے تو صرف ایک منوج کمار کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں...... ایک بندہ زخمی ہوا تھا اور ایک گاڑی تباہ ہوئی تھی، اب تم لوگ اس سے کہیں بڑی تفریح فراہم کرنے کے قابل ہو۔ ویسے تم پاکستانیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اپنے ملک کی مسجدوں میں تو خیر خیریت سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے ہو اور حج کے موقع پر ہم ہندوستانیوں سے پوچھتے ہو کہ انڈیا میں تم پر ظلم تو نہیں ہوتا؟ واہ! کیا شان ہے تمہاری؟"

"لیکن یہ بات کیوں بھولتے ہو کہ یہاں احمد آباد میں سیکڑوں لوگوں کو مسلم کش فسادات میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے...... بمبئی میں کیا ہو رہا ہے......"

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے لیکن یہاں ہم مسلمان تم لوگوں سے زیادہ محفوظ اور خوش ہیں۔ تم لوگوں نے حکومتیں بنانے اور توڑنے کے سوا کیا ہی کیا ہے اپنے ملک میں۔ اپنی ضرورت کی چھوٹی سے چھوٹی شے کے لئے تم باہر کی دنیا کے محتاج ہو۔ تم نے اس خطے کو کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور دہشت گردی کے تحفے دیئے ہیں۔"

"مگر معاف کرنا موہل صاحب! بڑے سے بڑا ڈان تو تمہارے ملک میں بھرا ہوا ہے۔ تمہاری پوری فلم انڈسٹری پر ڈانوں کا راج ہے۔ تمہارے بڑے بڑے شہر ان دادا گیروں نے یرغمال بنا رکھے ہیں۔"

"اور وہاں پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی جانکاری بھی ہم کو ہے۔ یہاں تو فلم انڈسٹری میں ڈان ہوں گے، وہاں تمہاری پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارے سرکاری محکموں میں بیٹھے ہوئے ہیں...... اور تو اور تمہاری سرکس کمپنیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک منحوس سرکس کے ساتھ ایک حرامزادہ بازی گر یہاں آتا ہے اور سڑکوں پر دادا گیری کرتا ہے۔ لوگوں کی ٹانگیں توڑتا ہے، ان کے جیون برباد کرتا ہے۔ ان کو ان کے بال بچوں سمیت زندہ جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔" ڈی ایس پی موہل نے آخری الفاظ دانت پیس کر کہے اور عمران کو قہرناک نظروں سے دیکھا۔ چند لمحے کے لئے یوں لگا کہ وہ طیش میں آ کر اس پر جھپٹ پڑے گا۔

اس نے حوالدار سے کہہ کر شراب کی چھوٹی بوتل منگوائی اور وہیں ہمارے سامنے بیٹھ کر اس کے تلخ گھونٹ بھرنے لگا۔ ذرا نشہ چڑھا تو اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے عمران کے پہلو میں لات رسید کی اور پھنکارا۔ ”اگر تیرے دل میں کوئی ارمان ہے تو نکال لے۔ میں تیری یہ ہتھکڑی کھلوا دیتا ہوں۔ تجھے بھاگنے کے لئے سے بھی دیتا ہوں۔ بیس تیس سیکنڈ سے پہلے تیرے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ لیکن پھر اگر پکڑا گیا تو ننگا کر کے ماروں گا۔ ایک ایک انچ گوشت اڑا دوں گا تیرے پنڈے پر سے۔“ اس نے باقاعدہ انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر ایک انچ کا اشارہ بتایا۔

ابھی کچھ دیر پہلے عمران نے مجھے ڈی ایس پی موہل کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ موہل ماضی میں کبڈی کا نامور کھلاڑی بھی رہا ہے اور اسی کھیل کی بنیاد پر پولیس میں بھرتی بھی ہوا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی انور موہل بھی پولیس میں تھا اور وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ بعدازاں اس نے پولیس چھوڑ دی تھی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔

موہل دس پندرہ منٹ مزید ہمارے پاس بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے بس زہر ہی اگلا۔ اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ خصوصاً پاکستانی پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دیگر ایجنسیوں سے وہ بہت متنفر تھا۔ اب پتا نہیں اس نفرت کی وجہ کیا تھی۔ عین ممکن تھا کہ عمران کو علم ہوتا مگر وہ کچھ بتاتا تو تب تھا۔ موہل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ عمران کو ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ افسروں کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنی چھاتی پر کامیابی کا ایک یادگار تمغہ سجانے کا خواہش مند ہے۔

اس کے علاوہ اسے یہ بھی شک تھا کہ عمران اب پھر کسی جرم کی نیت سے ہی یہاں الٰہ آباد میں موجود ہے۔ وہ اس نئے جرم کا کھوج بھی چاہتا تھا۔ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ یہ کال موہل کے کسی ماتحت کی تھی۔ اس ٹیلی فونک گفتگو سے ہمیں پتا چلا کہ الٰہ آباد میں اسد اور میڈم سمیت ہمارے ساتھیوں کی تلاش زور شور سے جاری ہے اور اس شخص کا بھی سراغ لگایا جا رہا ہے جس کی وساطت سے ہمارے لئے ہوٹل میں کمرے بک ہوئے تھے۔

سجاد موہل کے جانے کے بعد ہمارے کمرے کو باہر سے پھر وزنی تالا لگا دیا گیا۔ دو رائفل بردار اہلکار کمرے سے باہر چوکس حالت میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک حوالدار فیاض اور دوسرا ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

حوالدار فیاض ہماری طرف مسلسل تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گرل

دار کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگتا۔ عمران نے اس سے کہا۔

”میرے برادر! کہیں سے سبز چارا مل جائے گا تھوڑا سا؟“

”کیا کرو گے؟“

”کھائیں گے یار اور کیا کریں گے۔ تمہارے ڈی ایس پی نے ہمارے ہاتھ تو پیچھے باندھ دیئے ہیں، اب روٹی اور برگر وغیرہ تو ہم کھا نہیں سکتے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چارا وغیرہ ہی کھانا پڑے گا۔“

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ”گھبراؤ مت۔ چارا وغیرہ بھی دیں گے۔ پہلے تم سے تھوڑا سا ہل تو چلوا لیں۔“

”یار! ہل چلوایا تو ہے تم لوگوں نے۔ دیکھ لو ہم دونوں کے تھوبڑے نیلو نیل ہو رہے ہیں۔“

”ابھی تو صرف تھوبڑے نیلو نیل ہوئے ہیں، کل شام تک تمہیں ہر جگہ نیل نظر آئیں گے۔ اور جو جگہیں تم خود نہ دیکھ سکو گے، ان پر ہاتھ لگانے سے پتا چل جائے گا کہ نیل پڑے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے ہم شام تک یہیں رہیں گے؟“ عمران نے حیرت ناک صورت بنائی۔

”کل شام تک نہیں میرے ہیرے...... اگلی پانچ چھ شاموں تک تم یہیں رہو گے...... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ شامیں لگ جائیں۔ ویسے شام پر تمہارے کسی پاکستانی کوی نے بڑا اچھا گانا بنایا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے...... میرا کوئی کام کرو اور...... شام کرو۔“

عمران نے فوراً تصحیح کی۔ ”ہو سکے تو میرا ایک کام کرو، شام کا ایک پہر میرے نام کرو۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھا ہے۔ میری بڑی پکی یاری ہے ان سے...... لیکن یار! تمہاری ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارے ڈی ایس پی صاحب ہمیں اس کوٹھی میں کس طرح رکھ سکتے ہیں...... یہ کوئی تھانہ تو نہیں؟“

”گھبراؤ مت۔ یہاں تم دونوں کو تھانے سے زیادہ ”سہولتیں“ ملیں گی۔“ وہ مونچھیں مروڑ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”باقی رہی یہاں رکھنے کی بات تو میرے ہیرے...... تھانے تو تمہیں تب لے جایا جائے گا جب تمہاری گرفتاری ڈالی جائے گی۔ ابھی تو تمہارا کوئی اندراج ہی نہیں۔ کوئی کھوج کھرا، کوئی مائی باپ نہیں تمہارا۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں یہاں زندہ بھی گاڑ دیں گے تو کسی کو خبر نہیں ہو گی۔“

وہ دیر تک ہمیں ڈراتا دھمکاتا رہا اور بتاتا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب اس چاردیواری میں مختارِکل ہیں۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم پوچھ گچھ کے سلسلے میں ان سے پورا تعاون کریں ورنہ ہماری خیریت جو پہلے ہی مشکوک ہے، مزید خطروں میں گھر جائے گی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ ہمیں بیدردی سے مارا گیا تھا۔ میرا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسی تکلیفیں اب مجھے مزہ دیتی تھیں۔ میں ایسی تکلیفوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا تھا، ان سے دوستی کرتا تھا۔ اب مجھے ان کی ''شدت'' سے لذت کشید کرنا آ گئی تھی۔ بوسیدہ لحاف ہمیں سردی سے بچانے کے لئے ناکافی تھے۔ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ جسمانی اذیت میں بھوک کی بے چینی بھی شامل ہوگئی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ مجھے دکھ پہنچانے میں ناکام تھا۔ رہی عمران کی بات تو وہ بھی بلا کا سخت جان تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ڈی ایس پی موہل اپنی پرائیویٹ کار لے کر بڑی تیزی سے کہیں نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک حوالدار نے اندر آ کر میری ہتھکڑی کھولی۔ عمران کی ہتھکڑی میں نے کھولی۔ میرے پاؤں سے زنجیر بھی اتار لی گئی۔ تب تک حوالدار باہر نکل کر دروازہ لاک کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک عمران ایک خطرناک شخص تھا کیونکہ وہ ماضی قریب میں، منوج نامی کسی شخص کی ٹانگیں توڑ چکا تھا اور پولیس کی حراست سے فرار ہو چکا تھا۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ شخص عمران کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔

ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈی ایس پی موہل کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ شام کے بعد بھی اپنی رہائش گاہ پر نظر نہیں آیا۔ اس کی کار بھی دکھائی نہیں دی۔ دو رائفل بردار اہلکار مسلسل کمرے کے دروازے کے سامنے پہرا دے رہے تھے۔ صبح ہمیں واجبی سا ناشتا دیا گیا تھا مگر رات کا کھانا اچھا تھا۔ رات نو دس بجے کے قریب ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ وہی عورت برآمدے کی سیڑھیوں پر دکھائی دی جسے ہم نے کل شب موہل کو پکارتے سنا تھا۔ تب وہ شدید درد میں محسوس ہوئی تھی۔ تاہم اب وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ اس نے آج مختلف رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس، تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ قبول صورت اور متوازن جسم کی تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی وہ ہمارے کمرے کی طرف آئی۔ کانسٹیبل اور حوالدار نے اسے ادب سے سلام کیا۔ وہ کھڑکی میں سے ہمیں گھورتے ہوئے بولی۔ ''کیا کیا ہے انہوں نے؟''

اس کا یہ سوال حوالدار فیاض سے تھا۔ فیاض نے کہا۔ ''ابھی انہوں نے کچھ بتایا نہیں بیگم جی...... مگر کل تک سب کچھ بک دیں گے۔ ویسے شاید آپ نے غور سے دیکھا نہیں۔ ان

میں سے ایک کو آپ پہلے سے بھی جانتی ہوں گی۔ یہ سرکس کا وہی بازی گر ہے جس نے منوج صاحب کی ٹانگوں میں گولیاں ماری تھیں۔''

بیگم صاحبہ نے غور سے عمران کو دیکھا اور ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑا...... ''اوہ مائی گاڈ...... تو یہ پھر پکڑا گیا۔''

''صاحب جی نے آپ کو اس کے بارے میں بتایا نہیں؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ کل شام کو مجھے کڈنی کا شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ آج صبح سویرے ان کو کسی چھاپے کے لئے جانا پڑ گیا۔ یہ تو بڑی اہم سماچار ہے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو مجھے ضرور بتاتے۔'' اس نے ایک بار پھر غور سے عمران کو دیکھا پھر حوالدار سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''وشواس نہیں ہو رہا کہ یہ دوبارہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟''

''یہ بھی ہوگا کوئی اٹھائی گیرا جی۔ یہ بھی پاکستان سے ہی تشریف لایا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے تھانے داری لہجے میں کہا۔ ''اب کیا ارادے تھے تمہارے؟''

عمران نے مسمسی صورت بنائی۔ ''ارادے تو بڑے نیک تھے جی۔ کسی ہندوستانی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر پاکستان لے جانا چاہتا تھا مگر آپ کے شوہر صاحب بڑی دور کی سوچتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں ہندوستانی لڑکی کو پاکستان لے کر جاؤں گا تو اسے ضرور تنگ کروں گا۔ ہوسکتا ہے کہ مار پیٹ بھی کروں۔ لہٰذا انہوں نے شادی سے پہلے ہی مجھے ایک ''سخت گیر داماد'' کا رتبہ بخش دیا کہ بلکہ چھینٹی بھی لگا دی۔ دیکھیں کتنے ستم کی بات ہے، میں نے ابھی اس بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی جس پر میں نے ظلم کرنا ہے اور مرمت میری پہلے ہی ہوگئی ہے۔''

حوالدار نے کہا۔ ''اسے بکنے کی عادت ہے بیگم صاحبہ آپ کو یاد ہوگا پچھلی دفعہ جب اسے عدالت میں ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا تھا، اس نے مجسٹریٹ صاحب کو اس لئے مجسٹریٹ صاحبہ کہہ دیا تھا کیونکہ ان کی آواز بہت باریک تھی۔ ایک نمبر کا چرب زبان ہے۔''

بیگم صاحبہ نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ عمران سے ایک دو باتیں کیں۔ پھر حوالدار کو ایک ڈاکٹری نسخہ دیا اور اپنے لئے میڈیکل اسٹور سے دوا لانے کو کہا۔ حوالدار چلا گیا تو بیگم صاحبہ نے ہیڈ کانسٹیبل کو برآمدے کی لائٹ روشن کرنے کو کہا۔ جب ہیڈ کانسٹیبل رخ دوسری طرف پھیر کر لائٹ روشن کر رہا تھا، بیگم صاحبہ نے اچانک اپنی گرم شال کے نیچے سے ایک موبائل فون نکالا اور گرل دار کھڑکی میں سے عمران کی طرف بڑھایا۔ عمران ایک لمحے کے لئے چونکا

پھر اس نے موبائل لے کر چارپائی پر پڑے لحاف کے نیچے رکھ دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل لائٹ روشن کر کے واپس ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف انگیز لہجے میں عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں جانکاری نہیں کہ منوج کمار مر چکا ہے اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت تمہارے دیئے ہوئے زخموں سے ہی ہوئی ہے...... اب تم انڈیا آ گئے ہو۔ نہ صرف آ گئے ہو بلکہ پکڑے بھی گئے ہو۔ شاید اسی کو کہتے ہیں جو کرو گے سو بھرو گے۔''

عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طرح دار بیوی واپس چلی گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے عمران کو موبائل دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے اور نہ صرف اسے جانتی ہے بلکہ رابطہ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے حوالدار وغیرہ کے سامنے ضرور کچھ کھردری باتیں کی تھیں مگر اندر خانے وہ عمران کی ہمدرد محسوس ہوئی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟'' میں نے عمران سے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہ شریفانہ چکر ہے۔ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل ہی جانا تھا اور پھر یہی ہوا موبائل فون نے ''وائبریٹ'' کیا۔ اس پر میسج آیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی کی وائف ہی کی طرف سے تھا۔ اس طویل میسج کا ٹیکسٹ انگریزی میں تھا۔ عمران نے یہ میسج مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھائی جان! آپ کو پھر سے پولیس کی کسٹڈی میں دیکھ کر مجھ پر جو گزری ہے، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ آپ کو تقریباً دو سال بعد دیکھا اور وہ بھی اس حالت میں۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کل رات میں نے آپ کو اور آپ کے دوست کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا...... پھر جب کمرے میں آپ دونوں سے مار پیٹ شروع ہوئی تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ میں نے درد کا بہانہ کیا اور سجاد کو آواز دیں۔ میں نے وقتی طور پر تو آپ کی مصیبت ٹال دی لیکن یہ زیادہ دیر نہیں ٹلے گی۔ سجاد کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔''

جواب میں عمران نے لکھا۔ ''تم بھائی جان کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہو۔ تمہیں پتا

ہے، میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اس جن زاد سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں جس نے پچھلے سات آٹھ سال سے تمہیں قید کر رکھا ہے۔ بہرحال، یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میں اس کی قید میں ہوں۔ جہاں تک تمہاری مدد کی بات ہے تو تم بس دعا کرو۔ ذاتی طور پر اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے میں سنبھال لوں گا۔''

میسج کا جواب آیا۔ ''یہ آپ کا نہیں سراسر میرا معاملہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا، میرے لئے کیا۔ میرے گھر کو بچانے کے لئے کیا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اگر آپ کی وجہ سے منوج کی ٹانگیں کٹیں تو وہ اسی لائق تھا۔ اس نے ایک گندا جرم کیا تھا...... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سجاد بھی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے صرف اور صرف میری وجہ سے گرفتاری دی۔ میں آپ کی بہت احسان مند ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اس بوجھ تلے اور نہ دبائیں۔ مجھے بتائیں، آپ دوبارہ کیوں سجاد کی کسٹڈی میں نظر آ رہے ہیں؟ اور میں آپ کے لئے کیا کروں؟''

عمران نے لکھا۔ ''اگر تم میرے لئے کچھ کرنا چاہتی ہو تو خدا کے لئے اپنے اس ناہنجار...... جن زاد شوہر سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ میری دلی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اگر مجھ سے کہو گی تو میں سر کے بل حاضر ہوں، ورنہ کوئی مناسب شخص ڈھونڈنے میں، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔''

جواب آیا۔ ''یہ مذاق کا موقع نہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ آپ کو بری طرح مارا ہے انہوں نے۔ اور ابھی وہ اور سختی کریں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سجاد آپ کے ان ساتھیوں کی تلاش میں گئے ہیں جو آپ کے پکڑے جانے کے بعد ہوٹل پارک ویو سے فرار ہو گئے تھے۔ کم از کم آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ اس بار آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ یہ منوج والا معاملہ ہی ہے یا کچھ اور ہے؟''

''نہیں عاصمہ! اس دفعہ ہم اہم فلمی شخصیات کے انٹرویوز لینے آئے ہیں۔'' عمران نے لکھا اور پھر مزید پیغامات سے بچنے کے لئے فون آف کر دیا۔

میں نے دیکھا کھڑکی سے باہر حوالدار فیاض رائفل گود میں رکھے کرسی پر بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نریندر کے قدموں کی چاپ برآمدے میں مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''یہاں سینڈ بیگ نہیں ہے اور میں سینڈ بیگ کی کمی تمہارے تھوبڑے سے پوری کروں

گا۔ مکے مار مار کر تمہاری بتیسی کا ستیاناس کر دوں گا۔"

عمران کچھ دیر غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہ ڈی ایس پی کی بیوی عاصمہ کس گندے جرم کی بات کر رہی تھی؟ کیا کیا تھا منوج نے؟"

"اس نے ایک پاکستانی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اور لڑکی بھی وہ جو اس سے عمر میں بیس بائیس سال چھوٹی تھی۔ وہ ہمارے سرکس میں جگلر تھی۔ ہمارے ساتھ ہی انڈیا کے شہروں میں شو کرنے کے لئے پاکستان سے آئی تھی۔ منوج نے اسے ورغلایا۔ اسے کوک میں نشہ آور دوا ملا کر پلائی اور اس سے دست درازی کی۔"

"یہ منوج کون تھا؟"

"بمبئی میں مرغ حلیم بیچتا تھا۔ راج کپور کی بہن کی ساس کی خالہ کا چھوٹا بہنوئی تھا۔"

عمران پھر پٹری سے اترنے لگا۔

میں نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "یار! ایک بار مجھے شروع سے سب کچھ بتا دو پھر مجھے پریشانی ہوگی نہ تمہیں۔"

"کہاں سے بتاؤں؟"

"منوج سے بتا دو۔ یہ کون تھا؟"

"بمبئی کی فلمی دنیا کا بندہ تھا۔"

"ایک تو مشہور اداکار منوج کمار ہے؟"

"نہیں، یہ فلمسازی کرتا تھا۔ شاید ایک دو فلموں کی ڈائریکشن بھی دی تھی...... کافی کھاتا پیتا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کو لڑکیوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ بمبئی میں ہمارا شو دیکھنے آیا۔ وہاں اس کی ملاقات ہماری ٹیم سے ہوئی۔ ان میں زیب بھی شامل تھی۔ زیب لاہور کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اسے جمناسٹک کا شوق پیدا ہوا اور پھر شوق ہی شوق میں وہ ہمارے سرکس تک آ پہنچی۔ جان محمد صاحب نے اسے اچھے معاوضے کی پیشکش کی اور وہ باقاعدہ شوز میں حصہ لینے لگی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس نے منوج سے بھی ہنس کر باتیں کیں۔ بعد میں منوج نے اسے فون کیا اور بتایا کہ اگر وہ کوشش کرے تو فلموں میں آ سکتی ہے۔ ان فلمی لوگوں میں ایک جادو ہوتا ہے یار...... ان کی آفر کو ٹھکرانا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خاص طور سے لڑکیوں کے لئے۔ اچھے بھلے گھرانوں کی لڑکیاں ان چکروں میں پھنستے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔

بہرحال، یہاں جو کچھ ہوا، اس میں شاید تھوڑا بہت قصور زیب کا بھی تھا۔ ہم بمبئی میں قریباً پندرہ دن رہے تھے۔ وہ ہمیں بتائے بغیر منوج سے فون پر بات کرتی رہی اور اس سے ملتی بھی رہی۔ منوج نے اسے فلمی دنیا کی چکاچوند کی کچھ جھلکیاں دکھائیں۔ ایک روز اسے ساحل پر اپنے کاٹیج میں لے گیا۔ زیب کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ چھتیس سال سے اوپر کا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اسے دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا تو وہ اسے ذلیل وخوار کر دے گا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ زیب نے یہ سب کچھ مجھے بتا دیا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے لئے تھے۔ مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کسی کو کچھ بتاتی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی نادانی کے سبب وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی اور اس کا دکھ جاننے میں کامیاب رہا۔ اب میرے لئے برداشت کرنا مشکل تھا۔ میں جانتا تھا کہ منوج سنہا واقعی ایک 'بڑا آدمی' ہے۔ اپنے تعلقات کے سبب وہ اپنا کچھ بگڑنے نہیں دے گا اور میں اسے یونہی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے گھیر لیا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ رات کے وقت جب وہ اپنے ڈرائیور اور ایک فلمی دوست کے ساتھ نشے میں دھت اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا، میں نے اسے جا لیا۔ اس کا دوست زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ ڈرائیور نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ میں نے منوج کے گھٹنوں اور رانوں پر چھ گولیاں ماریں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر جان بخشوائی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔"

"میں تمہاری طرح جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ پوری بات بتاؤ۔ یہ ذلیل موہل تمہارے پیچھے کیسے پڑا؟"

"اوئے گھامڑ! میں مجرم تھا اور یہ پولیس والا۔ اس نے میرے پیچھے نہیں پڑنا تھا تو کیا جوہی چاولہ یا شبانہ اعظمی نے پڑنا تھا۔ ان دنوں یہ شرابی پلسیا بمبئی میں ہی تعینات تھا۔ اس نے مجھے پکڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے تو اس خبیث کو خاص طور سے "محبت" ہے۔ منوج کو گولیاں مارنے اور اس کی مرسیڈیز کو آگ لگانے کے بعد میں اورنگ آباد کی طرف نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس کارروائی کی وجہ سے سرکس کے مالک جان محمد صاحب یا میرے دیگر دوستوں کو کوئی پریشانی ہو۔ منوج پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ یہ بس مجھ اکیلے کی کارروائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھی میں اکیلے ہی بھگتنا چاہتا تھا......"

میں نے عمران کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ایک چیز کلیئر کرو۔ تم نے بتایا ہے کہ سجاد کو پاکستان اور پاکستانیوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں، خاص وجہ ہے۔'' عمران نے اپنے زخمی ہونٹ سے رسنے والے خون کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ سجاد کا ایک بھائی انور بھی تھا۔ وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا وہ کچھ عرصے کے لئے پولیس میں بھی رہا۔ بعد میں اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا مگر اس کام کی آڑ میں وہ غلط دھندے بھی کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہیروئن اسمگل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ انڈیا سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہ لاہور میں پکڑا گیا اور فرار ہونے کی کوشش میں اپنے ایک پاکستانی دوست سمیت پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ سجاد جس طرح کا بھی ہے لیکن اس نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو باپ بن کر پالا تھا اور اس سے بہت پیار بھی کرتا تھ۔ اس کی موت نے سجاد کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ شراب تو وہ پہلے بھی بہت پیتا تھا لیکن اب پانی کی طرح پینے لگا۔ وہ کچھ جنونی سا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی عاصمہ سے کہتا تھا کہ پاکستان جائے گا اور ان پولیس والوں کو قتل کرے گا جنہوں نے اس کے بھائی پر گولیاں چلائیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل نہ کر سکا اور نہ ہی پاکستان جا سکا لیکن اس کے دل میں روز بروز نفرت پروان چڑھتی رہی۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے وہ دو تین بار نوکری سے معطل بھی ہوا۔ وہ چڑچڑا اور غصیلا بھی ہوتا جا رہا تھا...... بات بات پر بیوی کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کا ذمے دار بھی وہ اپنی بیوی عاصمہ کو ہی ٹھہراتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ایک چھوٹی سی بات سے ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ پاکستانی ٹیم جیت گئی۔ عاصمہ نے اتنا کہہ دیا کہ پاکستانی ٹیم اچھا کھیل کر جیتی ہے۔ اس بات سے سجاد بھڑک اٹھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ سجاد نے بیوی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا۔ وہ تین مہینے کی حاملہ تھی۔ اس کی ابارشن ہو گئی۔ اسے کئی ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ انہی دنوں شدید ڈپریشن اور نوکری کی پریشانیوں کی وجہ سے سجاد نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔

''یہ وہ حالات تھے جن میں اسے میرا کیس ملا۔ میں ایک پاکستانی تھا اور میں نے یہاں بمبئی میں ایک بڑے پروڈیوسر کو جان کے لالے ڈالے تھے۔ سجاد موہل کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میری گرفتاری کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ میری گرفتاری سے اسے دہرا فائدہ ہوتا۔ ایک پاکستانی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر اس کی انا کو تسکین ملتی، دوسرے اس کی ڈانواں ڈول نوکری کو سہارا مل جاتا۔ اور عین ممکن

تھا کہ سبکدوشی کے خطرات کے بجائے ترقی کا پروانہ اس کے ہاتھ میں آ جاتا۔ بس یہی حالات تھے جن میں، میں نے سوچا کہ موہل کو اپنی گرفتاری دے کر اس کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہیے۔ سو میں نے یہ کر دیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں تم شارٹ کٹ لگا رہے ہو۔ کوئی اہم واقعہ چھپا رہے ہو۔ سجاد کی بیوی عاصمہ کا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے عنقریب...... فساد پلس میں تمہیں نوکری دلانا پڑے گی۔ تمہاری ناک بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے اور تم اسے ہر معاملے میں گھسیڑ رہے ہو۔ نیوز چینل میں نوکری کے لئے اصل کوالیفکیشن لمبی سے لمبی ناک ہی ہوتی ہے جو ہر جائز و ناجائز معاملے میں گھسیڑی جا سکے۔ اور اگر اسے گھسیڑنے میں تھوڑی بہت چوٹ بھی آ جائے تو اس کی پروا نہ کی جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ بہت جلد نیوز چینل میں نوکریوں کے لئے جو اشتہار دیئے جائیں گے، وہ اس طرح کے ہوں گے۔ نامہ نگار کے لئے ناک کی کم از کم لمبائی چھ انچ درکار ہے۔ رپورٹر کے لئے آٹھ انچ...... سینئر رپورٹر اور اینکر پرسن کے لئے دس انچ تاہم اگر اینکر پرسن کے نتھنے آدھ انچ سے زیادہ کشادہ ہوں اور اس کی آنکھوں میں شکرے کی چمک ہو تو ناک کی لمبائی میں رعایت ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ......''

''تم پٹڑی سے اتر رہے ہو۔ میں نے تم سے عاصمہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ اس سارے منظر میں کہاں سے آئی؟''

''بالکل، یہ صلاحیت بھی اینکر پرسن اور دانشور کے لئے ضروری ہے۔ ٹاک شو کے دوران میں بات کہیں بھی چلی جائے، وہ اسے پھر کان سے پکڑ کر وہیں لے آتے ہیں جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بات کو بھگاتے بھی وہ خود ہی ہیں۔ چلغوزوں کے بڑھتے ہوئے ریٹ کو وہ امریکا کی خارجہ پالیسی تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر اچانک خارجہ پالیسی میں سے چلغوزے اور خستہ مونگ پھلی کی بات نکال لیتے ہیں...... اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوتا ہے کہ چلغوزوں کے مسلسل مہنگا ہونے میں ریوڑیوں کے کردار کا پتا چلا ہے تاہم اس بارے میں بریک کے بعد بتایا جائے گا۔''

''یعنی تم عاصمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

میری جھلاہٹ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''وہ بڑی تناؤ بھری رات تھی تابی۔ مجھے آج تک وہ سب کچھ یاد ہے۔ میں نے تمہیں اپنی کہانی میں بتایا تھا نا، میں سرکس کے مالک جان محمد صاحب سے بہت محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ ان کے بہت سے

احسان ہیں مجھ پر۔ اس رات مجھے پتا چلا کہ بمبئی میں پولیس اہلکار جان محمد صاحب کو ہوٹل سے گرفتار کر کے لے گئے ہیں...... اور سجاد موہل نے تھانے میں ان پر تشدد کیا ہے۔ وہ جان صاحب سے میرا اتا پتا پوچھنا چاہتا تھا۔ جان صاحب کو پہنچنے والی تکلیف اور ان کی بے عزتی نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دیں۔ میں اسی وقت بمبئی واپس آیا۔ میں نے پتا ہے کیا کیا؟''

''کیا کیا؟''

''میں نے سجاد موہل کو سزا دینے کے لئے اس کے بیوی بچوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ سجاد کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مجھے بمبئی کے پوش ایریا میں سجاد کی کوٹھی کا پتا تھا۔ میں نے وہاں موجود چوکیدار سے اپنا تعارف سجاد کے دوست کے طور پر کرایا اور اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ سجاد گھر میں موجود نہیں تھا۔ گھر میں صرف عاصمہ اور اس کی ساس تھیں۔ عاصمہ کی ساس بیمار تھیں اور دوا کھا کر سوئی پڑی تھیں۔ رو رو کر عاصمہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ بھی چہرے سے بیمار ہی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے سجاد کا دوست ہی سمجھا اور مجھے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میں کسی بھی طرح سجاد کی جان بچاؤں...... میرے پوچھنے پر اس نے بتایا...... ڈی آئی جی صاحب سجاد سے بہت ناراض ہیں۔ نوبت سجاد کی نوکری ختم ہونے تک پہنچ چکی ہے۔ سجاد کی آخری امید پاکستانی ملزم والا کیس تھا۔ لیکن وہ ملزم بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اعلیٰ افسروں نے سجاد کو دو ہفتے کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ یہ ڈیڈ لائن پرسوں ختم ہو رہی ہے...... سجاد پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ وہ نوکری ختم ہونے کا صدمہ سہہ نہیں سکے گا، وہ خودکشی کر لے گا...... عاصمہ رو رو کر بے حال ہونے لگی......''

عمران اپنے جسم پر لحاف کو درست کرنے کے لئے چند سیکنڈ کے لئے رکا تو میں نے کہا۔ ''شاید تم یہ کہنے جا رہے ہو کہ تم نے عاصمہ کے کہنے پر اپنی گرفتاری دے دی اور یوں اس کا سہاگ اجڑنے سے بچالیا۔ یہ تو ڈرامائی سی کہانی لگتی ہے۔''

''ہاں، یہ ڈرامائی کہانی ہے...... ایک خوش شکل عورت کے کہنے پر ایک مفرور کا خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا...... لیکن جب تم اصل بات جانو گے تو تمہیں مزید حیرانی ہوگی۔ پتا نہیں کہ تم اس پر یقین کرو گے بھی یا نہیں۔''

''تم سچ بتاؤ گے تو میرے دل کو خود بخود یقین آنے لگے گا۔'' میں نے کہا۔

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو انگلی سے چھوا اور

بولا۔ ''عاصمہ جس طرح بلک بلک کر میرے سامنے روئی، میرا دل پسیج گیا۔ تم جانتے ہی ہو، میں نے ہمیشہ برائی کا مقابلہ اچھائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفرت کا مقابلہ محبت سے، غصے کا تحمل سے، عداوت کا دوستی سے۔ میں نے اس رات اشک بار عاصمہ کے سامنے بیٹھے بیٹھے سوچ لیا کہ میں سجاد کی اس نفرت کا جواب ایک انوکھے طریقے سے دوں گا جو وہ پاکستانیوں کے خلاف رکھتا ہے۔ میں اس کی عداوت اور کم ظرفی پر ایثار اور ظرف کا وار کروں گا۔ مجھے اپنی قوتِ بازو اور اندر کی سچائی پر بھروسا تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ سجاد موہل کو گرفتاری دے کر بھی میں انڈین پولیس کی گرفت سے بچ نکلوں گا۔ میں نے روتی بلکتی عاصمہ کو یقین دلایا کہ پروڈیوسر منوج کمار کی ٹانگوں میں گولیاں مارنے والا پاکستانی ملزم ضرور گرفتار ہوگا اور سجاد ہی اسے گرفتار کرے گا۔ اب میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جسے سننے کے بعد تم اس کہانی کو مزید ڈرامائی قرار دے دو گے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی سچائی پر بھی تھوڑا بہت شک کرنے لگو۔''

''میں نے کہا ہے نا عمران کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے دل کو یقین آنا ہی آنا ہے۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''فلموں، ڈراموں میں لوگوں کی شکلیں ہو بہو ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور یہ ایک افسانوی بات ہوتی ہے۔ لیکن عام زندگی میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ عاصمہ کی صورت شبانہ سے ملتی ہے مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے قد کاٹھ اور چہرے مہرے میں کچھ جھلکیاں ایسی ہیں جو مجھے شبانہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اس کی ناک، اس کے ہونٹ، خاص طور سے اس کے بولنے کا انداز۔ اس کے اندر کی یہی جھلکیاں تھیں جنہوں نے اس رات میرے ارادے کو مزید طاقت دی...... اور میں جو ایک خطرناک پلاننگ کے ساتھ سجاد موہل کے گھر میں گھسا تھا، ایک بالکل دوسرے رخ پر چل پڑا...... میں نے انوکھا کام کیا اور ایسے انوکھے کام تمہارا یہ یار ہی کر سکتا ہے۔ اس رات میں نے انسپکٹر سجاد موہل کو گرفتاری دے دی...... وہاں، ان دنوں وہ انسپکٹر ہی تھا۔ ڈی ایس پی تو اسے میری گرفتاری نے بنایا۔''

''لیکن پھر تم بھاگ گئے؟''

''تمہارا یہ یار بھاگنے میں بھی ماہر ہے۔ اگر میں سرکس کو جوائن نہ کرتا تو ضرور سیاست میں آ جاتا۔''

''میں سجاد موہل کی حراست سے بھاگنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''سجاد موہل کی حراست سے نہیں بھاگا تھا یار۔ اس کی حراست سے بھاگتا تو پھر وہ ڈی

ایس پی کیسے بنتا اور آتما ہتھیا کا ارادہ کیسے بدلتا؟ وہ موہل بھی ایک عجیب کیس ہے یار۔ اصل میں یہ کھلاڑی تھا اور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پولیس میں بھی آ گیا۔ لیکن اس میں اصلی پولیس والوں جیسا دم خم نہیں تھا اور نہ ہی شروع میں اس کا مزاج پولیس والوں جیسا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کامیابی ملی اور نہ یہ خود کو محکمے میں اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکا۔ بعد میں جب اس کا بھائی انور موہل پاکستان میں مارا گیا تو یہ بالکل ہی مایوس ہو گیا بلکہ دیوداس بن بیٹھا۔ یہ روزانہ تین بوتل شراب پی جاتا تھا اور یہ مقدار بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ خودکشی کی کوشش کر چکا تھا اور دوسری دفعہ کرنے والا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے اسے اپنی گرفتاری کا سہارا دیا اور اس کے کیریئر کے ساتھ ساتھ شاید اس کی زندگی بھی بچائی۔''

''لیکن پھر اپنی زندگی کیسے بچائی تم نے؟''

''میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ مجھے عدالت میں پیشی کے بعد واپس جیل لایا جا رہا تھا۔ ایک موٹے تازے ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ تین اور اہلکار بھی پولیس کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تھے۔ شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پر رش بہت ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی ایک پل پر رکی ہوئی تھی۔ نیچے سے نہر کا پانی رواں دواں تھا۔ میں نے اچانک موٹو کانسٹیبل کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا اور کوئی چالیس فٹ نیچے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ پولیس والے اپنی رائفلیں کندھوں سے بھی نہیں اتار سکے۔ پانی تیز تھا۔ موٹا کانسٹیبل غوطے کھانے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے تیرنا آتا ہو لیکن وہ اتنا بدحواس تھا کہ ٹھیک سے تیر بھی نہیں سکا۔ پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا۔ اوپر سے پولیس والے گولی بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ سے ان کا اپنا ساتھی ہی سورگ باشی ہو سکتا تھا۔ جتنی دیر میں وہ پل سے اتر کر نہر کے کنارے پہنچتے، ہم سو ڈیڑھ سو میٹر آگے جا چکے تھے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے بے ہوش موٹے کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ کندھے پر لادا اور درختوں میں گھس گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک امپالا کار کھڑی تھی۔ اس میں ایک لڑکا لڑکی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور نو بیاہتا ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کانسٹیبل صاحب پانی میں ڈوب کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔ نوجوان جوڑے کے لئے شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈھائی تین من کا کانسٹیبل پانی میں لت پت میرے کندھے پر بے سدھ پڑا تھا۔ نوجوان خدمت خلق کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ میں کانسٹیبل سمیت پچھلی نشست پر آ گیا۔ گاڑی فوراً روانہ ہو گئی۔ اسی دوران میں مجھے پھل کاٹنے والی ایک چھری نظر آ گئی جو پھلوں والے لفافے کے اندر ہی

رکھی تھی۔ میں نے چھری نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دی اور شوہر صاحب سے کہا کہ اگر وہ اپنے ہنی مون کو آج کی شام یہیں پر ختم کرنا نہیں چاہتا تو سیدھا چلتا رہے۔ صراطِ مستقیم۔''

اب یہ ساری رُوداد میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ میرا یار واقعی انوکھا شخص تھا۔ بظاہر چلبلا، کھلنڈرا لیکن اندر سے بہت حساس اور سنجیدہ بھی۔ ایک انجان عورت کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گرے تھے اور اس نے عورت کے جنونی شوہر کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی جو ویسے بھی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر کوئی مناسب موقع ہوتا اور میرے اندر حوصلہ بھی ہوتا تو میں جوتا اتار لیتا اور تمہارا سر پلپلا کر دیتا۔ بندہ پوچھے کہ اگر تم نے ایک بار اتنی بڑی نیکی کما ہی لی تھی تو دوسری بار اوکھلی میں سر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب خود پھنسے ہو اور مجھے بھی پھنسایا ہے۔''

''یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ عاصمہ میں شبانہ کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ بس یہ جھلک ہی لے کر بیٹھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا یہ جنم اور اس سے اگلے سات آٹھ جنم بھی اس پر قربان کر دوں۔ اور کیا پتا کہ اسی جنم میں ہی کوئی کام بن جائے۔ میری یہ ڈبل قربانی کوئی رنگ لے آئے۔'' وہ پھر مذاق کے موڈ میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''عمران! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اب کیا ضرورت تھی اتنے بڑے پنگے کی۔ اب تو یہ بندہ خیر سے ڈی ایس پی بن چکا ہے اور اس کا خودکشی وغیرہ کا بھی کئی ارادہ نہیں تھا، پھر تم کیوں اس کے ہتھے چڑھے ہو؟''

''یار! میں نے بتایا تو ہے تمہیں۔ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے۔ جب اس پر غصے کا حملہ ہوتا ہے تو بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے...... ایک دم حیوان بن جاتا ہے......''

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا عمران...... اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تم نے ایک بار پھر اس بندے کو فی سبیل اللہ گرفتاری دی ہے۔ اب شاید تم اسے ایس پی بنوانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں نفسیاتی ماہر کو دکھائے جانے کی ضرورت ہے۔''

''نفسیاتی مریض کو نفسیاتی مریض بڑی جلدی پہچان لیتا ہے۔ خوب گزرے کی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

''لعنت ہے تم پر۔'' میں نے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مجھے واقعی اس پر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر ایسے ہی گزری پھر میرے کان میں کھجلی ہوئی۔ وہ میرے کان کو کسی تنکے سے چھیڑ رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

اس نے گہری سانس لے کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یار! سچی بات بتاؤں گا تو تم اور ناراض ہو جاؤ گے۔ دیکھو، بات یہ ہے کہ میرے دل میں ان دونوں میاں بیوی کے لئے ہمدردی موجود ہے۔ خاص طور سے اس کی بیوی کے لئے۔ میں نے اس کی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لئے اور اس کے شوہر کے لئے جو کچھ بھی ہو سکا، کروں گا اور میں نے کر کے دکھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری گرفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے سجاد موہل کی زندگی کی ڈوبتی کشتی کو سہارا ملا...... اب میری گرفتاری اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ اسی کیس کی وجہ سے اپنے محکمے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ کیس اس کی ساکھ ہے۔ یہ ساکھ بنانے میں، میں نے موہل کی بہت مدد کی ہے۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ خبطی بندہ پھر اسی جگہ پر آ جائے گا جہاں دو سال پہلے تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا بھرم قائم رہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ہمارے Clash میں اسے کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ باقی اپنی اور میری رہائی کی فکر نہ کرو۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''کس طرح بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؟''

''یار! تم نے امیتابھ بچن کا وہ مشہور ڈائیلاگ نہیں سنا ہے جس میں وہ کہتا ہے...... جیلر! تم اپنی جیل کی سلاخیں جتنی بھی مضبوط کر لو اور دیواریں جتنی بھی اونچی لے جاؤ، جب میں نے یہاں سے نکلنا ہو گا تو نکل جاؤں گا۔''

''کوئی گیدڑ سنگی ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، فی الحال تو صرف گیدڑ ہے اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل میرا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے اسٹیل کا ایک جگ اسے مارنے کے لئے اٹھایا۔ اس نے فوراً بوسیدہ تکیے کو ڈھال بنا لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم میں باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو جاتی اور ہماری چوٹیں پھر تازہ ہو جاتیں، کوٹھی کے پورچ میں دو گاڑیاں تیزی سے داخل ہوئیں اور تیزی سے رک گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی تو وہی تھی جس میں سجاد موہل ہمیں ہوٹل سے پکڑ کر یہاں لایا تھا۔ دوسری گاڑی ایک پجیرو جیپ تھی۔ اس میں سے تین چار ہٹے کٹے افراد باہر نکلے...... اور ہمارے کمرے کی طرف بڑھے۔ موہل اور اس کے دو اہلکار بھی ساتھ تھے۔ موہل کے اشارے پر

حوالدار فیاض نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ تمتماتے چہروں والے یہ سارے افراد ہمیں یوں دیکھنے لگے جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں۔ پھر شرابی آنکھوں والا ایک سانولا شخص بولا۔ ''تو تم ہو عمران دانش...... تمہاری غائبانہ شہرت تو ہمارے محکمے میں خوب ہے۔ تم نے مشہور پروڈیوسر منوج صاحب کی ہتھیا کی اور پھر فلمی انداز میں چالیس فٹ اونچے پل سے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی تم یہاں بمبئی پولیس کو تگنی کا ناچ نچاتے رہے۔ تمہاری اور موہل صاحب کی کہانی میں تھوڑا سا مرچ مسالا اور شامل کر لیا جائے تو فلم بن سکتی ہے۔''

باقی افراد نے بھی حسبِ توفیق ہم پر ریمارکس پاس کئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں چاروں افراد موہل کے قریبی دوستوں میں شامل ہیں اور موہل انہیں اپنی یہ حیران کن اچیومنٹ دکھانے کے لئے یہاں لایا ہے۔ یہ تینوں چاروں افراد نشے میں تھے اور سگریٹ بھی پھونک رہے تھے۔ وہ ہمیں گرل دار کھڑکی میں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں بند جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔

ایک گھنی مونچھوں والے شخص نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''انور موہل ہمارے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ وہ روٹی روزی کے لئے پاکستان گیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے بدیش میں تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ بتاؤ کیسے مارا تھا تم نے اسے...... کیسے مارا تھا؟''

عمران نے کہا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں اس بندے کو جانتا نہیں، میں نے کبھی زندگی میں اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کے قتل سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''تمہارا تعلق ہے...... ہے تمہارا تعلق۔'' سجاد موہل شرابی لہجے میں گرجا۔ ''تم پاکستانی ہو۔ اور جن کتوں نے اسے مارا وہ بھی پاکستانی تھے۔ اب بتاؤ کیا سلوک کیا جائے تمہارے ساتھ؟''

گھنی مونچھوں والے نے کہا۔ ''سجاد بھائی! پچھلی دفعہ تمہارا مغز پھر گیا تھا جو تم نے اس کی گرفتاری ڈالی اور اسے کورٹ میں پیش کیا۔ اس دفعہ ایسا نہیں کرنا۔ کمینے کو مار کر یہیں اس کمرے کے فرش میں گاڑنا ہے۔''

''لیکن گاڑنے سے پہلے اس کی پوری پوری مہمان نوازی بھی کرنی ہے۔'' ایک دوسرا شخص بولا۔ ''جب مر جائے گا تو اس کی جان چھٹ جائے گی مگر مرنے سے پہلے اسے جو حلوہ پوڑی ہم کھلائیں گے، اس کی یاد مرنے کے بعد بھی اس کے من میں تازہ رہے گی۔ جگدیش بھائی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ یہاں سے نکل کر کورٹ کچہری کے چکر میں پڑے گا تو پھر بچ

کر نکل جائے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ انور موہل کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

جگدیش بولا۔ ''انور موہل نہ سہی، منوج کمار سہی۔ منوج جی کو تو تم نے ہی مارا ہے؟''

''منوج نے ایک نابالغ لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ وہ برے سے برے سلوک کا حق دار تھا لیکن میں نے پھر بھی اسے مارا نہیں، صرف زخمی کیا اسے۔''

''لیکن وہ تمہارے دیئے ہوئے زخموں کی وجہ سے ہی مرا۔ یہ ہتھیا ہی کی شکل ہے۔'' سجاد نے دانت پیس کر کہا۔

''چھوڑو یاران باتوں کو۔'' موٹی توند والے ایک شخص نے کہا۔ ''یہ بازی گر ہے، سرکس میں تماشے دکھاتا ہے۔ آج ہمیں بھی اس کا کوئی تماشا دیکھنے دو۔''

اسی دوران میں حوالدار فیاض اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے چار پانچ کرسیاں لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی تھیں۔ سجاد موہل اور اس کے مہمان ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز واقعی تماشا دیکھنے والا ہی تھا۔ لیکن جب کھڑکی کے لکڑی کے پٹ باہر سے بند کر دیئے گئے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب یہ لوگ کوئی بھی تماشا کیسے کر سکیں گے۔

اچانک ایک انجن چلنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ کوئی ڈیزل انجن تھا۔ ایسے انجن ٹیوب ویل وغیرہ چلانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یکا یک ہمارے بند کمرے میں گاڑھا دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دھواں چھت کے کسی سوراخ سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ہمارا دم گھٹنا شروع ہو گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ملیریا وغرہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ کمرے میں دھونی دے رہے ہیں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھونی ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ ہم منہ پر کپڑے رکھے کھانستے جا رہے تھے۔ پھر دم ٹوٹنے لگا۔ ''دروازہ کھولو۔'' میں چلایا اور زوردار لات آہنی دروازے پر رسید کی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

سنا تھا کہ آگ میں جل کر مرنے والے بہت تکلیف سے مرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ غالباً آگ کی جلن کے ساتھ ساتھ اس دھوئیں کی بے پناہ اذیت بھی مرنے والے کے حصے میں آتی ہے جو پھیپھڑوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں نے

بہت دیر تک سانس روکنے کی کوشش کی۔ آخر بے بس ہو گیا...... ڈیزل کا گاڑھا زہریلا دھواں سینے میں گھسا اور لگا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میں تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے کھڑکی کی گرل پر ٹانگیں رسید کیں۔ مگر یہ کوشش ''سعی لاحاصل'' کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے عمران کو دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب ہے۔ کھانستے کھانستے مجھے زور کی ابکائی آئی، مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ اچانک ایک کونے میں لگا ہوا بڑے سائز کا ایگزاسٹ فین تیزی سے گھومنے لگا۔ اس فین نے چند سیکنڈ میں دھوئیں کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

میں کھانستے کھانستے فرش پر گر گیا تھا۔ تکلیف اور اذیت برداشت کرنے کی ساری مشق آج دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ عمران کی حالت مجھ سے کافی بہتر رہی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی سانس غیر معمولی وقت تک روکے رکھی تھی۔ بہرطور اس کا رنگ بھی بالکل زرد ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے گئے۔ سجاد موہل اور اس کے ساتھی بڑے تمسخر سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جگدیش نامی شخص نے وہسکی کا طویل گھونٹ لے کر الٹے ہاتھ سے اپنے سیاہی مائل ہونٹ پونچھے اور بولا۔ ''جی جناب! کیسا لگا فلم کا یہ ٹریلر؟''

''اچھا تھا۔'' عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔

''فلم اور بھی اچھی لگے گی۔ بڑی مزاحیہ فلم ہے۔ ہنس ہنس کر برا حال ہو جائے گا تمہارا۔ پھیپھڑے دل، جگر سب کچھ منہ کے رستے باہر آ جائے گا۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' عمران نے میری بری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل بولا۔ ''سب کچھ ایک ہی سانس میں بک دو، فٹافٹ...... کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تمہارے کتنے ساتھی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر چکے ہو اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میں سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ اور اگر میں کچھ بتاؤں گا تو وہ صرف وقت ٹالنے کے لئے اور تمہارے اس ڈیزل انجن سے بچنے کے لئے بتاؤں گا۔ ہاں، اگر تم مجھے منوج کو زخمی کرنے کی سزا دینا چاہتے ہو تو یہ اور بات ہے۔ مگر اس بارے میں بھی یہ ضرور کہوں گا کہ جرم کے مقابلے میں سزا بہت بڑی ہے۔''

سجاد گرجا۔ ''بکومت۔ کوئی سزا بڑی نہیں ہے تم لوگوں کے لئے۔ تم نے اپنے ملک میں میرے بھتیجے بھائی کو مارا ہے۔ اس کو چھلنی کیا ہے۔ میں بھی چھلنی کروں گا۔ مجھے جہاں کوئی سرحد پار کا بندہ نظر آئے گا، اسے جیون اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا...... یوں کر کے۔''

اس نے شراب کی خالی بوتل کو انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے الٹا پکڑ کر ہوا میں جھلایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ کھڑکی کے پٹ پھر سے بند کر دے۔ اس نے پٹ بند کر دیئے۔ ڈیزل انجن کی منحوس آواز پھر سے بلند ہونے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''ٹھہرو، میں بتاتا ہوں تمہیں۔ کھڑکی کھولو۔''

کھڑکی پھر کھل گئی۔ انجن کی آواز بھی تھم گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اب ان لوگوں سے کچھ وقت لینا چاہتا ہے اور اس دوران میں ہی وہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ کیا کرے گا؟ اس بارے میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہرحال، مجھے اس پر اعتماد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر کر ہی گزرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ عمران اور سجاد موہل میں بات چیت شروع ہوتی اور عمران اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنے ڈھب پر لاتا، ایک اور واقعہ رُونما ہو گیا۔ ایک دراز قد شخص تیزی سے ہماری طرف آیا۔ یہ درصل جگدیش کا ڈرائیور تھا جو پجیرو گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ جگدیش کے لئے کسی کی کال تھی۔

جگدیش موبائل لے کر کال سننے میں مصروف ہو گیا۔ جبکہ لمبے قد والا ڈرائیور بڑے غور سے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جگدیش نے فون بند کیا تو ڈرائیور نے ادب سے جھک کر کہا۔ ''مالک...... یہ اندر نیلی قمیص والا کون ہے؟''

''یہ بہت بڑے ہیرو نے جنم لیا ہے ہمارے پڑوسی ملک میں۔'' سجاد زہر خند انداز میں بولا۔ ''چالیس فٹ اونچے پل سے تین من کے بندے کے ساتھ پانی میں چھلانگ۔ لگاتا ہے اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے فلمی ہیرو سنی دیول اور سنجے وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ تُو نے کوئی آٹوگراف وغیرہ لینا ہے تو لے لے اس سے۔ پھر یہ لوگ بہت مصروف ہو جائیں گے۔ جناب نے بہت ٹھکائی کروائی ہے ہم سے۔''

ڈرائیور سمجھ گیا کہ یہ بات مذق میں کی جا رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے عمران کو دیکھا پھر جگدیش کمار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مالک! اس بندے کی تو فوٹو چھپی ہے اخبار میں۔ کافی بڑی فوٹو تھی۔ شاید کل کے اخبار میں تھی۔ میں دیکھتا ہوں اخبار گاڑی میں پڑا ہوگا۔''

''جگدیش بولا۔ ''کسی اور کی ہوگی...... یہ تو ایک دم پردہ نشین قسم کے بندے ہیں۔''

''نہیں مالک...... میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔'' ڈرائیور نے کہا اور تیزی سے واپس گاڑی کی طرف گیا۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں انگلش کا اخبار تھا۔ وہ ورق گردانی کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ ''یہ دیکھیں مالک۔'' اس نے کہا اور اخبار کا ایک صفحہ جگدیش کمار کے سامنے پھیلا دیا۔

سجاد موہل سمیت سب نے سر جوڑ لئے۔ پھر ان کے تاثرات بدلے بدلے نظر آئے۔ انہوں نے اخبار کی تصویر کا موازنہ بار بار عمران سے کیا۔ آخر سجاد موہل معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں بھئی، یہ تو سچ مچ اسی خبیث کی تصویر ہے۔'' تب اس نے اخبار ہماری طرف کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ''کیوں بے! یہ تُو ہی ہے نا؟''

دھوئیں کی وجہ سے عمران کی آنکھیں ابھی تک اشک بار تھیں۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے دھیان سے تصویر دیکھی۔ میں نے بھی غور کیا۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ نفیس کوٹ اور ٹائی میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تلاش گمشدہ کا اشتہار تین کالمی تھا اور بیرونی صفحے پر تھا۔ انگریزی کے اس اشتہار کا متن کچھ اس طرح تھا۔

''اسٹار سرکس کمپنی کے اسٹاف ممبر اور معروف فن کار مسٹر عمران دانش پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے لاپتا ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق وہ اپنے کسی ذاتی کام سے پاکستان سے بھارت آنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے تھے۔ سفری دستاویزات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پچھلے سال جون میں واہگہ اٹاری کے راستے بھارت میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی گمشدگی ان کے قریبی عزیزوں کے لئے سخت تشویش کا باعث ہے۔ کوئی ان کے بارے میں جانتا ہو تو اطلاع دے۔ وہ خود پڑھیں تو فوری طور پر رابطہ کریں۔''

''یہ کیا چکر ہے بھائی؟'' سجاد موہل اور جگدیش وغیرہ نے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔

''فون لگا کر دیکھو۔'' موٹی توند والے سیٹھ نما شخص بنسی لال نے کہا۔

سجاد موہل نے جگدیش سے موبائل فون لیا۔ پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی پاکٹ سے ایک دوسری سم نکال کر موبائل سیٹ میں لگائی اور اخباری اشتہار سے نمبر پڑھ کر ملانے لگا۔

اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ رابطہ ہو گیا۔ دوستوں کو گفتگو سے آگاہ کرنے کے لئے سجاد نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ''ہیلو...... کون؟'' دوسری طرف سے بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

سجاد بولا۔ ''اخبار میں آپ کا دیا ہوا ''ایڈ'' دیکھا ہے، پاکستانی فن کار عمران دانش کے بارے میں......''

''جی جی......فرمائیں۔''

سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔''ہمارے پاس آپ کے لئے ایک اہم جانکاری ہے۔''

''جی......جی......بتائیں......اور آپ بول کون رہے ہیں؟''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟''

''بالکل نہیں۔اگر آپ اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔''

''اگر ہم آپ کو اس بندے کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ جانکاری دیتے ہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟''

''اس کے لئے نہایت معقول انعامی رقم ہے۔اشتہار میں اس کا ذکر مناسب نہیں تھا۔''

''کیا رقم ہے؟''

دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی رہی جیسے بولنے والا سوچ رہا ہو کہ کہیں یہ کوئی فیک کال تو نہیں اور وہ اپنا وقت تو برباد نہیں کر رہا۔

موہل نے اپنا سوال دہرایا۔''آپ چپ کیوں ہو گئے؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔''اگر آپ کی جانکاری واقعی مصدقہ اور کارآمد ہے تو پھر انعامی رقم آپ کی توقع سے زیادہ ہوگی۔''

موہل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں۔

''آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''یہیں الہ آباد سے۔ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے پھر رابطہ کرتے ہیں۔''

''کتنی دیر تک؟''

''قریباً ایک گھنٹے بعد۔'' موہل نے کہا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ان سب کے چہروں پر سنسنی کے آثار تھے۔

''یہ کوئی لمبا چکر ہے بھیا۔'' بنسی لال نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل نے اپنی عقابی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گاڑیں۔''ہاں بھئی بازی گر! یہ تیرے کون سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں یہاں؟ کسی سے کوئی لمبی چوڑی ٹھگ بازی تو نہیں کی ہوئی تُو نے؟''

بنسی لال بولا۔''یا ہو سکتا ہے کہ کسی کی لڑکی شڑکی بھگائی ہو۔اس کی گندی آنکھ میں سؤر کا بال تو صاف نظر آتا ہے۔''

عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔''آپ کو کوئی صدمہ پہنچ چکا ہے شاید اس سلسلے میں۔''

اس کی چوٹ پر بنسی لال تلملا گیا۔''اوئے......اوئے سؤر کے تخم۔'' وہ پھنکارا۔اس نے اپنے سفید کرتے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔انداز ایسا ہی تھا جیسے عمران پر گولی چلا دے گا۔

سجاد نے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما۔''اوئے کیا کرتا ہے بنسی! اگر اس کتے کو مارنا ہی ہے تو اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے۔اس کو ڈیزل کے دھوئیں والی مزاحیہ فلم دکھائیں گے اور ہنس ہنس کر اس کی ساری اندر کی چیزیں منہ کے رستے باہر نکل آئیں گی۔چل آ میرے ساتھ۔ابھی ذرا اشتہار کا پوسٹ مارٹم تو کر لیں۔''

سجاد اٹھ کھڑا ہوا۔جگدیش، بنسی اور ان کا تیسرا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔بنسی لال جاتے جاتے بھی خونی نظروں سے عمران کو گھور رہا تھا۔عمران نے سرگوشی کی۔''لگتا ہے اس کی بیٹی واقعی کسی کے ساتھ بھاگی ہے۔''

''یہ گئے کہاں ہیں یار؟''

''ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے ہی گئے ہیں۔''

دھوئیں کی آفت ابھی تک ذہن پر سوار تھی۔سینہ جیسے اندر سے زخمی ہو گیا تھا۔ایک انسان نے دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کر لئے ہیں۔کہیں زدوکوب کرنا، کہیں درد کے انجکشن اور کہیں یہ گاڑھا دھواں۔اس دھوئیں سے دھیان ہٹانے کے لئے میں نے عمران سے کہا۔''یہ کیا چکر چل گیا ہے؟ تصویر تو سو فیصد تمہاری ہی ہے...... باقی تفصیل بھی درست ہے۔''

''اس کو کہتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑے بلکہ دو بار پڑے۔ابھی راجواڑے کے طلسم سے نکل کر گھر بھی نہیں پہنچے کہ یہ سجاد والا سیاپا سامنے آ گیا اور اب یہ اشتہار والا ٹینٹا کھڑا ہو گیا ہے۔''

''کہیں اس کا تعلق راجواڑے والے واقعات سے تو نہیں......میرا مطلب ہے جارج اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی موت؟ یہ اشتہار انگریزی کے اخبار میں چھپا ہے۔اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہو سکتی ہے۔''

''نہیں تابی! میں نہیں سمجھتا کہ اس کا تعلق راجواڑے والی مار دھاڑ سے ہوگا۔مجھے اس میں کسی اور معاملے کی بو آ رہی ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے باس......سرکس کے مالک جان محمد صاحب تمہاری تلاش میں سرگرداں ہوں؟''

''وہ ایسے اشتہاری انداز میں اتنی بھاری رقمیں خرچ کر کے مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اشتہار ایک اخبار میں نہیں، کئی اخباروں میں آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں بھی دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ اشتہار پہلی بار ہی آیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ گاہے بگاہے چند ہفتوں یا مہینوں سے دیا جا رہا ہو۔''

''کہیں ہماری بے خبری میں ہمارا کوئی سودا وغیرہ ہی نہ ہو جائے۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ہاں، اگر سودا کرنے والی کوئی ارب پتی بیوہ یا راجکماری وغیرہ ہو تو ''بکنے'' میں کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس راجکماری کی کوئی بہت خوبصورت کزن بھی ہو۔ اس کا ٹانکا تم سے جڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں، باقی زندگی عیش آرام سے گزار سکتے ہیں۔ ایسی عورتیں اپنے پیارے رکھیلوں کو بڑے مزے کرواتی ہیں۔ میں پہلے بھی ایک ایسے خوب صورت تجربے سے گزر چکا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خوب صورت تجربے کے شوہر یا ابا وغیرہ نے تمہاری ایسی تیسی کرنے یا پھر جنس تبدیل کروانے کے لئے یہ اشتہار چھپوایا ہو۔''

''کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔''

وہ بظاہر میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا مگر اس کی خوب صورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مسلسل سوچ بھی رہا ہے۔ یہ معاملہ اس کے لئے بھی انوکھا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد سجاد موہل دوبارہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ صرف اس کے مسلح ماتحت ہی تھے۔ موہل کے چہرے پر دبا دبا جوش صاف دکھائی دیتا تھا۔ موہل کی ہدایت پر ہمارے ٹارچر سیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کم از کم تین رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہم کسی طرح کی مہم جوئی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ایک برآمدے سے گزار کر نہایت آرام دہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک شاندار ڈبل بیڈ، فریج اور الیکٹرک ہیٹر وغیرہ کی سہولت یہاں موجود تھی۔ ڈیکوریشن پیس کے طور پر شیشے کی ایک برہنہ مورتی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اس کمرے میں داخل کر کے دوبارہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ عاصمہ کا دیا ہوا موبائل عمران کی جیب میں تھا۔ ہم نے شکر کیا کہ دوبارہ ہماری تلاشی نہیں ہوئی تھی۔

عمران نے بہت پوچھا کہ یہ لطف و کرم اور عنایت کس سلسلے میں ہے لیکن موہل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہمارے اگلے چوبیس گھنٹے بڑی اچھی طرح گزرے۔ نہ صرف ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کیا گیا بلکہ نئے کپڑے بھی دیئے گئے۔ شیو اور غسل کے سارے لوازمات پہلے ہی کمرے کے واش روم میں موجود تھے۔

عمران بولا۔ ''ہوسکتا ہے یہ واقعی کسی راجکماری کا چکر ہو یار۔ مجھے بڑے عرصے سے شوق ہے کسی راجکماری کے ہاتھوں اغوا ہونے کا اور اپنی تمام مردانہ دلکشیوں کے ساتھ اس کی ''خدمت'' کرنے کا۔''

''میں پھر وہی بات کہوں گا۔ اگر کوئی ''راجکمار'' ہوا اور اس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوا تو پھر؟ میں تو یونہی مفت میں مارا جاؤں گا۔''

''تم مرنے کے پیسے لے لینا یار مگر اس طرح کی مایوس کن باتیں نہ کرو۔ اور کیا پتا تمہاری یہ ساری بدگمانیاں دور ہو جائیں اور ہم واقعی کسی اچھے مقصد کے لئے اشتہاری قرار پائے ہوں۔''

''تمہارے کرتوت تو کبھی ایسے نہیں رہے۔ تم نے خود بتایا ہے، سرکس میں آنے کے بعد تم ہر طرح کے لوگوں سے ہر طرح کے پنگے لیتے رہے ہو۔ کیا پتا، کوئی ایسا ہی پنگا پھر سے زندہ ہو گیا ہو۔''

''میڈم صفورا ایسے حالات میں بڑے صائب مشورے دیتی ہے لیکن افسوس وہ بھی نہیں ہے۔ کاش، ہم اس کو بھی اپنے ساتھ ہی یہاں لا سکتے۔''

''تو اب پھنسوا دو اسے۔ اس بندے کا پتا بتا دو جس کے ذریعے کپتان اجے نے ہوٹل میں ہمارے کمرے بک کروائے تھے۔ یہ تمہارا یار ڈی ایس پی چنگیز خاں نہ صرف میڈم بلکہ اسد اور نوری، صفیہ وغیرہ کو بھی یہاں لے آئے گا۔ پھر سارے مل کر روئیں گے۔''

''بس ہر بات کو رونے کی طرف لے جانا۔'' عمران نے برا سا منہ بنایا۔

اسی دوران میں عمران کی جیب میں پڑے موبائل سیٹ نے وائبریٹ کیا۔ عمران نے احتیاط سے موبائل نکالنے کے بعد میسج چیک کیا۔ یہ ڈی ایس پی کی جواں سال بیوی عاصمہ کی طرف سے ہی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بھائی جان! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو باہر والے کمرے سے نکال کر انیکسی میں لے آئے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا ہے۔ سجاد اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے کہ انہوں نے آپ کو دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے سب پتا ہے۔ اگر آپ خود نہ چاہتے تو وہ آپ کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ آپ اپنے وعدے کا پاس کر رہے ہیں اور اس کے لئے آپ نے خود کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال

لیا ہے۔ کاش، یہ وعدہ ہمارے درمیان نہ آیا ہوتا۔ اور اگر آیا تھا تو پھر یہ صورتِ حال ہی نہ بنتی جواب بنی ہے۔ آپ کا اور سجاد کا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ اللہ کرے میں ہی مر جاؤں اور آپ پر سے یہ بلا ٹل جائے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بتائیں میں کس طرح آپ کی مدد کروں؟''

عمران نے جواب میں لکھا۔ ''گھبراؤ مت۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی مدد پہنچ رہی ہے اور اس کا ایک ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ ہم اس ٹارچر سیل سے اس آرام دہ مہمان خانے میں آ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آگے اور ترقی کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے ایس ایم ایس کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ وعدے وغیرہ کا کیا معاملہ ہے؟ یہ کیسا وعدہ تھا جس کی وجہ سے تم نے اس مگرمچھ کے جبڑوں میں اپنا سر دیا ہے؟''

''عشق پر کسی کا زور نہیں غالب...... تمہیں بتایا تو ہے اسے دیکھ کر میرے دل کو کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اب تک سہرا باندھ چکا ہوتا۔ اب بھی میں نے اسے آفر دے رکھی ہے کہ اگر وہ اپنے کھڑوس شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو سیکنڈ آپشن کے طور پر میں حاضر ہوں۔''

''میں جانتا ہوں یہ بات تم صرف مذاق میں کرتے ہو اور عاصمہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔''

''تمہارے جیسے دوست کے ہوتے ہوئے بندے کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی...... شیکسپیئر نے اپنی ایک پنجابی نظم میں لکھا ہے کہ اے فرینڈ ان نیڈ از فرینڈ ان ڈیڈ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ......''

وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا تھا لیکن اس بار میں بھی پٹڑی سے اتر گیا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ میں نے کہا کہ وہ ہر بات کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے ہر وقت مخمصے میں رکھنے کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔ میں اب یہ عادت مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جب واقعی غصہ آ جاتا تھا تو وہ فوراً سنبھل جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے حسبِ عادت فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور اتنے مسکین لہجے میں مجھے منانا شروع کیا کہ میں اپنا غصہ برقرار نہ رکھ سکا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ ہماری مشرقی عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بس جس کے پلے بندھ گئیں، بندھ گئیں۔ ڈی ایس پی سجاد ہرگز اچھا شوہر نہیں ہے لیکن

عاصمہ کے لئے تو سب، کچھ وہی ہے۔ وہ اس کی ماریں بھی کھاتی ہے اور پوجا بھی کرتی ہے...... اس کی ترقی اور بھلائی کی دعائیں اس کا معمول ہیں۔ جس رات میں سجاد کو سبق سکھانے کے لئے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا، عاصمہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے بجا طور پر یہ خدشہ لاحق تھا کہ آج رات سجاد خودکشی کر لے گا یا کثرت شراب نوشی سے موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ عاصمہ کی گریہ زاری دیکھ کر پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے سجاد کو گرفتاری دے دی۔ یہ گرفتاری ایک ایسے بے بدل ٹانک کی طرح تھی جس نے سجاد کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے ابھارا اور اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ میرے خیال میں تمہیں یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہوگا لیکن اس بات کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ اس رات، ٹوٹے پھوٹے اور اپنی ہی آگ میں راکھ ہوتے سجاد کے لئے میری گرفتاری کتنی ضروری تھی...... میری گرفتاری کے دسویں بارہویں روز عاصمہ برقع پہن کر رازداری کے ساتھ مجھ سے ملنے جیل آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ روتے ہوئے میرے قدموں پر سر رکھ دیتی۔ وہ میری رہائی کے بارے میں بہت فکرمند تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ میں اس سنگین معاملے سے کس طرح نکل پاؤں گا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ایک مسئلہ بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ جھانسی کی ایک پیرزادی سیدہ جویریہ رضوی کی انتہائی معتقد ہے اور ان سے راہنمائی لیتی ہے۔ سیدہ جویریہ استخارہ کرتی تھیں اور فال وغیرہ نکالتی تھیں۔ انہوں نے عاصمہ سے سارے حالات معلوم کرنے کے بعد ایک خاص بات بتائی تھی اور وہ یہ کہ جس بندے کی بے لوث قربانی اور ہمدردی کی وجہ سے سجاد موہل خطرناک مایوسی اور ابتلا کے دور سے نکلا ہے، وہی بندہ کسی دوسرے موقع پر سجاد کی زندگی کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا ہے...... اس لئے سجاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ آئندہ اپنے اس محسن سے دور رہے یا پھر وہ محسن اس بات کا خصوصی خیال رکھے کہ ان دونوں کی ملاقات دوبارہ نہ ہونے پائے۔ اور اگر ایسا ہو ہی جائے تو پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محتاط ہیں......

''اپنی فال ہی کے ذریعے اس مستقبل بیں خاتون نے عاصمہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور میں چند دن کے اندر ہی خود کو قانونی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ جیل میں ہونے والی اس ملاقات میں عاصمہ نے رو رو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں اس سے ایک وعدہ کروں۔ آئندہ اگر کبھی میرے اور سجاد کے درمیان تصادم یا ٹکراؤ کی کوئی بھی صورت پیدا ہوئی تو میں خود کو روک لوں گا اور اس تصادم سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شوہر پرست عورت اس وقت شدید واہموں کا شکار ہے۔ میں نے اس کی تشفی کے لئے اس سے وعدہ کیا کہ بالفرض کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ وہ اس طرح مانی نہیں تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا...... میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں۔ اور میں نے اس کی خاطر قسم کھالی۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ پیشین گوئیاں کبھی کبھی درست بھی ثابت ہو جاتی ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی بنیاد تو نہیں ہے یار میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سجاد موہل سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ لیکن جب پارک ویو ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے میں نے اچانک اسے دیکھا اور اس نے مجھے تو میرے ذہن میں وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا دیا ہوا قول بھی۔''

عمران نے ذرا سا توقف کیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''وہ سچویشن تم نے بھی دیکھی تھی۔ سجاد موہل اس وقت غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایسا شخص شدید تناؤ میں دوسروں کو یا پھر خود کو شدید نقصان پہنچا لیتا ہے۔''

عمران نے بات ختم کی اور پُرسوچ انداز میں سگریٹ کے لمبے کش لینے لگا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی باتیں بھی انوکھی تھیں۔

دو سال پہلے وہ بمبئی شہر کی ایک پُرفسوں رات میں ایک عورت کی حالتِ زار سے متاثر ہوا تھا...... اس کے لئے ایک انوکھی قربانی دی تھی اور پھر اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ عورت اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اس سے اسے کوئی مطلب تھا۔ وہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا فائدہ بھی لینا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کیا ہوا عہد اسے یاد تھا۔ اس عہد کی خاطر اس نے خود کو بے دریغ مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری منطق نرالی ہے یار...... اور سچی بات یہ ہے کہ پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہیں پتا تھا کہ تم ایک سنگین کیس میں ملوث ہو اور پولیس کی کسٹڈی سے بھاگے ہوئے بھی ہو پھر بھی......''

''یار! میرا خیال تھا کہ ہم راستے میں کچھ نہ کچھ کر گزریں گے اور شاید کسی مناسب طریقے سے سجاد سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن تم نے دیکھ ہی لیا، اس نے گاڑی میں ہماری کوئی بات سنی اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی موقع دیا۔ پھر تمہارے پاؤں میں بھی اچانک ہی زنجیر ڈال دی گئی۔ جہاں تک کیس کے سنگین ہونے کا تعلق ہے، میرا نہیں اندازہ تھا کہ یہ اتنا سنگین ہے۔ میں نے پروڈیوسر منوج کو صرف زخمی کیا تھا...... جان سے نہیں

مارا تھا۔ اب یہ لوگ اسے قتل کہہ رہے ہیں لیکن یہ کسی طور قتل نہیں بنتا...... اور اب تو...... یہ ویسے بھی کوئی دوسرا کیس بنتا جا رہا ہے۔'' عمران نے کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔

''دوسرا کیس؟''

''جگر! یہی اشتہار والا معاملہ۔ جس طرح ہمیں ایک دم حوالاتی سے وی آئی پی بنا دیا گیا ہے، مجھے لگتا ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہ وہی ٹریٹ منٹ ہے جو بکروں کا مالک قربانی کے بکروں کو دیتا ہے۔''

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ تھی۔ کوئی عورت ادھر آ رہی تھی۔ امکان تھا کہ یہ عاصمہ ہی ہوگی۔ یہ امکان درست نکلا۔ وہ اس مختصر لاؤنج میں آ گئی جو ہمارے کمرے کے سامنے واقع تھا۔ یہاں حوالدار فیاض چوکس حالت میں موجود تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی لیکن اس کی توجہ ہماری ہی طرف تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور رنگت اڑی اڑی تھی۔ وہ دراز قد اور خوش شکل تھی۔ کھلی ہوئی رنگت، تھوڑے سے ابھرے ہوئے رخسار اور ستواں ناک میں کوکے کی مدھم چمک۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا لمبا اونی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گلابی رنگ کی گرم شال کوٹ کے ہم رنگ تھی۔ میں نے اسے خاصی توجہ سے دیکھا۔ عمران نے بتایا تھا کہ عاصمہ میں کسی حوالے سے شبانہ کی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ وہی شبانہ جس نے شبو بن کر عمران کے دل پر راج کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ہم سے بات کرنا چاہتی ہے مگر حوالدار فیاض اور ہیڈ کانسٹیبل کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تو قدرے دور تھا مگر حوالدار بالکل ہمارے سر پر موجود تھا۔ حوالدار کی توجہ ذرا دوسری طرف ہوئی تو عاصمہ نے بڑے التجائی انداز میں عمران کو اشارہ کیا۔ وہ اس سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ موبائل فون آن کرے۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد عمران نے موبائل آن کر لیا۔ چند ہی منٹ بعد موبائل نے وائبریٹ کیا اور عاصمہ کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بھائی جان! آپ مجھے کیوں اتنی سخت سزا دے رہے ہیں۔ آپ صرف میری خاطر اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اور مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے ہیں۔ سجاد پتا نہیں کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کل سے تھانے بھی نہیں گئے۔ ایک لینڈ کروزر پر کچھ لوگ شام کے وقت سجاد سے ملنے آئے تھے۔ ان میں ایک بندہ کسی یورپی کنٹری کا لگتا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا یہاں رہے۔ پھر سجاد کا

دوست جگدیش ان کے ساتھ چلا گیا۔ یہ جگدیش مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس کے رابطے غلط لوگوں سے ہیں۔ پلیز! مجھے جواب دیں۔"

عمران نے لکھا۔ "تم خود کو خطرے میں نہ ڈالو اور اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہو۔ جب بھی کوئی خوب صورت لڑکی میری خاطر خود کو خطرے میں ڈالتی ہے، میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ خاص طور سے منگل اور بدھ کو ایسا ہوتا ہے۔ اور آج منگل ہے...... میں اپنی حفاظت کرلوں گا۔ پلیز! اب رابطہ نہ کرنا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خدا حافظ۔"

اس میسج کے بعد عمران نے فون حتمی طور پر بند کر دیا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "عاصمہ نے کسی غیر ملکی کی بات کی ہے۔"

"ہاں، یہ قابلِ غور بات ہے۔"

ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ دو بڑی جیپیں کوٹھی کے ڈرائیو وے پر نظر آئیں اور پورچ میں آکر رک گئیں۔ ان میں سے ایک شاندار لینڈ کروزر جیپ کے شیشے سیاہ تھے۔ گاڑیوں میں سے آٹھ دس افراد اترے۔ ان میں کچھ مسلح تھے اور کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے اہلکار لگتے تھے۔ ان کمانڈو ٹائپ اہلکاروں نے تاریک شیشوں والی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ سادہ شیشوں والی لگژری جیپ میں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد اترے۔ ان میں سے ایک کے بال سفیدی مائل تھے۔ بہرحال، ہم ان کی صورتیں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے۔ انہوں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور انہیں کوٹھی کے اس حصے میں لے آئے جہاں ہم موجود تھے۔

"لگ رہا ہے کہ اب ہمارا چل چلاؤ ہے۔ یہ موبائل فون کہیں چھپا دینا چاہیے۔" عمران نے کہا۔

میں نے جلدی سے ایک چھوٹے صوفے کو ترچھا کیا اور اس کے نیچے کا کپڑا بلیڈ سے ذرا سا کاٹ کر موبائل سیٹ اس میں گھسا دیا۔

دو تین منٹ بعد بھاری قدموں کی چاپوں سے کمرے کے سامنے والا لاؤنج گونج اٹھا۔ حوالدار فیاض نے کمرے کے دروازے کو "اَن لاک" کیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ ہماری طرف کوئی گن "پوائنٹ" نہیں کی گئی تھی۔ گنیں اہلکاروں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن کسی بیرل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ تھری پیس سوٹ والا ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور سپاٹ لہجے میں ہم دونوں سے ہمارے نام پوچھے اور ولدیت دریافت کی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چھپانے سے فائدہ نہیں۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے

بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ عمران کی قمیص کی آستین اٹھا کر اس کے بازو پر پرانے کٹ کا ایک نشان دیکھا گیا۔ اسی طرح میرے کندھے پر، گردن کے قریب دو تل تلاش کیے گئے۔ یہ تل شناختی کارڈ میں علامت کے طور پر موجود تھے۔

ادھیڑ عمر شخص نے شستہ اردو میں کہا۔ "امید ہے کہ آپ دونوں ہم سے تعاون کریں گے۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم آپ سے آپ کے بارے میں پوچھیں۔"

"آپ کو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن فی الحال ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ ہمیں عارضی طور پر آپ دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنا ہوگی۔" ادھیڑ عمر شخص نے پھر شائستہ لہجے میں کہا۔

"اگر ہم انکار کریں تو پھر؟" عمران نے کہا۔

"ہمیں افسوس ہوگا کہ آپ ہمارے دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہے۔"

"اوکے۔" عمران نے کہا۔

"ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھی گئیں۔ دو افراد نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑا اور لے کر چل دیئے۔ ہمارے عقب میں اور دونوں طرف کم و بیش آٹھ مسلح افراد موجود تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ زبردست تربیت یافتہ ہیں۔ ہمیں پورچ میں لا کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ اگلی گاڑی تھی اور وہی تھی جس کی کھڑکیوں میں تاریک شیشے تھے۔

ہمارا سفر شروع ہوا۔ ہمارے گرد مسلح افراد موجود تھے اور وہ بالکل خاموش تھے۔ ادھیڑ عمر شخص بھی اسی گاڑی میں موجود تھا اور وہ اگلی نشست پر تھا۔ عمران نے راستے میں ایک دو سوال پوچھنے کی کوشش کی مگر ادھیڑ عمر شخص کا رویہ اب پہلے سے زیادہ خشک ہو چکا تھا۔ اس نے عمران کو فی الوقت خاموش رہنے کی ہدایت کی......

ہم الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزر کر قریباً پون گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ یہ منزل بھی کوئی رہائشی عمارت ہی تھی۔ یہاں رکھوالی کے بڑے...... کتے موجود تھے اور ماربل کے فرش پر لوگوں کے ٹھک ٹھک چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک دو افراد کو انگریزی بولتے بھی سنا۔ ان میں سے ایک یقیناً کوئی غیر ملکی خاتون تھی۔ اس عورت نے عمران کو دیکھ کر حیرت اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا...... اس کے الفاظ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آسکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک نما گاڑی تھی...... تاہم نشستیں نہایت آرام دہ تھیں۔ اس موقع پر عمران نے اپنی پٹی اتارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک سکھ گارڈ نے پنجابی لہجے میں کہا۔ ''نہیں، ابھی نہیں جی۔ ابھی سر جی کا آرڈر آئے گا تو پٹی ہٹا لیجئے گا۔''

ہمارے اندازے کے مطابق گاڑی میں شاید گتے کے بہت سے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ گاڑی کے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گاڑی پہلے سے یہاں ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔

دو تین منٹ بعد ایک انٹرکام جیسی آواز سنائی دی۔ ''اب آپ اپنی پٹیاں ہٹا سکتے ہیں۔''

ہم دونوں نے پٹیاں ہٹا لیں اور چندھیائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہم ایک چھوٹے سائز کے کنٹینر میں تھے۔ تاہم یہ کوئی عام کنٹینر نہیں تھا۔ اس کا انٹیریئر زبردست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی ریل گاڑی کے اسپیشل لگژری کیبن میں سفر کر رہے ہیں...... ایک طرف ایک درمیانے سائز کا ریفریجریٹر بھی موجود تھا اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے لئے آکسیجن کے سلنڈر بھی رکھے تھے۔

عمران نے کنٹینر کی دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کنٹینر کی بیرونی دیواریں نہیں ہیں۔ یہ ڈبل دیواروں والا کیبن تھا۔ یعنی اگر ہم اندرونی دیوار کو پیٹنا بھی شروع کر دیتے تو شاید باہر تک اس کے اثرات نہ پہنچ پاتے۔ اس چھ فٹ چوڑے اور قریباً آٹھ فٹ لمبے کیبن میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کیبن کی ایک دیوار گتے کے اسٹائلش ڈبوں کی تھی۔ یہ ڈبے فرش سے چھت تک چنے ہوئے تھے۔ عمران نے ان ڈبوں پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنا شروع کیا۔ ''کمپیوٹر ہارڈ ویئرز اینڈ اسیسریز فاران کمپنی لمیٹڈ اللہ آباد۔''

عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ کمپیوٹرز کے پرزہ جات ہیں جو فیکٹری سے کسی مارکیٹ میں پہنچائے جا رہے ہیں۔''

''اور ہمیں ان کی آڑ میں پہنچایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری آواز ذرا بلند تھی۔ عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری آواز سنی جا رہی ہے۔

دفعتاً انٹرکام نما آلہ پھر جاگ اٹھا۔ کسی مقامی شخص نے ریڈیو اناؤنسر کی سی آواز میں

کہا۔ ''فریج میں آپ کے کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ دائیں طرف شیلف پر اوون پڑا ہے جس میں آپ کھانا گرم کر سکتے ہیں۔ بائیں طرف جو چھوٹا دروازہ نظر آ رہا ہے، وہ واش روم کا ہے۔ پانی محدود ہے اس لئے آپ کفایت سے استعمال کریں۔''

''لیکن ہم......'' عمران کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انٹرکام بند ہو چکا تھا۔

''ہیلو...... ہیلو۔'' عمران نے ایک دو مرتبہ کہا پھر گہری سانس لے کر لچک دار بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''لگتا ہے ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

عمران نے ٹانگ سے فریج کا دروازہ کھولا اور اندر موجود کھانے پینے کی اشیاء کو دیکھ کر بولا۔ ''ان چیزوں کو دیکھا جائے تو پھر چار پانچ دن کا سفر تو بنتا ہی ہے۔''

''لیکن اگر تمہاری بھوک کو دیکھا جائے تو پھر کچھ کم بنتا ہے۔''

''تمہیں زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں بچو۔ کھٹمنڈو پہنچ کر بولتی بند ہو جائے گی...... وہاں کڑاکے کی سردی ہوگی۔''

''یہ کھٹمنڈو بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''بھئی جس جگہ سے ہم چلے ہیں اور جدھر کا ہمارا رخ ہے، ہم چار پانچ دن میں کھٹمنڈو تو پہنچ ہی جائیں گے...... نہ ہوا تو تبت ہوگا یا پھر سن کیانگ وغیرہ۔ کیوں جی، ایسا ہی ہے نا برادرز۔'' عمران نے آخری الفاظ کنٹینر والوں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کنٹینر بڑی رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی موٹروے جیسی سڑک پر جا رہا ہے۔ عمران نے اداسی بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

مجھ پر بھی اداسی سوار ہو رہی تھی۔ بالو بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ وہ معصوم ماں سے تو جدا ہو ہی چکا تھا، اب مجھ سے بھی دور تھا۔ بہرحال، مجھے میڈم صفورا کی ہوشیاری اور اسد کی دلیری سے خاصی توقعات تھیں۔ امید تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کر لیں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ انہیں اجے کا تعاون بھی حاصل تھا۔

کپتان اجے کا خیال آتے ہی وہ سارے واقعات ذہن میں اودھم مچانے لگے جو صرف چند روز پہلے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمارے ساتھ پیش آ چکے تھے...... ایسا لگتا تھا کہ ہم 1857ء کی جنگ آزادی کے دور سے ایک دم جدید دور میں لوٹ آئے ہیں۔ قاسمیہ کے پرانے قلعے کے اردگرد ہونے والی خوں ریز لڑائی، آگ، دھواں، بارود، تلواروں کی

جھنکار......اور پھر اس سے پہلے اسٹیل اور منیارڈ کی موت، سولیاں چڑھائے جانے کے مناظر اور بازاروں میں ہونے والی قتل و غارت اور عصمت دری۔ وہ سب واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

وہ سب کچھ اب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا لگتا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسٹیٹ کی لڑائی کو یاد کر رہا ہوں......اور تم؟''

''میں لاہور کو یاد کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اپنا ملک اور اپنا شہر دیکھنے کی حسرت پھر دل میں ہی رہ جائے گی۔ ہائے پاکستان......ہائے لاہور۔''

O......❖......O

ہمارے اگلے پانچ روز ایک انوکھے تجربے جیسے تھے۔ ہم نے یہ پانچ دن ایک چھ ضرب آٹھ فٹ کے کیبن میں گزارے تھے......اور یہ کیبن تقریباً دن رات حرکت کرتا رہا تھا۔ کبھی ہموار سڑکوں پر، کبھی بہت ہموار سڑکوں پر۔ ہم کہاں سے گزرتے رہے تھے، ہمیں کچھ خبر نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باہر سے کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی......نظر کا راستہ بھی یکسر مسدود تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا واحد رابطہ وہ انٹرکام تھا جس کے ذریعے کبھی ایک مرد اور کبھی ایک عورت ہمیں مخاطب کرتے تھے اور یہ رابطہ بھی دن میں صرف ایک آدھ بار ہی ہو پاتا تھا۔ ہمارا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے پانچویں روز یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ عمران کی رسٹ واچ شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ پانچ روز بعد پہلی بار ہمارے لگژری کیبن کا دروازہ کھلا اور ہمیں کسی آدم زاد کی صورت نظر آئی۔ اس آدم زاد کے پیچھے ایک اور آدم زاد بھی تھا جس کے ہاتھ میں خطرناک ''اے کے 56'' رائفل تھی......ہم سے بڑے شائستہ لیکن فیصلہ کن لہجے میں ایک بار پھر درخواست کی گئی کہ ہم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا لیں۔ اس درخواست کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ ریشمی پٹی باندھ دی گئی۔ مسلح کمانڈوز ٹائپ افراد نے ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ ہمارے اردگرد بہت سے بوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ موسم خاصا ٹھنڈا تھا۔ قریباً پچاس میٹر پیدل چلانے کے بعد ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ ہم باقی سب باتیں فراموش کر کے اندازے لگانے میں مشغول ہو گئے کہ ہم کس مقام پر

ہیں۔ یہ انڈیا تو ہرگز نہیں تھا۔ کمرے کی ڈیکوریشن اور دیگر اشیاء سے بھی کچھ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمارے اردگرد موجود افراد تو کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ ورنہ ان کی زبان اور لہجے سے کوئی قیافہ لگایا جاتا۔

عمران نے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے، انڈیا، نیپال یا چائنا؟ ویسے مجھے، تو ماحول کچھ کچھ نیپال جیسا لگتا ہے۔ اور یہ پینٹنگ دیکھو۔ اس میں بھی کچھ ایسا ہی رنگ ہے۔''

''لیکن یہ فرش دیکھو...... یہ ماربل ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق کھٹمنڈو وغیرہ میں اچھے ہوٹلوں کے فرش اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں اور یہ پردوں کا اسٹائل...... یہ بھی کچھ وکھری ٹائپ کا ہے۔''

اچانک عمران کی نظر ایک دیوار گیر الماری پر پڑی۔ وہ اس کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہو بالائی سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک اسٹائلش ایگزاسٹ فین نظر آ رہا تھا۔ عمران نے اس فین کی پلاسٹک جالی سے باہر جھانکا۔ پھر بے اختیار پکار اٹھا۔ ''اوئے ہوئے ہوئے۔'' اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''خود دیکھ لو اوپر آ کر۔''

میں نے عمران کی تقلید کی اور الماری کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا ایگزاسٹ فین کی جالی تک پہنچا۔ میں دنگ رہ گیا۔ اس دوسری منزل سے بلند درختوں کے پیچھے مجھے جو منظر نظر آیا، وہ مینارِ پاکستان کا تھا۔ مینارِ پاکستان کا اوپر والا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ لاہور کا جانا پہچانا آسمان تھا......شام ڈوب رہی تھی۔ سرخ افق پر پتنگیں ڈول رہی تھیں......

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یار تابی! یہ مینارِ پاکستان لاہور سے چل کر کھٹمنڈو کیسے پہنچ گیا؟''

میں کیا جواب دیتا۔ میں خود حیرت کے دریا میں بہہ رہا تھا۔ میری نگاہیں ایگزاسٹ فین کی جالی سے باہر مینارِ پاکستان کے بالائی حصے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالائی حصہ سرسبز درختوں کی ہریالی کے درمیان سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہم منٹو پارک کے آس پاس کہیں موجود تھے۔

میں نے گہری سانس لی......اور مجھے اس سانس میں اپنے پاکستان اور اپنے لاہور کی جانی پہچانی خوشبو صاف محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو سینے میں اتری اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ میں حیران ہوا کہ اس جاں فزا خوشبو کی طرف میرا دھیان پہلے کیوں نہیں گیا۔ بے شک ہمیں

ائرٹائٹ اور تقریباً ساؤنڈ پروف کنٹینر سے نکال کر لایا گیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی مگر ہوا تو ہمارے سینوں میں آ جا رہی تھی۔ تب یہ پتا کیوں نہ چلا کہ یہ اپنی دھرتی کی ہوا ہے۔

عمران بولا۔ ''چلو اب الماری سے نیچے آؤ اور میرے ہاتھ پر چٹکی کاٹ کر بتاؤ کہ میں کہیں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

میں نیچے آ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ حیرت اور خوشی کی ملی جلی عجیب سی کیفیت تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو، کیسا عجیب تماشا ہوا ہے۔ ہم لاہور آنا چاہتے تھے اور ہمیں پکڑ کر زبردستی جس جگہ لایا گیا ہے، وہ بھی لاہور ہی ہے۔''

''فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ باقی لوگ نہیں ہیں، اقبال، میڈم اور بالو وغیرہ۔''

بالو کے ذکر نے مجھے ایک بار پھر پریشان کر دیا۔ کچھ پتا نہیں تھا وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اچانک کہیں فاصلے سے رکشے کی جانی پہچانی پھٹ پھٹ ابھری اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد کسی چھت سے ''بو کاٹا'' کی بلند آواز سنائی دی۔ چھت پر چڑھی ہوئی کسی پتنگ باز ٹولی نے کوئی پتنگ کاٹی تھی۔ ان دو آوازوں نے ایک دم لاہور کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا۔ اس شہر ہزار رنگ کے سارے رنگ نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جانی پہچانی گلیاں، بازار، ریستوران، چوراہے، تفریح گاہیں...... اور شام گہری ہو رہی تھی...... روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ایک اور جگمگاتی شب زندہ دلوں کے اس نگر پر وارد ہو رہی تھی۔

میرا دھیان ایک دم اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی اس شہر کی کسی چار دیواری میں موجود تھے۔ انہی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے۔ عمران میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔ ''فرح اور عاطف کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور میری آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے تم سے کچھ غلط نہیں کہا تھا، وہ دونوں یہاں بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ان شاءاللہ۔''

''میں...... انہیں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''یار! میں نے بہت صبر کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں کا ایک ایک پل گن کر گزارا ہے۔

اب ان کے بالکل پاس آ کر ان سے دور نہیں رہا جاتا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ دروازے توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اس طرح ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟ انہوں نے بہت بڑی رقمیں خرچ کی ہیں ہم پر۔''

''مگر پتا تو چلے کہ یہ ہیں کون؟ کیا چاہتے ہیں ہم سے؟''

''دیکھو، تم پھر خود کو ایڈیٹ ثابت کر رہے ہو۔ کیا پتا ہمارے ان مہربانوں نے اس کمرے میں ہماری باتیں سننے کا انتظام کر رکھا ہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''میں نے کہا۔'' مجھے پروا نہیں۔''

''ٹھیک ہے اگر تمہیں نہیں تو پھر مجھے بھی نہیں۔'' اس نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔

''مہربانو، قدردانو! اگر ہماری آواز سن رہے ہو تو ازراہِ مہربانی سامنے آؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم اس زبردست مہمان نوازی کے بدلے آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

شاید عمران کو بھی توقع نہیں تھی کہ اس کی پکار کا جواب اتنی جلدی مل جائے گا۔ یکا یک کمرے کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور وہ سلائڈ کر کے کھل گیا۔ ایک درمیانی عمر کا خوش پوش شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، ساتھ قیمتی کپڑے کا کوٹ تھا اور گلے میں مفلر کو اسکارف کی طرح باندھ رکھا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر عمران کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور گرم جوشی کی چمک نمودار ہوئی۔ دوسری طرف، اندر آنے والا شخص بھی ایک دم جذباتی نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور عمران سے لپٹ گیا۔ عمران نے کہا۔ ''امید نہیں تھی انکل کہ آپ سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔''

دونوں کچھ دیر گلے...... لگے رہے اور ایک دوسرے کے کندھے تھپکتے رہے۔ تب عمران نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سے ملو، یہ ہیں انکل جان محمد اور انکل! یہ تابش ہے۔ یہ سرکس میں تین چار بار میرے ساتھ آیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔''

میں پُرتجسس نظروں سے جان محمد صاحب کو دیکھتا چلا گیا۔ زرگاں میں جشن کی رات، عمران نے مجھے جو اپنی طویل رُوداد سنائی تھی، اس میں جان صاحب کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا تھا۔ یہ اسٹار سرکس کے مالک جان صاحب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عمران کی خداداد صلاحیتیں پہچانی تھیں اور اس کی قدر کی تھی۔ انہوں نے عمران کو ''راجا'' کے چکر سے نکال کر اپنی سرکس کمپنی میں معقول معاوضے پر ملازمت دی تھی اور قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔

بعدازاں عمران نے بھی اپنے محسن کی خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس کی کوششوں سے اس سرکس کمپنی نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔

جان صاحب مجھ سے بھی بغلگیر ہوئے اور میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ انہوں نے کہا۔ ''تابش! تم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہو۔ تمہاری خاطر عمران ایک سال سے زیادہ عرصے تک ہماری نظروں سے غائب رہا ہے۔ خوشی کی بات ایک ہی ہے...... اور وہ یہ کہ اس کی تلاش بیکار نہیں گئی۔ تم اس کے ساتھ ہو۔''

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جان صاحب نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہنے اور سننے کو تو بہت کچھ ہے عمران...... اور ہم دونوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال بھی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں جو سب سے اہم سوال ہے، وہ یہی ہوگا کہ تمہیں اس طرح یہاں پاکستان لانے والا کون ہے اور کیوں لایا ہے؟''

''ہمیشہ کی طرح آپ کا خیال درست ہے انکل۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے بھی پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آنٹی کیسی ہیں اور کہاں ہیں؟''

''وہیں خوشاب میں ہے اور میری طرح وہ بھی تمہیں بے حد بے حد مس کرتی رہی ہے۔ تم بھی تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوئے۔ کوئی اتا پتا نہ خیر خبر۔ یہ کوئی پرانا دور تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے بارے میں ایک اطلاع بھی نہ دے سکے......''

عمران دلکش انداز میں مسکرایا۔ ''جہاں ہم تھے، وہ پرانا دور ہی تھا انکل۔ سمجھ لیں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں کا دور تھا۔ خچر، گھوڑا گاڑیاں، لالٹینیں اور تلواریں۔ ایک ایسی جزیرے جیسی جگہ تھی جہاں سے ہم باہر نہیں آسکتے تھے اور نہ ہماری خبر آسکتی تھی۔ یہ لمبی کہانی ہے، آپ کو آرام سے سنائیں گے۔''

''تم الٰہ آباد جیسے جدید شہر کو پرانے دور کا جزیرہ کہہ رہے ہو؟'' جان صاحب نے پوچھا۔

''الٰہ آباد اس کے مقابلے میں پیرس ہے جناب۔ میں کسی اور جگہ کی بات کر رہا ہوں...... الٰہ آباد تو ہم بس آٹھ دس روز پہلے پہنچے تھے۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے کمر بھی سیدھی نہیں کی تھی کہ اٹھا لئے گئے۔''

جان محمد صاحب کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر تجسس بڑھتا جا رہا ہے، تاہم اس موقع پر وہ بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کرسی کی آرام دہ

نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تو پچھلے قریباً ایک سال ہی سے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر زور و شور سے تمہاری تلاش کوئی تین مہینے پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس تلاش کو شروع کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جسے تم جانتے نہیں ہو۔ وہ پاکستانی بھی نہیں ہے۔ اس سے مل کر تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو دیں؟''

''وہ بہت مال دار برطانوی باشندہ ہے لیکن وہ شکل سے تمہیں برطانوی نظر آئے گا اور نہ ہی مال دار...... بلکہ اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا تمہارے لئے بہت مشکل ہوگا۔ اسے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہی ہے جس کی وجہ سے اس نے پچھلے چند مہینوں میں تمہاری تلاش پر پانی کی طرح پیسا بہایا ہے۔ انڈیا کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کونے کونے میں تمہاری تلاش ہوئی ہے۔ پولیس اور انٹرپول کے علاوہ پرائیویٹ اداروں سے مدد لی گئی ہے۔ اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دیئے گئے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اب بھی الٰہی آباد کی اس پارٹی کو قریباً پچاس لاکھ روپیا دیا گیا ہے جس کی تحویل میں تم دونوں تھے۔''

''اوہ گاڈ!'' عمران نے دیدے پھاڑے۔ ''یعنی اس کھڑوس الٰہ آبادی ڈی ایس پی اور اس کے مچھندر یاروں کو میرے لئے پچاس لاکھ روپیا دے دیا گیا؟''

''مجھے زیادہ نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ کوئی مقامی پولیس والا تھا اور اس نے تم دونوں کو پکڑ کر کسی نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ ابھی گرفتاری وغیرہ نہیں ڈالی تھی تمہاری۔ اس نے جو مانگا، اسے دے دیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈبل بھی مانگتا تو دے دیا جاتا۔''

''اوہ گاڈ! یہ بالکل بیکار کا خرچہ کر دیا آپ لوگوں نے۔ ہم نے تو لاہور ہی پہنچنا تھا۔ اب نہ آتے تو دس پندرہ روز یا ایک مہینے بعد آجاتے۔'' عمران نے تاسف سے سر ہلایا اور کسی اداس بکرے کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

جان صاحب نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولے۔ ''اصل قیمت تو ضرورت کی ہوتی ہے عمران...... اور ریان صاحب کو تمہاری ضرورت ہے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ پچھلے مہینے کے شروع میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر انڈیا گئے تھے۔ ہم کوئی دو ہفتے تک امرتسر، جالندھر اور چندی گڑھ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔ کسی نے ریان صاحب تک یہ غلط اطلاع پہنچائی تھی کہ تمہیں اور اقبال کو وہاں دیکھا گیا ہے...... پورے دو ہفتے، اور

ریان ولیم وہ شخص ہیں جن کے لئے اپنے کام سے دو گھنٹے کا وقت نکالنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔“

”اچھا تو ان کا اسم مبارک ریان ولیم ہے۔ میں نے یہ پہلی بار سنا ہے۔“

”تمہیں بتایا تو ہے کہ تم انہیں پہلے سے نہیں جانتے لیکن ان کے ساتھ جو دوسرا بندہ ہے، اسے تم ضرور جانتے ہو۔“

”کون ہے؟“

”وہی پروفیسر رچی جس نے تمہارا ٹیسٹ لیا تھا۔ اپنے بہت بڑے کتے سے تمہاری ملاقات کرائی تھی۔ تمہارا لمبا چوڑا انٹرویو بھی لیا تھا اور تمہاری ویڈیو بھی بنائی تھی۔“

”وہ کیا چاہتا ہے؟“

جان صاحب بولے۔ ”رچی صاحب تو کچھ نہیں چاہتے لیکن ان کے کہنے پر یہ ریان ولیم بہت کچھ چاہنے لگا ہے۔ اسے ”لک“ کی تلاش ہے اور یہ ”لک“ اسے تم میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑا داؤ لگانا چاہتا ہے اور اس داؤ کے لئے اسے تمہاری ”خوش قسمتی“ کی ضرورت ہے۔“

”آپ پہیلیوں میں بات کر رہے ہیں۔“ عمران نے کہا۔

جان صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تابش کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتا ہوں۔“

”یہ میرا ہمزاد بن چکا ہے جناب...... بلکہ ہمزاد سے بھی آگے کی چیز ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں...... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی...... غالباً یہ مولانا رومی کا مقولہ ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”یہ مولانا رومی کا نہیں ہے اور نہ ہی فارسی کا ہے اور یہ مقولہ بھی نہیں ہے۔ یہ مصرع ہے۔“

جان صاحب نے میری اور عمران کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ریان یورپ اور امریکا میں کیسینوز کی ایک بہت بڑی ”چین“ کا مالک ہے۔ ارب پتی شخص ہے لیکن دیکھنے میں وہ تمہیں ایسا نہیں لگے گا۔ جوا خانوں کے کچھ مالکان نے پچھلے دنوں ایک بڑا گیم کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس گیم کے دو شوز اس سے پہلے ہو چکے ہیں اور خاص حلقوں میں بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ ان شوز کو اسپیشل ٹرانسمیشن کے ذریعے یورپ اور امریکا کے کئی علاقوں میں دکھایا بھی گیا تھا۔ مسٹر ریان ولیم ان شوز میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف

انتظامیہ میں شامل ہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھتیجے گیری نے پچھلے دنوں دوسرے شو میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ گیم کے پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کرنے کے بعد چوتھے مرحلے میں آ چکا ہے۔ یہ فائنل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں ہر سوال کے ساتھ انعامی رقم دگنی ہو جاتی ہے اور اگر کھیلنے والا صرف تین سوالوں کے درست جواب دے دیتا ہے تو وہ ایک بہت بڑا انعام جیتنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“

”کچھ اندازہ تو بتائیں؟“ عمران نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

جان صاحب مسکرائے اور تھوڑا سا توقف کر کے بولے۔ ”اس وقت یہ گیم دو ملین ڈالرز پر رکا ہوا ہے۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ قریباً پندرہ کروڑ روپیا بنتا ہے۔ بنتا ہے یا نہیں؟“

”بالکل بنتا ہے۔“ عمران نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

”اب پہلے سوال کا درست جواب دینے سے یہ رقم دگنی یعنی قریباً تیس کروڑ روپے ہو جائے گی...... اور صرف دو مزید درست جواب اسے کہاں پہنچائیں گے، اس کا اندازہ تم آسانی سے لگا سکتے ہو۔“

عمران کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں۔ ”...... یعنی ایک سو بیس کروڑ؟“

”بالکل...... اور یہ انعام اس سے پہلے بھی ایک بار دیا جا چکا ہے۔ پچھلے سال ہونے والے پہلے گرینڈ شو میں یہ آخری انعام فلپائن کے ایک انیس سالہ لڑکے نے حاصل کیا تھا۔ دوسرے شو میں دو امیدوار تیس کروڑ کے انعام تک پہنچے لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس سے آگے بڑھنے کے لئے بہت سی ہمت بھی درکار ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عمران نے پوچھا۔

”اگر بندہ تیس کروڑ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو پھر اسے ساٹھ کروڑ والے سوال کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن اگر یہ جواب غلط ہوا تو پھر اسے تیس کروڑ سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف Basic انعام ہی ملتا ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپیا...... قریباً 65000 امریکی ڈالرز۔ اس گیم کا ”فارمیٹ“ وہی ہے جو اکثر ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں انوکھی بات بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آخری انعام نقد رقم کی صورت میں نہیں ہے۔“

”تو کس صورت میں ہے؟“

جان صاحب ذرا سا مسکرائے اور بولے۔ ”ایک خوبصورت ائیر ہوسٹس کی شکل

میں......آپ کی خدمت کے لئے چوکس۔ ہر بات پر 'یس سر' کہنے والی......''

''شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ایک ارب بیس کروڑ روپے میں ایک ائیر ہوسٹس۔''

وہ پھر مسکرائے۔ ''تم نے ابھی پوری بات نہیں سنی۔ وہ ائیر ہوسٹس جس لگژری جہاز میں سروس فراہم کرتی ہے وہ جہاز بھی آپ کو ملے گا۔ ایک شاندار فیلکن 900 سی...... بڑا سال کا پرائیویٹ طیارہ ہے۔ قریباً 12 مسافروں کی گنجائش والا۔ اس کو مزید لگژری بنانے کے لئے اس کے انٹیریئر میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ایک بیڈ روم جس میں زبردست آسائشیں موجود ہیں۔ جدید سہولتوں سے آراستہ ایک نشست گاہ۔ کئی طرح کی اِن ڈور تفریحات۔''

''زبردست......کون دے گا یہ لگژری جہاز؟'' عمران کو ابھی تک پورا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہی لوگ جو میگا شو کرا رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ دنیا کے ''معزز'' اور مال دار ترین جواری ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اپنے پرائیویٹ طیارے اور تفریحی بجرے ہیں۔ ان لوگوں نے گیم کے گرینڈ پرائز کے لئے ایسے تین جہاز تیار کروائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو سب سے پہلے شو میں ہینڈ اوور کیا جا چکا ہے۔ فلپائنی لڑکا اس کا مالک ہے۔ دو جہاز ابھی باقی ہیں۔ ان پر بہت سوں کی رال ٹپک رہی ہے۔ اپنے ریان ولیم صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کا بھتیجا گیری نہ صرف گیم میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کر چکا ہے۔ وہ پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً پندرہ کروڑ جیت چکا ہے۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس سلسلے میں، میں ان لوگوں کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''مسٹر رچی اور مسٹر ریان کا خیال ہے کہ تم کر سکتے ہو۔''

''یعنی آپ مجھے ارسطو اور بقراط کا ہم پلہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا بھر کا جنرل نالج گھول کر پیا ہوا ہے۔ لہٰذا ٹھاک ٹھک تین جواب دے کر رئیس زادے گیری کو فائنل انعام تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ بھول ہے۔ میرے جیسے بندے تو کسی عام سے کوئز شو میں جائیں تو انہیں انعام ملنے کے بجائے جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہماری خاندانی ''صلاحیت'' ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا جی طارق عزیز کے نیلام گھر میں گئے تھے، شرمندگی کے باعث آج تک گھر واپس نہیں آئے۔''

جان محمد صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو تمہارا جنرل نالج یا ذہانت درکار نہیں......تمہاری خوش قسمتی درکار ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' عمران نے پوچھا۔

جان محمد صاحب نے مہنگے برانڈ کے سگریٹ کا طویل کش لیا اور بولے۔ ''شاید تم نے اس طرح کا کوئی ٹی وی شو دیکھا نہیں۔ ان میں سے اکثر شو ایسے ہوتے ہیں جن میں سوالوں جوابوں کا سلسلہ بس رسمی طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان ''سوالوں جوابوں'' کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ جنرل نالج کا پروگرام نظر آئے اور اسے جوئے بازی سے منتھی نہ کیا جا سکے۔ ہر سوال کے جواب کے چار آپشن دیئے جاتے ہیں اور دراصل یہی قسمت آزمائی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جان صاحب! پچھلے دنوں الٰہ آباد کے ہوٹل میں، میں نے ایک ٹی وی چینل پر ایسا شو دیکھا تھا۔ بے معنی سے سوال تھے۔ مثلاً دمے کا مریض کیا کھائے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ آپشن نمبر 1 دہی پراٹھا...... آپشن نمبر 2 اچار پراٹھا......آپشن نمبر 3 انڈا پراٹھا......یا پھر ٹھنڈا پراٹھا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔ ''ایسے پروگراموں میں اکثر سوال تو صرف خانہ پُری کے لئے ہوتے ہیں۔ اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہوتی ہے۔ اسے عام زبان میں تکا لگانا کہتے ہیں۔ جس میگا شو کی بات کر رہا ہوں، اس میں بھی اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہے۔ مثلاً پچھلے میگا شو میں جس سوال پر ایک ڈچ خاتون نے تقریباً تیس کروڑ جیتے، وہ یوں تھا۔ مختلف پیش گوئیوں کے مطابق قیامت 2012ء، میں آ سکتی ہے۔ آپ کے خیال میں قیامت کب آئے گی؟ 2012ء میں؟ 2013ء میں؟ 2090ء میں؟ 2113 میں؟ یہ سراسر قسمت آزمائی کا سوال تھا مگر یہ بڑی اعصاب شکن قسمت آزمائی ہے۔ اندازہ اس بات سے لگا لو کہ اس کھیل کے ایک 'پاٹی سپینٹ' اور تین تماشائیوں کو باقاعدہ ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔''

''تو آپ کا کہنا ہے کہ مسٹر رچی اور مسٹر ریان یہ قسمت آزمائی مجھ سے کرانا چاہتے ہیں؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ اسی لئے پچھلے تین ماہ سے تمہاری تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ مسٹر ریان کا یقین ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر بہت ''لکی'' ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کرامات ہوتی ہیں۔ وہ جو پانسا پھینکتے ہیں، وہ سیدھا پڑتا ہے......یا امکان ہوتا ہے کہ وہ سیدھا پڑے گا۔ مسٹر رچی یہاں تم سے پاکستان میں مل چکے ہیں۔ انہوں نے سرکس میں

تمہارے اسپیشل شوز کے بارے میں بھی سب کچھ سن رکھا تھا۔ پسٹل اپنے اوپر تان کر تم جو دو چھ اور تین چھ والا دیوانہ پن کرتے ہو، اس کے بارے میں بھی انہیں ساری معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے مسٹر ریان ولیم کو تمہارے بارے میں بتایا اور وہ تمہاری تلاش میں لگ گئے۔ دوسرے اور تیسرے شو کے درمیان تقریباً چھ سات مہینے کا وقفہ موجود تھا اور مسٹر ریان کو یقین تھا کہ وہ اس عرصے میں تمہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی بلکہ بالکل آخری وقت میں پوری ہوئی۔''

''عجیب کہانی سنا رہے ہیں آپ۔'' عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ ''یا تو یہ ریان نامی بندہ سنکی ہے یا بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ ایک انجان شخص کی ''لک'' پر اتنا زیادہ یقین کر رہا ہے۔ اسے کیا پتا کہ میں خوش قسمتی اور بدقسمتی کا کتنا بڑا امکسچر ہوں......''

میں نے اس کی بات اُچکتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی جان صاحب! کیا عمران اس گیری نامی نوجوان کی جگہ یہ گیم کھیلے گا؟''

''نہیں...... گیم تو گیری ہی کھیلے گا۔ عمران اس کی ہیلپ کر سکے گا۔ ایسے گیمز میں تین لائف لائنز ہوتی ہیں۔ اس میں بھی تین لائف لائنز ہیں۔ لیکن یہ تینوں لائف لائنز ایک ہی طرح کی ہیں۔ وہ یہ کہ کھیلنے والا تین بار اپنے کسی دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے اس سے مدد لے سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکا لگا سکتا ہے۔ اب ریان ولیم صاحب یہ چاہتے ہیں کہ یہ تکا لگانے والی قسمت آزمائی عمران کرے۔''

''اور اس کے لئے انہوں نے میری تلاش پر لاکھوں لٹا دیئے۔ پچاس لاکھ انڈین روپیا تو اس جنونی الٰہی آبادی ڈی ایس پی کو ہی دے دیا گیا۔'' عمران نے کہا۔

''یہ ریان صاحب کے لئے ہرگز مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ پولیس والے تمہارے لئے دگنا یا سہ گنا بھی مانگتے تو ریان صاحب دے دیتے۔ انہیں جب کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس یقین سے پیچھے نہیں ہٹتے...... اور پروفیسر رچی انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تمہاری شان دار ''لک'' اس کھیل میں کام دکھا سکتی ہے۔''

''اور اگر اس نے کام نہ دکھایا تو پھر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ایسے کاموں میں یہ ''اگر'' ہی تو اصل تھرل ہوتا ہے۔ تم سرکس میں کیا کرتے رہے ہو عمران؟'' جان صاحب نے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم ان اسپیشل شوز میں حصہ لیتے رہے ہو جن میں کسی بھی وقت جان کے

لالے پڑ سکتے تھے...... میں نے ایک حد تک تمہیں روکا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ تم یہ سب کچھ میرے سرکس میں نہیں کرو گے تو کسی اور جگہ کر لو گے...... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تماشے کرو۔ ان سب تماشوں میں ''اگر'' کے لفظ کی خاص اہمیت ہوتی ہے...... دیکھنے والا سوچتا ہے اگر یہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اگر وہ ہو گیا تو کیا ہو گا...... یہاں اس گیم میں بھی یہ ''اگر'' ہی سب سے بڑا تھرل ہے۔''

ابھی جان محمد صاحب کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جدید دروازے نے بے آواز سلائڈ کیا اور مسلح محافظ کے ہمراہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ گوشت کے پہاڑ جیسا تھا۔ تاہم بہت فربہ لوگوں کی طرح اس میں سستی نظر نہیں آتی تھی...... وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس بڑی سہولت سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔ اس کی صورت دیکھ کر تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ برٹش ہے۔ وہ بالکل عام سے خدوخال کا شخص تھا۔ اگر اسے اس کے قیمتی لباس سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اسے کسی ہوٹل کا ہیڈ خانساماں یا پھر کوئی ٹرک ڈرائیور سمجھا جا سکتا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں سے اس نے بغور عمران کو دیکھا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ عمران کے بعد مجھ سے مصافحہ کیا گیا۔

''میں ریان ولیم ہوں''۔ اس نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرا دوست اور میرا گارڈ یوراج سنگھ ہے۔''

یوراج سنگھ نے بھی ہم سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک مضبوط جسم اور عقابی آنکھوں والا پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ ہم سب لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مصروف کاروباری لوگوں کی طرح ریان ولیم نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور عمران سے مخاطب ہو کر برٹش اسٹائل کی انگریزی میں بولا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ایمران۔ میرے دماغ میں اس بارے میں بہت تجسس ہے کہ تم اچانک پاکستان سے غائب کیوں ہوئے اور اتنا عرصہ کہاں رہے۔ بہرحال، یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں اور میں اپنے تجسس کی خاطر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میرے لئے خوشی کی بات بس یہ ہے کہ تم ہمیں مل گئے ہو اور ہمارے سامنے بیٹھے ہو۔''

''میرے لئے بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔'' عمران نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

''مجھے امید ہے کہ مسٹر جان محمد نے تمہیں کافی کچھ بتا دیا ہو گا اور تم نے سمجھ بھی لیا ہو

گا...... مسٹر ایمران! دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تدبیر سے زیادہ ''لک'' پر یقین رکھتے ہیں اور آج اس چالیس سال کی عمر میں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس یقین کی وجہ سے میں نے زندگی میں بہت سی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ میرا اس بات پر ایمان ہے کہ قدرت نے اس دنیا میں کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت بنایا ہوتا ہے۔ اپنے اس خداداد وصف کی بدولت وہ بدترین خطرات سے بچ نکلتے ہیں۔ مشکل ترین حالات میں رستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور کامیابیوں کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں۔ اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو یہاں اس شہر میں جو میگا شو ہونے جا رہا ہے، اس میں بھی سارا کھیل خوش بختی کا ہے۔ جو سوال پوچھے جانے والے ہیں، وہ اتنے مشکل ہوں گے کہ فہم و فراست سے ان کا جواب دینا شاید ناممکن ہوگا۔ وہ صرف چوائس ہوگی اور دیکھنا ہوگا کہ بہترین چوائس کون کرتا ہے۔''

''کیا اس گیم میں کوئی اور بھی حصہ لے رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

مسٹر ریان نے اپنا بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ ''پچھلا شو قریباً سات ماہ پہلے ہوا تھا۔ اس میں میرا بھتیجا گیری کھیل رہا تھا جب شو کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ اب اٹھائیس تاریخ کو جو شو ہونے جا رہا ہے، اس میں سلسلہ وہیں سے جڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ یعنی گیم کا چوتھا مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں اگر تین سوالوں کے جواب درست ہو گئے تو ہم فائنل انعام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد جس کھلاڑی کی باری آئے گی، وہ ایک امریکن لڑکی ہے۔ میرے کاروباری حریف مسٹر بفیلو کی اکلوتی بیٹی ماریانی۔ بہت ہوشیار، بہت ذہین اور قسمت کی دھنی بھی۔ اس نے ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں کئی ڈپلومے لے رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں میرا بھتیجا کچھ زیادہ لکی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی پڑھا لکھا ہے اور اچھی ملازمت کرتا ہے لیکن لکی ہونا بالکل اور بات ہے۔''

''اور یقیناً آپ چاہتے ہوں گے کہ آپ کے کاروباری حریف کی بیٹی آپ کے بھتیجے سے آگے نہ نکل جائے۔''

''بالکل، میں اس حقیقت کو چھپا نہیں رہا۔ ایک طرح سے یہ گیم میرے لئے دُہری اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک اہمیت تو سولہ ملین امریکی ڈالرز کی ہے اور دوسری اپنے کاروباری حریف کو نیچا دکھانے کی۔''

عمران نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مجھے بہت فکرمند کر دیا ہے جناب۔ اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا تو کیا ہوگا؟''

''تم اترو گے۔ ضرور اترو گے۔ مجھے یقین ہے۔'' ریان ولیم نے عجیب ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''لک کا ہونا ایک بہت سالڈ چیز ہے۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں۔''

جان محمد صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ریان! عمران اور تابش ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان آئے ہیں۔ تابش اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے بے چین ہوگا۔ کیا وہ ان سے ملنے کے لئے جا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''ان دونوں پر کوئی پابندی ہیں۔ خاص طور سے تابش پر تو بالکل بھی نہیں۔ آپ اسے جہاں چاہے لے جا سکتے ہیں۔ ہاں، آپ نے کہا تھا کہ ان کی دشمنی وغیرہ ہے۔ اگر کوئی سکیورٹی کا مسئلہ ہے تو پھر آپ ذرا احتیاط کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ اٹھائیس تاریخ تک کسی بھی طرح کی گڑبڑ سامنے آئے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

○......❖......○

لاہور سے ملنا...... لاہور کے گلی کوچوں سے ملنا اور پھر عاطف اور فرح سے ملنا میرے لئے جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ مجھے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بے بہا خوشی میرے حصے میں آ رہی ہے۔ میں ایک طویل مدت تک اپنے دیس کی فضاؤں اور خوشبو کے لئے تڑپا تھا۔ میں نے اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑا کر اپنے پر زخمی کر لئے تھے۔ خود کو لہولہان کر لیا تھا اور آخر اپنے دوست عمران کی مدد سے یہ پنجرہ توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جان صاحب اور عمران کے ساتھ ایک بند اسٹیشن وین میں سوار تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اسکول سے چھٹی کرنے والے بچے مختلف گاڑیوں میں یا پھر پیدل گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ سڑکوں پر زندگی رواں تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا، میں گاڑی سے اتر جاؤں۔ ان جانے پہچانے کوچوں میں پا پیادہ چلوں۔ شاہراہ قائداعظم، میکلوڈ روڈ اور نسبت روڈ کی رواں دواں گہما گہمی میں گم ہو جاؤں۔ یوں اس زندگی کا حصہ بنوں کہ جان صاحب اور عمران مجھے ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ہم لوئر مال روڈ سے گزرے۔ کچھ بھولے بسرے منظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ مجھے لگا میرا بدترین دشمن، میری ماں کا قاتل، میری ہنستی بستی زندگی تاراج کرنے والا سیٹھ سراج یہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ اور وہ راشی تھانے دار اشرف اور ان کا سرپرست ایم این اے گورایا۔ میرے بدن میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ بائیں طرف مڑنے والی یہی وہ سڑک تھی جو دو تین کلومیٹر آگے ایک چلڈرن پارک تک پہنچتی تھی۔ ساڑھے تین چار برس پہلے اسی چلڈرن پارک میں وہ واقعہ ہوا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدلا اور مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں نے ایک شریف کمزور نوجوان کو بیدردی سے مارا تھا۔ اسے نیم برہنہ کیا تھا، زمین پر

گھسیٹا تھا اور وہ شرمیلا سا چپ چاپ سا نوجوان اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ گھر واپس نہیں گیا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف چلا گیا تھا...... اپنا سر ریل کے پہیوں کے نیچے رکھنے کے لئے۔ پھر وہ ریل کے پہیوں سے تو بچ گیا تھا مگر گردشِ دوراں سے نہیں بچ پایا تھا۔ ہواؤں میں تنکے کی طرح اڑتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کی ماں بچھڑی، بہن اور بھائی بچھڑے اور وہ عزیز ہستی بچھڑی جو اس کی رگِ جاں میں بستی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس آنکھوں میں آنسو لے کر ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اپنی بربادی کا نوحہ کرتا رہا...... لیکن آج...... آج وہ نوجوان کمزور اور بے بس نہیں تھا۔ وہ بدل چکا تھا۔ حالات کی بے رحم بھٹی نے اسے پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ مرنا اور مارنا سیکھ گیا تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس عمران جیسا بے مثل ساتھی اور غم خوار تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بڑی سے بڑی مصیبت کا رخ بدل سکتا تھا۔

میرا جی مچل اٹھا۔ میرا دل چاہا آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میرا سامنا سیٹھ سراج سے ہو جائے۔ اس کی تنی ہوئی گردن، اس کی مغرور پیشانی، اس کی کینے سے بھری ہوئی آنکھیں، سب کچھ میرے سامنے آئے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور کہوں۔ ''میں آ گیا ہوں سراج! میرا نام تابش ہے اور میں ایک بیٹا ہوں۔''

عمران نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپکا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ ''حوصلہ رکھو جگر...... وہ سب کچھ ہو گا جو تم سوچ رہے ہو۔''

بھانڈیل اسٹیٹ میں عمران نے مجھے بتایا تھا کہ میری والدہ کے قتل کے بعد اس نے عاطف اور فرح کو راولپنڈی میں رکھا تھا لیکن اب وہ ہمیں ان سے ملانے کے لئے لاہور ہی کے کسی علاقے میں لے جا رہا تھا۔ وہ ہمیں شہر کے جنوبی علاقے میں ایک جدید رہائشی بستی میں لے آیا۔ باؤنڈری وال اور سکیورٹی انتظامات والی اس وسیع بستی میں بیشتر گھر دو اور چار کنال کے تھے۔ ہم دو کنال کے ایک خوب صورت گھر میں داخل ہوئے۔ یہاں باقاعدہ گارڈ موجود تھا۔ رہائشی حصے کے چاروں طرف خوب صورت ہریالی تھی۔ اس ہریالی کی تراش خراش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں فرح موجود ہے۔ وہ ایسے ہی پودوں کی دیکھ بھال کا خاص شوق رکھتی تھی۔

پروگرام کے مطابق عمران نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے ابھی تک فرح اور عاطف کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر میں اچانک ان کے سامنے آتا تو انہیں شدید ذہنی شاک

لگتا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جان صاحب باہر لان میں دھوپ سینکتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ مجھے اپنی پیاری بہن فرح اور بھائی عاطف کی صورتیں نظر آئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پھر فرح چلاتی ہوئی بھاگی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ عاطف نے بھی آگے بڑھ کر مجھے دیوانہ وار بانہوں میں جکڑ لیا۔

ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کھو کر پایا تھا اور درمیان میں بے یقینی کا ایک بہت طویل وقفہ تھا۔ یہ خوشی اور غم کی ایک ملی جلی یادگار کیفیت تھی۔ میں فرح اور عاطف کی پیشانیاں چومتا چلا گیا۔ ان کو اپنے ساتھ بھینچتا رہا۔

''بھائی! امی چلی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئیں۔'' فرح روتے ہوئے بولی۔

عاطف بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہم کتنی ہی دیر اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو نظروں میں بھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ عمران کی مسکراتی صورت دروازے میں نظر آئی۔ ''چار بج گئے ہیں چائے کا وقت ہو گیا ہے حاضرین۔'' اس نے کہا اور خود ہی چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

فرح جلدی سے اٹھی۔ ''بھائی! آپ خود کیوں لے آئے؟ عبدل سے کہا ہوتا۔''

عمران نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آج اتنا خوش ہوں کہ ٹی ٹرالی تو کیا ریت والی ٹرلی بھی آسانی سے دھکیل سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں...... بلکہ اگر تم کہو تو لگا کر دکھا بھی دیتا ہوں۔''

پھر اس نے ہمارے کہنے سے پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر الٹی قلابازی لگائی۔ یہ دُہری قلابازی تھی لیکن وہ پاؤں کے بل گرنے کے بجائے کمر کے بل ایک صوفے کے ہتھے پر گرا اور کمر پکڑ کر ''اُف ہائے'' کرنے لگا۔

فرح کی اشک بار آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے۔ عاطف کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ عمران نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے ورنہ دُہری قلابازی اس کے لئے چنداں مشکل نہیں تھی۔ وہ مسخرہ پن کر رہا تھا۔

عمران نے عاطف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عاطف نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے پریکٹس ختم ہو گئی ہے۔ ویسے بھی تمہارے بھائی کے ساتھ رہ رہ کر میری صلاحیتوں کا کباڑا ہو گیا ہے۔''

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی مگر کمر دُہری ہی رہی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے

سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا ہے مگر سیدھا نہیں ہو پا رہا۔ وہ کراہا۔ ''اُف یہ کیا ہو گیا ہے اب میں اپنی ریما جی کو کیا کمر دکھاؤں گا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کبڑا عاشق فلم بنائیں اور اس میں تمہیں ہیرو لے لیں۔''

عاطف آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''تابش بھائی جان! اگر عمران بھائی نہ ہوتے تو شاید ہم بھی اس وقت آپ کو یہاں صحیح سلامت نظر نہ آتے۔ انہوں نے ہمارے لئے وہ سب کچھ کیا جو ہم سوچ سکتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ آپ کی گمشدگی اور امی جی کی وفات کے بعد سیٹھ سراج کے بندے ہمیں بوگیر کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہم کبھی ایک جگہ چھپتے کبھی دوسری جگہ۔ عمران بھائی ہماری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئے۔'' عاطف کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے سب پتا ہے عاطف۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک بات کا تجھے پتا نہیں۔'' عمران پھر چہکا۔ ''میں نے اپنی اور تیری اس بہن کے لئے بڑا اچھا بر بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ اگر مجھے تیری تلاش میں انڈیا نہ جانا پڑتا تو اب تک اس کے ہاتھ بھی پیلے ہو چکے ہوتے۔ بس بھانڈیل اسٹیٹ کے اس چکر نے سب کچھ لیٹ کیا ہے۔''

فرح کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ عاطف نے پوچھا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے کیا؟''

''یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی چھوٹی بہن ہے۔ تمہارے بھائی جان کھیلتے کھیلتے اُدھر نکل گئے اور راستہ بھول گئے۔ اسٹیٹ کے ایک خدا ترس بزرگ نے انہیں گلیوں میں روتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مسجدوں میں اعلان کرایا کہ ایک بچہ ملا ہے ''جن کا بچہ'' ہے آ کر لے جائیں۔ تو وہاں کے لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ ''جن'' کا بچہ ہے۔ انہوں نے خدا ترس بزرگ کو تمہارے بھائی سمیت ایک تہ خانے میں بند کر دیا۔ اس کے آگے لمبی کہانی ہے۔''

عمران نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔ فضا کی سوگوار سنجیدگی کسی حد تک کم ہو گئی۔ فرح اور عاطف میرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے مگر اس کے لئے وقت درکار تھا۔ میں ان کے چیدہ چیدہ سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ ماں کی یاد ہم تینوں کی آنکھوں کو بار بار نم کرتی رہی۔ وہ منظر میں زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ سراج کے

غنڈے شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے ''فروزن'' کندھوں کو بے رحم طریقے سے جھنجوڑا تھا۔ وہ انہیں بار بار جھنجوڑتے رہے تھے، یہاں تک کہ ماں جی نے برداشت کی آخری حدوں کو چھولیا تھا۔ پھر اس ڈر سے کہ میں ان کی بے پناہ اذیت کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہار جاؤں، عاطف اور فرح کے بارے میں نہ بتا دوں، انہوں نے خود کو دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ان کا پختہ فرش پر گرنا، ان کے سفید بالوں میں کھلا ہوا خون کا سرخ پھول۔ وہ سب کچھ میری تلخ ترین یادوں کا حصہ تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی صعوبتوں میں اور زرگاں کے قاتل اندھیروں میں بھی میں ان مناظر کو بھول نہیں پایا تھا۔

ہم سب ماں جی کی قبر پر پہنچے۔ اس سفر کے لئے وہی تاریک شیشوں والی اسٹیشن وین استعمال کی گئی۔ میں قریباً ایک گھنٹا اپنی ماں کی قبر پر رہا اور اس کی مٹی اشکوں سے بھگوتا رہا۔ لوگوں کی نگاہ میں اور قانون کے کاغذوں میں میری بیمار ماں حادثاتی طور پر کھڑکی میں سے گرنے سے مری تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیسے مری تھی۔ جلتی آنکھوں اور سلگتے سینے کے ساتھ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں سیٹھ سراج کی ''دید'' کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ رات، عمران اور میں نے اس گھر میں عاطف اور فرح کے ساتھ گزاری۔ جان محمد صاحب ہمیں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ اس گھر میں ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ بھی موجود تھے، تاہم فرح نے ہمارے لئے خود کھانا پکایا۔ اس نے میری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور شاشلک اپنے ہاتھوں سے تیار کئے۔ ہم ایک مزے دار کھانا کھا چکے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ فرح مسلسل میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے میرا کندھا چوم لیتی تھی اور میرے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ میرے ہاتھ پہلے سے بہت سخت ہو چکے تھے۔ مارشل آرٹ کی نہایت کرخت مشقوں نے ان پر چنڈیاں سی ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ملائم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر چلاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی جان! آپ کے ہاتھ ایسے کیوں ہیں؟ اور آپ کے پاؤں بھی ایک دم کھردرے نظر آتے ہیں؟''

''برف باری کی وجہ سے۔'' عمران نے جھٹ جواب دیا۔ ''سخت ٹھنڈ میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

''لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میدانی علاقہ ہے۔'' فرح نے فوراً نکتہ اٹھایا۔

''مگر وہاں کا موسم عجیب سا ہے۔ گرمیوں میں برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں ایک دم لو چلنے لگتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اس لُو کی وجہ سے عمران کو سرسام ہو گیا تھا۔ اب یہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔''

فرح نے ہماری نوک جھوک کو نظر انداز کیا اور میرے ہاتھوں کا معائنہ جاری رکھا، وہ بولی۔ ''بہت سخت ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھ...... بلکہ آپ پورے کے پورے بہت بدلے ہوئے لگتے ہیں۔''

عمران مسکرایا۔ ''تم اور عاطف ٹھیک اندازے لگا رہے ہو۔ تابش میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاید تمہیں بھروسا نہ ہو۔ اب تمہارا بھائی بھانڈیل اسٹیٹ کا ہر دلعزیز ہیرو ہے۔ ایک موقع پر اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے کڑک شخص کو دو بدو مقابلے کا چیلنج دیا اور نہ صرف چیلنج دیا بلکہ اسے ہرایا بھی۔ اگر اس نے یہ کارنامہ انڈیا یا پاکستان کے کسی بڑے شہر میں میڈیا کے سامنے انجام دیا ہوتا تو آج اس کے نام کا ڈنکا پورے ایشیا میں بج رہا ہوتا۔''

پھر عمران اس واقعے کی دیگر تفصیلات سے عاطف اور فرح کو آگاہ کرنے لگا۔ اس نے باروندا جیکی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ کس طرح اس جاں بلب شخص نے مہینوں تک مجھے تربیت دی اور ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

یہ ساری رُوداد فرح اور عاطف کے لئے بے حد تعجب خیز تھی۔ عمران سب کچھ تفصیل سے شاید اس لئے بھی بتا رہا تھا کہ وہ فرح اور عاطف میں حوصلہ جگانا چاہتا تھا۔ ان کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک انہیں بڑے بھائی کی چار سالہ جدائی سہنا پڑی ہے لیکن اب اس بھائی کی صورت میں انہیں ایک مضبوط اور ناقابلِ شکست سہارا میسر ہے۔

عاطف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! باروندا جیکی کا نام تو کہیں میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ وہ شروع میں ایکٹنگ وغیرہ کرتا تھا؟''

''شروع میں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شروع سے ہی فائٹر تھا۔ ایکٹنگ وغیرہ میں تو اسے لوگوں نے بعد میں گھسیٹا اور یقیناً اس نے دونوں میدانوں میں بڑا نام کمانا تھا مگر وقت اور زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔''

''آپ نے ہمیں ایک دردناک کہانی سنائی ہے۔'' عاطف نے جیکی اور شکنتلا کی پوری رُوداد سننے کے بعد کہا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک اور دردناک کہانی بھی ہے۔ لیکن وہ پھر کبھی سہی۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ یقیناً عمران کا اشارہ سلطانہ والے اندوہناک واقعے کی طرف تھا...... سلطانہ کا خیال آتے ہی بالو کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں بھی میری نگاہوں میں گھومنے لگیں۔

فرح کے معصوم چہرے پر اندیشے سے تھے۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بھائی؛ آپ کہہ رہے ہیں کہ جارج گورا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھی اور رشتے دار بھی ایسے ہی ہوں گے۔ سنا ہے کہ وہ لوگ ایسی دشمنیوں کو بھولتے نہیں۔ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟''

''کس بات کا؟''

''وہ جارج گورا، بھائی کے پیچھے یہاں آ جائے؟''

عمران نے جارج گورا والی رُوداد میں فرح اور عاطف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سامبر مقابلے میں جارج گورا کی انتڑیاں اکھاڑے میں بکھر گئی تھیں اور وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ عمران نے فقط اس کے زخمی ہونے کا ذکر کیا تھا۔ فرح بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جارج گورا ہی نہیں اور کئی افراد بھی میرے ہاتھوں راہی عدم ہو چکے ہیں۔ اور تو اور قاسمیہ کی خوں ریز لڑائی کا نقشہ ہی ہم کھینچ دیتے تو فرح اور عاطف ہکا بکا رہ جاتے۔ اب وہ ساری باتیں ایک خونچکاں افسانے کی طرح لگتی تھیں۔

عمران نے فرح کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں بھئی۔ تابش اور جارج کے درمیان کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک مقابلہ تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ شرطیں لکھی گئی تھیں اور مقابلے میں کسی کی بھی ہار جیت ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ باب اب بند ہو چکا ہے۔ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی چودہ اگست ہو چکا ہے۔''

''چودہ اگست؟'' فرح نے پوچھا۔

''بھئی، یوم آزادی۔ گورے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ لئے ہیں وہاں سے۔''

فرح اور عاطف ہم سے سوال کرتے رہے...... ہم جواب دیتے رہے۔ وہ تعجب میں ڈوب کر سنتے رہے۔ یہ سب کچھ ان کے لئے کسی قدیم کہانی جیسا تھا۔ ہیٹر روشن تھا۔ ہم سبز چائے پی رہے تھے اور کھڑکیوں سے باہر لاہور کی وسعت کو گہری دھند ڈھانپتی جا رہی تھی۔ ہم سب کچھ فرح اور عاطف کو نہیں بتا سکتے تھے۔ میں نے انہیں اپنی چار سالہ طویل کہانی کے مختلف ٹکڑوں سے آگاہ کیا۔ میرا ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گرنا، اپنے ہوش وحواس کھونا اور اسی حالت میں بھانڈیل اسٹیٹ پہنچ جانا۔ میں نے سب کچھ فرح اور عاطف کو بتایا۔ وہ یہ سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے کہ یہاں سے اوجھل ہونے کے بعد میں قریباً ڈھائی

سال تک اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں رہا۔ یعنی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کون ہوں۔ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ کے حالات بھی ان دونوں کو بتائے۔ وہاں کی کہنہ رسمیں، وہاں کے تنازعے، انگریزوں اور مقامی لوگوں کی کشمکش۔ وہاں کے فرسودہ عقیدے اور مار دھاڑ۔ میں نے بہت کچھ فرح اور عاطف کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہے۔

رات گئے گفتگو کا رخ ایک بار پھر ماں جی اور ثروت کی طرف چلا گیا۔ شروع میں پولیس نے ماں جی کی موت کو حادثہ قرار دیا تھا مگر بعد ازاں عمران کی کوشش سے مقامی تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی تھی۔ اس میں سیٹھ سراج، اس کے کارندے شیرے اور اکبر کے نام شامل تھے۔ تفتیش شروع ہوئی تھی تو سیٹھ سراج کے کئی اور جرائم بھی سامنے آئے جن میں نوادرات کی ہیرا پھیری، ڈکیتی اور اغوا کے الزامات تھے۔ اس پر تین چار اور پرچے کٹ گئے۔ پرچوں کی بھرمار اور عمران کے بڑھتے ہوئے خوف سے وہ ایک دم زیر زمین چلا گیا تھا۔ شیرا اور اس کے دو چار قریبی ساتھی بھی روپوش ہو گئے تھے۔ اس سارے معاملے کا ایک اہم کردار سراج کا لفنڈر بیٹا واجد تھا۔ یہ واجد عرف وا.جی ہی تھا جس نے اس المناک کہانی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اپنی غنڈا گردی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے سڑک سے اٹھا کر لے گیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ وا.جی کے بارے میں عمران نے بتایا تھا کہ سیٹھ سراج نے روپوش ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو بیرونِ ملک فرار کرا دیا تھا۔ وہ یورپ ہی کے کسی ملک میں تھا۔

میں نے فرح اور عاطف سے پوچھا۔ ''تم دونوں کے پاس ثروت کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟''

ثروت کے نام پر دونوں کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ فرح نے کہا۔ ''اس بارے میں بھی آپ کو عمران بھائی ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں بتاتا۔ بس یہی کہتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے تک وہ جرمنی میں تھی۔ یوسف نامی ایک لڑکے سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ شادی ہو چکی ہے یا نہیں، اس بارے میں یہ کچھ نہیں بتاتا۔''

''مجھے معلوم ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ اب ہم آ گئے ہیں۔ جرمنی بھی ہم سے کون سا دور ہے۔ دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کیا حالات ہیں۔'' عمران بولا۔

پتا نہیں کیوں وہ جب بھی ثروت کے بارے میں بات کرتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ

چھپا رہا ہے۔ ہماری گفتگو کو اچانک بریک لگ گئے۔ عمران کے موبائل پر کال آ گئی تھی۔ یہ جان محمد صاحب کی کال تھی۔ جان محمد صاحب کی مدبر اور ہمدرد شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ عمران کی رُوداد سننے کے بعد میں نے ایک بڑی سرکس کمپنی کے اس کرتا دھرتا کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا، وہ اس پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے فون پر عمران کو بتایا کہ مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا گیری بات کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے آٹھ دس روز بعد ایک زبردست ایونٹ میں حصہ لینا تھا۔ عمران اس سے باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں، فرح اور عاطف پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ فرح کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میرے ملنے کی بے انتہا خوشی بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک فکر بھی گھیرتی جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں ماں جی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لئے خطرے مول لوں گا۔

وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہے تو قانونی طریقے سے کروں۔ عاطف ایک بڑے وکیل کا پتا بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ایک دوست کا والد ہے اور معقول فیس پر یہ کیس بڑے اچھے طریقے سے لڑ سکتا ہے۔

ان دونوں کی سنجیدہ گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ گزرے ہوئے ساڑھے تین چار برسوں میں وہ دونوں کافی میچور ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی طبیعت کا لاابالی پن اور شوخی اب ان کے اندر کہیں دب چکی تھیں ان کی اس تبدیلی نے نہ جانے کیوں مجھے آزردہ کیا۔ میں ان دونوں کی باتیں سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میرے اندر کچھ اور طرح کی آگ جل رہی تھی۔

○……❖……○

سیٹھ سراج اور شیرا ابھی تک منظر سے اوجھل تھے۔ عمران نے اپنے ذرائع سے پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ آٹھ دس ماہ پہلے سیٹھ سراج کراچی میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک سیاسی شخصیت کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی تھی۔ ایک خوبصورت تھائی خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ قیافہ تھا کہ وہ تھائی لینڈ سے آیا تھا اور وہیں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پس پردہ رہ کر کراچی میں ہی اپنی جائز اور ناجائز سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں۔ میرے اور عمران کے درمیان طے تھا کہ ہم جلد سے جلد سیٹھ سراج اور شیرے کا کھوج لگائیں گے لیکن اس سے پہلے عمران کو وہ کام بھی سرانجام دینا تھا جس کے لئے مجھے اور اسے آناً فاناً الٰہ آباد سے اٹھا کر یہاں لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ ہم وہیں پہنچے تھے جہاں ہمیں پہنچنا تھا لیکن کسی اور ڈھنگ سے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اقبال، میڈم صفورا اور بالو وغیرہ ابھی تک انڈیا میں ہی تھے۔ مسٹر ریان ولیم نے عمران سے

وعدہ کیا تھا کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور وہ جہاں بھی ہوئے، انہیں جلد از جلد پاکستان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ریان ولیم نے اتر پردیش میں بہت سے مقامی لوگوں کو متحرک کر دیا تھا اور امید تھی کہ دو چار دن کے اندر اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر مل جائے گی۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا، عمران بھی اس حوالے سے لاتعلق نہیں تھا، وہ اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا تھا۔

اٹھائیس تاریخ سر پر تھی۔ وہ دن قریب آ رہا تھا جب عمران کو ایک بڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔ ریان ولیم نے عمران کو وی وی آئی پی مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ اسی شاندار وِلا میں رہ رہا تھا جہاں ہم لاہور پہنچتے ہی اترے تھے۔ یہ جگہ مشہور منٹو پارک کے قریب واقع تھی۔ قریباً آٹھ کنال پر پھیلی ہوئی اس قدیم کوٹھی کی اندرونی آرائش زبردست تھی۔ بلند و بالا ستون، محرابی دروازے، اونچی چھتیں اور چاروں طرف احاطے میں اونچے درخت۔ یہ انگریزوں کے دور کی رہائش گاہ تھی۔ کبھی یہاں کوئی بڑا انگریز لارڈ رہائش پذیر تھا۔ اس نے گرم دوپہریں گزارنے کے لئے کمروں کے اندر ہی چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے۔

پچھلے دو روز سے میں بھی عمران کے ساتھ ہی تھا اور اس غیر معمولی مہمان نوازی کا تجربہ کر رہا تھا جو یہاں عمران کے حصے میں آئی تھی۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی عزت افزائی کبھی کبھی عمران کو بھی پریشان کر دیتی تھی۔ چھبیس تاریخ کی شام کو چند نہایت خوش پوش افراد عمران سے ملنے کے لئے آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ مال و دولت کے انبار پر بیٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے دو سفید فام تھے جن میں سے ایک کی ناک بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھی۔ دو جاپانی تھے، ایک عربی اور ایک کا تعلق ملائشیا یا سنگاپور وغیرہ سے تھا۔ ان کی توجہ کا مرکز عمران ہی تھا۔ انہوں نے گھل مل کر عمران سے باتیں کیں۔ ان کی دلچسپی ریوالور کے اس کھیل میں تھی جسے عمران کئی بار کامیابی سے کھیل چکا تھا۔ ایک چھ…… دو چھ…… اور تین چھ کا کھیل۔ ان افراد میں سے کئی ایک کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عمران منہ مانگے معاوضے پر انہیں اس کھیل کی کوئی جھلک دکھائے مگر یہ خواہش کسی کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ سب جانتے تھے کہ صرف دو دن بعد عمران کو ایک بہت بڑے شو کا حصہ بننا ہے۔ ایک بہت بڑا انعامی گیم۔ اس گیم میں شمولیت کی خاطر پچھلے مہینوں میں عمران کو انڈیا اور پاکستان کے طول و عرض میں دیوانہ وار ڈھونڈا گیا تھا اور اب ریان صاحب کی خوش قسمتی سے وہ یہاں موجود تھا۔

یہ لوگ واپس گئے تو عمران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

"یار! میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے ضرورت سے زیادہ بانس پر چڑھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر بے عزتی خراب ہو گئی پھر؟ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔"

"بھاگ جاؤ گے تو بے عزتی خراب نہیں ہو گی؟"

"چلو، آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہو گی۔ پیٹھ پیچھے تو بڑے بڑے لوگ بے عزت ہو جاتے ہیں۔"

"مگر تم تو میڈیا کے بندے ہو۔ تم تو بے عزتی کرنے والے طبقے سے ہو۔ بے عزتی "کروانے" کا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے تمہیں؟"

"ہاں، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ جب بے عزتی ہو رہی ہو تو کس طرح کا منہ بناتے ہیں۔ بے عزتی کے بعد کس طرح نیچے نیچے ہو کر کھسکتے ہیں اور پھر کیسے دوبارہ سے ڈھیٹ بن کر دکھاتے ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ راہنمائی فرما سکتے ہو؟"

میں مسکرایا۔ "تم ہاتھ دھو کر اپنی بے عزتی کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی تمہیں عزت مل جائے، جس سے تم پیدائشی طور پر محروم ہو۔ یار! صرف تین سوالوں کے درست جواب اور ایک بہت بھاری رقم ریان ولیم کے اکاؤنٹ میں۔ اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی ملے گا۔"

"میں اس میں سے آدھا تمہیں دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر بے عزتی ہوئی تو پھر آدھی تم کراؤ گے۔ دس دھکے پڑے تو پانچ تمہارے، پانچ میرے۔ بیس کلمہ ہائے لعنت و پھٹکار سننے پڑے تو آٹھ میرے، بارہ تمہارے۔"

"بھئی! یہ لعنتوں کے کھاتے میں ڈنڈی کیوں مار رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے ان سوالوں کی وجہ سے ہی میرا دماغ پلپلا ہوا ہے۔ اب جو ناکامی بھی حصے میں آئے گی، اس پلپلے دماغ کی وجہ سے ہی آئے گی۔ تمہیں اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔"

"سزا تو مل رہی ہے مجھے۔ رات دن تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے۔"

میں واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا خدا حافظ۔"

"کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔" وہ پکارا۔

"اس کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"او تیری تو ایسی کم تیسی...... بھاگڑ بلّے...... میری زندگی تباہ کر کے، مجھے ودھوا بنا کر جانا چاہتے ہو؟"

اس نے جست لگا کر مجھے عقب سے چھاپ لیا۔ ہم دونوں اوپر نیچے قالین پر گرے۔ میں نے اس کی گدی پر گھونسا جڑا۔ جواباً اس نے میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ ہم باقاعدہ کشتی لڑنے لگے۔ ڈرائنگ روم کی کئی بیش قیمت چیزیں ٹوٹ گئیں۔ باورچی ملازمین ہکا بکا ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو دو گارڈز نے ہمیں چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ سمجھ گئے کہ یہ دوستانہ لڑائی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو نپی تلی ضربیں لگائیں۔ یہ ایسی چوٹیں تھیں جن سے شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح سے لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھا۔ ہم جب بھی اس طرح گتھم گتھا ہوتے تھے، وہ ایک طرح سے عمران کی مہارت اور میری برداشت کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اچانک عمران کی گردن مرے بازو میں آ گئی۔ اس نے عورتوں جیسی باریک آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... اس غنڈے سے بچاؤ۔"

"تم تو فرما رہے تھے، میں تمہارا شوہر ہوں؟"

"تو کیا شوہر زبردستی نہیں کر سکتے۔" اس نے ترت جواب دیا اور ایک بار پھر چلانے لگا۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... مردانہ پولیس کو بلاؤ۔"

"مردانہ کو کیوں؟" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"زنانہ پولیس کا بڑا شوق ہے تمہیں۔" اس نے کہا اور پھر اچانک مجھے اڑنگا لگا کر پیچھے کی طرف گرا دیا۔ اب میں اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے مجھے جوڈو کی تکنیک سے فرشی داؤ لگایا اور تقریباً بے بس کر دیا۔

"کیسا ہے؟" اس نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ "شوہر ہونے کا جھانسا دے کر کسی کو بھی اس طرح بے دست و پا کیا جا سکتا ہے۔ اب لگاؤ کانوں کو ہاتھ۔"

میں نے اس کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بڑے کھوچل ہو تم۔" اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ملازمین اس تفریح سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

عمران کپڑے جھاڑ کر بولا۔ "یہ مشرقی اور مغربی عورتیں اسی طرح پہلے اپنے شوہروں کو بانس پر چڑھاتی ہیں پھر چاروں شانے چت کر دیتی ہیں۔ ایسا فرشی داؤ لگاتی ہیں کہ بے چارہ ہل بھی نہیں سکتا...... یہ جارج پنجم کا نام سنا ہوا ہے نا تم نے؟"

"ہاں، سنا ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

''وہ ایک ایسے ہی داؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ بے چارہ خود بھی ساری عمر عورتوں سے ڈرتا رہا۔''

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف تین چار منٹ کی دھینگا مشتی میں ہم نے اس کمرے میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا نقصان تو کر ہی دیا تھا۔ دو نہایت قیمتی گل دان، ایک امپورٹڈ ٹیلی فون سیٹ اور شیشے کی ایک بڑی تپائی چکنا چور ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں جان محمد صاحب اور مسٹر ریان ولیم بھی آن وارد ہوئے۔ شاندار ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ پھر ان کی نگاہیں ہمارے حلیے پر پڑیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

''کیا ہوا ایمران (عمران)۔'' ولیم صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تھوڑی سی مشق کر رہا تھا...... مار کھانے کی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ مسکرایا۔ ''اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تو مجھے پتا ہے جان انکل نے میری بڑی درگت بنانی ہے۔''

''تم بہادر آدمی ہو۔ تمہیں منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہئے۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ جان صاحب تمہارے ساتھ کسی طرح کا برا سلوک کر سکتے ہیں۔ یہ تو تمہارے بہت بڑے مداح ہیں۔''

''مداح ہی درگت بھی بناتے ہیں جناب! آپ نے کرکٹرز کی شامت آتے نہیں دیکھی؟''

''تم دلچسپ آدمی ہو ایمران۔'' ولیم مسکرایا۔

''شکریہ جناب! مگر اس ٹوٹ پھوٹ کا مجھے واقعی افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''تم ہمارے قابلِ قدر مہمان ہو اور اس مقابلے کے بعد بھی رہو گے۔ رہی نقصان کی بات تو اس سے دس گنا بھی ہو جاتا تو پروا نہیں۔''

اس کے بعد سنجیدہ گفتگو شروع ہوئی۔ ولیم اور جان محمد صاحب نے عمران کو تفصیل سے آگاہ کیا کہ یہ کھیل کس طرح ہو گا۔ رُول کیا ہیں اور کھیل کی ٹائمنگ وغیرہ کس طرح ہو گی...... انہوں نے بتایا کہ امریکا، جنوبی امریکا، جاپان، انڈیا اور یورپ کے کئی ممالک میں یہ گرینڈ شو مخصوص ٹی وی چینلز پر دکھایا جائے گا۔ موقع پر بھی کافی لوگ موجود ہوں گے۔ ان میں سے

زیادہ تر کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہو گا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جناب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ امریکا یا یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہونے کے بجائے یہ شو پاکستان میں ہو رہا ہے...... اور لاہور میں ہو رہا ہے؟''

''یہ اچھا سوال کیا ہے تم نے۔'' ولیم صاحب نے کہا۔ ''...... دراصل اس شو کے لئے شہر کے انتخاب کا طریقہ دلچسپ ہے۔ قرعہ اندازی سے پانچ شہر منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو سکتے ہیں۔ بعدازاں ان پانچ شہروں کے بارے میں ''فزیبلٹی'' رپورٹ تیار ہوتی ہے اور ایک کمیٹی ان میں سے ایک شہر کا انتخاب کثرتِ رائے سے کر لیتی ہے۔ اس دفعہ پانچ شہروں کی لسٹ میں صرف دو ہی نمایاں شہر تھے۔ کولمبو اور لاہور۔ لہٰذا لاہور کا انتخاب ہو گیا۔''

''یہ شو کس جگہ منعقد ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کو ابھی راز ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔'' فربہ اندام ریان ولیم نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں کا گوشت اوپر کی طرف سفر کرتا تھا اور اس کی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر دیتا تھا۔

O......❖......O

شام سات بجے کے قریب ہمیں سکیورٹی گارڈز نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ یہ بڑے چاق و چوبند...... تربیت یافتہ اور شائستہ تھے۔ نہایت معتبر سکیورٹی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بار پھر بڑی معذرت کے ساتھ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور ہمیں ایک بڑی اسٹیشن وین میں بٹھا دیا گیا۔ جان صاحب نے ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

لاہور کی مختلف سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ علاقے میں نکل آئے۔ آوازوں کے ذریعے شہر کی گہما گہمی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہم ایک خاص ایونٹ میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ اس ایونٹ کے حوالے سے کئی طرح کا تجسس ذہن میں موجود تھا۔ ایونٹ میں حصہ لینے والے گیری گرانٹ کے حوالے سے عمران کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق گیری...... ریان ولیم کا سگا بھتیجا نہیں تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور یہ پڑھی لکھی فیملی تھی۔ اس انعامی مقابلے کے حوالے سے ریان ولیم کی نظرِ انتخاب گیری پر پڑی تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق گیری ''جلدی بیماری برص'' میں بھی مبتلا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد ہم ایک زمین دوز پارکنگ لاٹ میں رک گئے۔

ہماری آنکھوں پر اب بھی پٹیاں تھیں۔ ہمیں کسی نیم گرم کوریڈور سے گزار کر ایک وسیع جگہ پہنچایا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کافی لوگ موجود ہیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹائی گئیں۔

ہم نے خود کو ایک آرام دہ کیبن میں پایا۔ یہاں صوفے تھے۔ میز پر سافٹ ڈرنکس اور وہسکی وغیرہ موجود تھیں۔ ایک طرف دو فون سیٹ بھی پڑے تھے۔ ایک سرخ، ایک سبز۔ کیبن میں سامنے کی طرف تقریباً آٹھ ضرب بارہ فٹ کا شیشہ لگا ہوا تھا۔

ہم نے ایک نیچی چھت والا گول ہال دیکھا۔ اس جدید ہال کے چاروں طرف آرام دہ نشستوں پر دو ڈھائی سو کے قریب افراد موجود تھے۔ یہ سب ایلیٹ کلاس کے خوش پوش لوگ تھے۔ دو درجن کے قریب خواتین بھی ان میں شامل تھیں۔ ان میں ہر رنگ کے افراد نظر آتے تھے۔ جاپانی، یورپین، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے اور رشین وغیرہ۔ اس گول ہال کے بیچوں بیچ شیشے کا ایک شاندار چیمبر تھا۔ یہ چیمبر بھی گولائی میں تھا اور اس کے اندر دو نشستیں موجود تھیں۔

اس چیمبر کی اونچائی ہال کے فرش سے آٹھ دس فٹ زیادہ تھی۔ اس گول چیمبر کی لائٹنگ اس طرح سے کی گئی تھی کہ یہ ایک جاذبِ نظر روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ چیمبر کے اندر ایک ایسا اسکور بورڈ تھا جسے چاروں طرف سے بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہمارے کیبن میں جان محمد صاحب پہلے سے موجود تھے۔ عمران نے پوچھا۔ ''جان انکل! آپ کو بھی پٹی باندھ کر لایا گیا ہے؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہاں موجود سارے تماشائی اسی طرح لائے گئے ہیں۔''

''وجہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''وجہ تو یہی لوگ بتا سکتے ہیں اور وہ بتائیں گے نہیں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

موقع پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایک عجیب سی سنسنی نے ہر شخص کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ جدید قسم کے ٹی وی کیمرے ان تمام مناظر کی کوریج کر رہے تھے۔ تاہم ان کیمروں کو اس طرح ''انسٹال'' کیا گیا تھا کہ وہ منظر کی مجموعی دلکشی پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں دلوں کو گرما رہی تھیں۔ اسی دوران میں فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دو خوش پوش دوست بھی کیبن میں آ گئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں ٹماٹر کی ناک والا چالیس بیالیس سالہ شخص بھی تھا...... اور پھر فل لائٹس کے ساتھ شو کا آغاز ہو گیا۔ ایک لمبا تڑنگا خوش لباس سفید فام، شیشے کے چیمبر میں داخل ہوا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جان صاحب نے سرگوشی میں بتایا۔ ''یہ مشہور امریکی چینل سی این این کا ایک سابق

ہوسٹ ہے۔''

''ہاں، شکل کچھ کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔'' عمران کہا۔

امریکن کمپیئر اپنی خوبصورت پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''خواتین و حضرات! آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہم اس شو کا آغاز کرتے ہیں جس کے لئے آپ کی نگاہیں اور سماعتیں قریباً آٹھ ماہ سے منتظر تھیں۔ دنیا بھر میں موجود اپنے اَن گنت ناظرین تک میرا اسلام پہنچے۔''

اس تمہید کے بعد کمپیئر نے کہا۔ ''پچھلے شو کے آخر میں آپ نے دیکھا تھا کہ ہمارے ذہین و خوش قسمت دوست مسٹر گیری گرانٹ نے کامیابی سے کھیل کے پہلے تین مرحلے طے کر لئے تھے۔ بغیر کوئی لائف لائن استعمال کئے، وہ چوتھے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تک کے اعصاب شکن مقابلے میں انہوں نے جو انعامی رقم اپنے نام کی ہے، اس کی مالیت دو ملین ڈالرز ہے۔ اب میں انہیں تشریف لانے اور پھر سے ''ہاٹ سیٹ'' پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔''

مسٹر ریان ولیم کا مبینہ بھتیجا گیری گرانٹ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔ اپنے تایا کی طرح اس کا جسم بھی فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی، عینک لگا رکھی تھی اور تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک شائستہ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کی نمایاں بات اس کے چہرے کے سفید داغ تھے۔ پھلبہری کے یہ داغ زیادہ پھیلے ہوئے تو نہیں تھے پھر بھی اس کی شباہت کو داغدار کرتے تھے۔

گیری ہاٹ سیٹ پر براجمان ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ہینڈسم کمپیئر نے رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد گیری کا حال چال پوچھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی ہلچل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اس سنسنی خیزی کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ گیری کے سامنے آ بیٹھا اور اناؤنسمنٹ کے انداز میں بولا۔ ''تو حاضرین! ہم اس سنسنی خیز مقابلے کا آغاز کرتے ہیں۔ اب مسٹر گیری کے سامنے صرف اور صرف تین سوال ہیں۔ ہر سوال کے صحیح جواب کے بعد ان کی انعامی رقم دگنی ہو جائے گی اور تیسرے سوال کے جواب کے بعد یہ پہنچ جائیں گے گرینڈ پرائز یعنی سولہ ملین ڈالرز تک۔ جی ناظرین! سولہ ملین ڈالرز۔ مقامی کرنسی میں قریباً ایک سو بیس کروڑ۔''

ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس میگا شو کے حاضرین میں کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔ فٹ بال کے ایک انٹرنیشنل کھلاڑی اور ہالی وڈ کے ایک ایکٹر کو ہم دور سے بھی پہچان سکتے تھے۔

کمپیئر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کھیل کے کسی بھی مرحلے میں مسٹر گیری کو سوال مشکل محسوس ہو اور انہیں جواب دینے میں خطرہ نظر آئے تو وہ اس کھیل کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جیتی ہوئی رقم کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ غلطی سے غلط جواب دے بیٹھے تو پھر انہیں اکتفا کرنا ہوگا ابتدائی انعامی رقم یعنی صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر اور یہی اس کھیل کی ساری خوبصورتی ہے۔''

ہال میں ایک بار پھر تالیاں گونجیں۔

کچھ دیر بعد کھیل کے اس اہم مرحلے کا پہلا سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ سوال کچھ یوں تھا۔ ''نیلا رومال، ایک معروف فن پارے کا نام ہے۔ اس کا تعلق دوسری جنگ عظیم سے ہے۔ یہ فن پارہ کیا ہے؟''

آپشن نمبر ایک ناول...... آپشن نمبر دو پینٹنگ...... آپشن نمبر تین گیت...... آپشن نمبر چار فلم۔''

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ پچیس چھبیس سالہ گیری پر مرکوز تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس مشکل مرحلے کا پہلا سوال ہی اس کی سمجھ سے باہر کا نکلا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کیبن میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دونوں دوستوں کے چہروں پر بھی اضطراب صاف نظر آیا۔ ان دونوں دوستوں میں ایک تو وہی ٹماٹر کی ناک والا غصیلا سا شخص تھا۔ دوسرا کوئی پروفیسر ٹائپ نظر آتا تھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے ہیں۔''

''جی مسٹر گیری!'' کمپیئر کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ''آپ کے ذہن میں کیا جواب آ رہا ہے؟ آپ اگر چاہیں تو بلند آواز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے دلچسپ ہو گا۔''

گیری ایک بار پھر پریشان انداز میں مسکرایا۔ اس نے ''ہاٹ سیٹ'' پر پہلو بدلا اور اپنی فرنچ کٹ داڑھی سہلاتے ہوئے بولا۔ ''خاصا مشکل سوال ہے۔''

''انعام بھی تو بہت بڑا ہے مسٹر گیری! آپ کا انعام دگنا ہونے جا رہا ہے۔ دو ملین ڈالرز سے چار ملین ڈالرز۔ آپ کے پاس چار آپشنز ہیں اور آپ کی تینوں لائف لائنز (فون کالز) آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ آپ اچھی پوزیشن میں ہیں۔ آپ اپنا وقت لیں اور تحمل

سے غور کریں۔ آپ کے ذہن میں کیا آ رہا ہے؟''

گیری ذرا ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''نیلا رومال...... یہ بظاہر تو کسی ناول یا افسانے کا عنوان لگتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی ناول کا نام ہو...... فکشن پڑھنے میں مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی...... جہاں تک فلم کا تعلق ہے...... کم از کم میری نظر سے تو اس طرح کی کوئی فلم نہیں گزری۔ ایک فلم شاید سرخ رومال کے نام سے میں نے دیکھی تھی......''

''پینٹنگز کی طرف آپ کا دھیان جاتا ہے؟'' کمپیئر نے پوچھا۔ ''کیونکہ اکثر مصور اپنی پینٹنگز کو عنوانات بھی دیتے ہیں۔''

''جی ہاں، دھیان تو جا رہا ہے۔'' گیری نے اپنا بڑا سا سر ہلایا۔ ''عنوان میں رنگ کو خاص اہمیت دی گئی ہے...... اور پینٹنگز میں رنگ ہی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن......'' وہ گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔

گھڑی کی سوئیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ تقریباً پندرہ کروڑ یعنی دو ملین ڈالرز کے اس سوال کے لئے گیری کے پاس کل آٹھ منٹ تھے۔ بے شک یہ ایک مشکل سوال تھا۔ ہمارے کیبن میں موجود کسی فرد کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سوال کے جواب کے بارے میں کوئی قوی امکان ذہن میں رکھتا ہے۔ گیری کے لئے ایک آسانی موجود تھی۔ اسے کل تین سوالوں کے جواب دینے تھے اور اس کے پاس تینوں لائف لائنز موجود تھیں...... یعنی دو تین فون کالز کر سکتا تھا۔

قریباً چار منٹ گزر گئے تو اس نے کمپیئر کو بتایا کہ وہ فون کال کرنا چاہتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے ہوئے سرخ فون سیٹ کی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ پروگرام کے مطابق عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے برٹش لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔ ''ایمران! سوال تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ نیلا رومال ایک فن پارے کا نام ہے...... اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ ہمیں بتانا ہے کہ یہ فن پارا کیا ہے...... ناول؟ پینٹنگ؟ گیت یا فلم؟''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ناول اور فلم کو تو رد کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ ایک مشہور فن پارہ ہے اور ناول یا فلم کی صورت میں ہے تو پھر اس ہال میں موجود کچھ نہ کچھ لوگوں کو ضرور اس کا پتا ہونا چاہئے۔ مگر جہاں تک میں جج کر رہا ہوں، میرے اردگرد موجود کسی شخص کا چہرہ یہ ظاہر نہیں کر رہا کہ وہ اس سوال کا حتمی جواب جانتا ہے۔ اب دو آپشن رہ جاتے ہیں۔ نیلا رومال کسی پینٹنگ کا عنوان ہے یا گیت کا عنوان ہے۔ میرے خیال میں یہ ففٹی ففٹی کا چانس بنتا ہے۔''

"تم کیا چانس لو گے ایمران؟" گیری نے پوچھا۔

عمران نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ مجھے یاد آیا، یہ وہی تاثر تھا جو ایک چھا اور دو چھ کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کے چہرے پر آتا تھا۔ ریوالور کے ایک خانے میں گولی اور پانچ خانے خالی یا پھر دو میں گولی اور چار خانے خالی۔ ایک وجدانی سی کیفیت اس نے کہا۔ "میں آپشن نمبر تین کی طرف جاؤں گا۔ نیلا رومال ایک گیت ہے۔"

فون کال کا وقت صرف دو منٹ کا تھا اور یہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ لائن منقطع ہو گئی۔ اب گیری کو جواب دینا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں۔ کمپیئر نے گیری کی کیفیت سے لطف اندواز ہوتے ہوئے اور سنسنی کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں مسٹر گیری! آپ کیا جواب دینا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو گیم کا رول ایک بار پھر بتا دیتا ہوں۔ آپ دوملین ڈالرز جیت چلے ہیں۔ آپ درست جواب دیں گے تو آپ کی انعامی رقم ہو جائے گی چار ملین ڈالرز...... انعامی کرنسی میں یہ قریباً تیس کروڑ روپیا بنتا ہے۔ اگر آپ کا جواب غلط ہو گیا تو پھر آپ کو بنیادی انعام یعنی پینسٹھ ہزار ڈالرز پر جانا ہوگا۔ اگر آپ تذبذب میں ہیں اور رسک لینا نہیں چاہتے تو پھر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنا جیتا ہوا انعام یعنی دوملین ڈالرز یہاں سے لے جا سکیں گے اور یقیناً یہ ایک خاصی معقول رقم ہے۔"

گیری نے چند لمحے توقف کیا پھر اس نے جواب دیا۔ "میں کھیلنا چاہتا ہوں اور میرا جواب ہے، آپشن نمبر تین۔ نیلا رومال ایک گیت کا عنوان ہے۔"

ہال میں سناٹا تھا۔ کمپیئر نے سسپنس کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے جواب کو "سیف" کر لیا جائے؟"

"جی ہاں۔"

کمپیئر نے اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ "مسٹر گیری کے جواب کو محفوظ کیا جائے۔ آپشن نمبر تین۔" الیکٹرانک اسکرین پر آپشن نمبر تین سیف ہو گیا۔

ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ کمپیئر جان بوجھ کر وقفے کو طول دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نوجوان گیری کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

"مسٹر گیری...... چار ملین ڈالرز۔ آپ کا جواب درست ہے۔"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ ریان ولیم بھی جوش کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے عمران کو گلے لگایا۔ "مجھے یقین ہے...... مجھے یقین ہے۔ تمہاری خوش بختی ضرور اپنا زور مارے گی۔"

گیری بھی شیشے کے چیمبر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے ناظرین کے پُر جوش ردِعمل کا جواب دیا۔ پھر اپنے تایا اور عمران وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

کمپیئر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "نیلا رومال ایک گیت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ گیت روس میں بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی یہ گایا جاتا ہے۔ لوگ اسے سن کر روتے تھے اور دل ہی دل میں گنگناتے تھے۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا واقعہ ہے جو لڑائی پر روانہ ہوتے ہوئے، اپنی محبوبہ کو ایک نیلے رومال کا تحفہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے یاد رکھے۔ وہ لڑکی برسوں اس رومال کو سینے سے لگائے رکھتی ہے اور اس خوب صورت چمکیلے دن کی منتظر رہتی ہے جب اس کا محبوب واپس آئے گا مگر وہ نہیں آتا۔ وہ کبھی نہیں آتا۔ وہ مر چکا ہے۔"

کمپیئر نے چار ملین ڈالرز کا چیک گیری کو دیا اور بولا۔ "مسٹر گیری! یہ ایک کافی بڑی رقم ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں اور ابھی امید ہے کہ آپ کی ملکیت میں اضافہ ہوگا۔ آپ اس خطیر رقم کو کس طرح استعمال کرنا چاہیں گے؟"

گیری کچھ کھویا کھویا نظر آیا۔ تب اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، مجھے یہ ظاہر کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں عالی جناب ریان ولیم صاحب کا ایک دور کا رشتے دار ہوں اور میری مالی حیثیت انکل ریان ولیم سے کہیں...... کہیں کم ہے۔ یہ انکل کی عنایت ہے کہ انہوں نے اس انعامی رقم کا کچھ پورشن مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے...... اور مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ میں ان کی طرف سے اس میگا ایونٹ میں حصہ لوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں برص میں مبتلا ہوں۔ میری ایک بہن بھی برص کی مریضہ تھی۔ اس نے محبت میں ناکامی کے بعد زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے کر اپنی جان دے دی تھیں خیر، یہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ اگر میں ایک بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو میں آسٹریا میں اپنا علاج کرواؤں گا اور اس کے علاوہ برص کے علاج پر تحقیق کرنے والے عالمی ادارے کو "ڈونیشن" دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے۔ اب ہم آتے ہیں اس اہم ترین مرحلے کے دوسرے سوال کی طرف۔ کیا آپ تیار ہیں؟" کمپیئر نے پوچھا۔

"جی، میں تیار ہوں۔" گیری نے جواب دیا اور ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا۔

کمپیئر بولا۔ ''ایک ہوسٹ اور کمپیئر ہونے کی حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جواب دینے سے پہلے اپنا پورا وقت لیں۔ چار ملین ڈالرز کافی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی مرحلے پر آپ کو محسوس ہو کہ آپ ایک بہت ''رسکی'' جواب دینے جا رہے ہیں تو آپ گیم چھوڑ دیں۔''

گیری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

کمپیئر نے کہا۔ ''لیجئے ناظرین! اس مرحلے کا دوسرا سوال آپ کے سامنے اسکرین پر آ رہا ہے۔ اس سوال کا درست جواب ہمارے دوست مسٹر گیری گرانٹ کی انعامی رقم کو ڈبل کرے گا، یعنی وہ چار ملین ڈالرز سے آٹھ ملین ڈالرز ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے۔ سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ کمپیئر نے پڑھ کر سنایا۔ ''9 اگست 1945ء وہ المناک تاریخی دن ہے جب امریکن بمبار جہاز نے جاپانی شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا...... لیکن اصل میں یہ بم ایک اور شہر پر گرایا جانا تھا۔ اس شہر کا نام کیا ہے؟ آپشن نمبر ایک ہپو...... آپش نمبر دو یوکوہاما...... آپشن نمبر تین اوساکا...... آپشن نمبر چار کوکورا۔''

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ یہ ایک اور مشکل سوال آ گیا تھا۔ ناگاساکی کا نام تو ہر کوئی جانتا تھا لیکن وہ شہر کون سا تھا جس پر اصل میں ایٹم بم گرائے جانے کا امریکی پروگرام تھا۔ اس بار گیری گرانٹ کے چہرے پر ہلکی سی کرن نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں ہے۔ اس نے ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر سوال کو نہایت توجہ سے پڑھا۔ تناؤ کی کیفیت ناظرین میں بڑھتی جا رہی تھی۔

''جی جناب...... مسٹر گیری گرانٹ! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ذہن میں کچھ آ رہا ہے؟''

گیری نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، آپشن نمبر دو اور تین تو ہرگز نہیں کیونکہ یہ دونوں شہر ناگاساکی سے ذرا فاصلے پر ہیں...... اور میرے خیال میں اس شہر کو ناگاساکی سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' کمپیئر نے دریافت کیا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، اس دوسرے شہر پر بم اس لئے نہیں گرایا جا سکا تھا کہ وہاں بادل چھائے ہوئے تھے، ان بادلوں کی وجہ سے ہی امریکی بمباروں نے ایک قریبی ہدف یعنی ناگاساکی کا انتخاب کر لیا تھا۔''

کمپیئر بولا۔ ''اگر آپ کے ذہن میں اتنا کچھ آ رہا ہے تو پھر اس شہر کا نام بھی آپ کے

ذہن میں آنا چاہئے۔''

گیری نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالے۔ نشست پر پہلے آگے جھکا پھر پیچھے کی طرف گیا۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ شہر ہپو ہو گا یا پھر کوکورا۔ لیکن ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ ابھی آپ کو چاروں آپشن ذہن میں رکھنے چاہئیں۔''

کمپیئر نے اسے مزید الجھانے کی کوشش کی۔

گیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس الیکٹرانک اسکرین کو دیکھتا رہا اور اپنی سوچ کے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ ہال میں پن ڈراپ سائیلنس تھا۔

قریب ایک منٹ کے غور و فکر کے بعد اس نے اپنی دوسری لائف لائن استعمال کرنے کے لئے عمران سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو ایمران...... تم کیا مشورہ دیتے ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''میرے ذہن میں بھی وہی کچھ آ رہا ہے جو تمہارے ذہن میں آ رہا ہے۔ آپشن نمبر ایک یا آپشن نمبر چار...... اور تھوڑا بہت آپشن نمبر دو بھی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''میرا خیال ہے کہ آپشن ایک اور آپشن چار پر ہی توجہ رکھنی چاہئے۔'' عمران نے کہا اور پھر کیبن میں موجود باقی افراد کی طرف دیکھا۔

مجھ سمیت کیبن میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس مشکل سوال کے حوالے سے عمران اور گیری کی کوئی مدد کر سکتا۔ مسٹر ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اظہار کیا۔ ان کے دونوں دوستوں کے تاثرات بھی یہی تھے۔

کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''ہاں مسٹر گیری...... آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ فون کال کے حوالے سے آپ کے پاس صرف چالیس سیکنڈ بچے ہیں۔''

''بتاؤ ایمران...... تمہاری چوائس کیا ہے؟'' گیری نے بے قراری سے کہا۔

''میری چوائس...... کوکورا ہے۔'' عمران نے ذرا توقف کے بعد نہایت مضبوط اور دوٹوک انداز میں کہا۔

شاید اس کا یہی دوٹوک انداز ہوتا تھا جو اس کی خوش بختی کا وسیلہ بنتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہاں بھی یہ انداز کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے یا نہیں۔

یہ تھرل اور سسپنس سے بھرپور لمحے تھے۔ گیری کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا......

"ہاں مسٹر گیری!" کمپیئر نے اپنی آواز سے گیری کو ٹہوکا دیا۔ "یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔ آپ کا درست جواب آپ کو پہنچا سکتا ہے آٹھ ملین ڈالرز کے خطیر انعام تک۔ غلط جواب کی صورت میں آپ آ جائیں گے بنیادی انعام صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر...... اگر آپ کھیل چھوڑنا چاہیں تو یہاں چار ملین ڈالرز کے انعام پر چھوڑ سکتے ہیں۔"

گیری کی پیشانی پر نمی چمکنے لگی۔ ایک طرف چار ملین ڈالرز یعنی تقریباً تیس کروڑ پاکستانی روپیا تھا اور دوسری طرف صرف انچاس لاکھ روپے کے لگ بھگ۔

گیری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا اپنا ذہن تو آپشن نمبر ایک یعنی ہیو کی طرف جا رہا ہے لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ جانا چاہوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی "لک" میری مددگار رہوگی۔ میرا جواب ہے آپشن نمبر چار، کوکورا......"

"کوکورا" سی این این کے کمپیئر نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر بولا۔ "مسٹر گیری! کیا یہ آپ کا حتمی جواب ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا ہم اسے "سیو" کر لیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کے پاس ابھی پچاس سیکنڈ ہیں۔ اگر آپ مزید سوچنا چاہتے ہیں تو سوچ لیں۔"

"سوچ لیا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے جی...... آٹھ ملین یو ایس ڈالرز کے لئے مسٹر گیری کے جواب کو "سیو" کیا جائے۔"

اسکرین پر آپشن نمبر چار کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ کمپیئر نے اگلے تین چار منٹ میں اس جواب کے حوالے سے ہزاروں لاکھوں ناظرین کے تجسس کو خوب ابھارا۔ تجسس اور سنسنی کو یوں ابھارا جانا ان شوز کا خاصہ ہوتا ہے۔ کمپیئر کے چہرے اور باتوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اپنی ساری ہمدردیاں گیری کے ساتھ بتا رہا تھا اور کبھی کبھی اسے تاسف کی نظروں سے بھی دیکھنے لگتا تھا۔ ٹی وی کیمرے ناظرین کے ہجوم میں سے بار بار گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں اور ان کے ہونٹ بے ساختہ، دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے......

آخر کمپیئر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے گھمبیر آواز میں کہا۔ "مسٹر گیری! ہمیں

خوش قسمتی پر یقین رکھنا چاہئے اور خوش قسمتی اکثر لوگوں کی مدد بھی کرتی ہے۔ مگر...... خوش قسمتی نے اس دفعہ آپ کی مدد نہیں کی...... بلکہ آپ کو باقاعدہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر منزل تک پہنچایا ہے۔" کمپیئر نے آخری چند الفاظ بے حد جوش کے عالم میں اور ڈرامائی انداز سے کہے۔

پورا ہال اپنے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے ایک پُر جوش آواز بلند کیا...... گیری نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور خوشی سے چلا اٹھا۔ قیامت کے شور میں کمپیئر کی آواز گونجی۔ "آپ کا جواب درست ہے مسٹر گیری۔ آپ اسّی ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ اس رقم کے مالک ہیں۔"

گیری نے فون سیٹ کو چوما اور پکارا۔ "تھینک یو ایمران...... تھینک یو......" گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو بڑے جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر دکھایا گیا۔

قریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ پھر کمپیئر کی آواز گونجی۔ اس نے جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "کوکورا وہ شہر تھا جہاں امریکیوں نے دوسرا ایٹم بم گرانے کی پلاننگ کی تھی۔ امریکی بمبار جہاز کوکورا کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے لیکن کوکورا والوں کی خوش قسمتی کہ اس روز شہر پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت دھواں بھی تھا جس کی وجہ سے بمبار، شہر کے تین چکر لگانے کے باوجود اپنا ٹارگٹ نہ ڈھونڈ سکے۔ یوں ایک بہت بڑے اسلحے کے ڈپو اور کارخانے والا یہ شہر بچ گیا۔ اس کے حصے کی موت ناگاساکی پر برس گئی۔ 9 اگست 1945ء...... گیارہ بج کر دو منٹ۔ کوکورا کی جگہ ناگاساکی موت کے منہ میں چلا گیا۔"

شو اپنے کلائمیکس پر پہنچ گیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ گیری پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً ساٹھ کروڑ کا انعام جیت چکا تھا۔ اب صرف ایک سوال کے عوض اس کی انعامی رقم ایک بہت بڑا جمپ لے سکتی تھی۔ سولہ ملین ڈالرز یعنی تقریباً ایک ارب بیس کروڑ روپے۔ یہ انعام ایک لگژری جہاز کی صورت میں تھا۔ اسے سپنوں کا جہاز کہا جا سکتا تھا۔ نہایت قیمتی، نہایت آرام دہ اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ۔ بتانے والے بتا رہے تھے کہ "فیلکن 900 سی" نامی اس جہاز کو کسی بھی وقت سولہ ملین بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم پر فروخت کیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک سوال کے جواب کی قیمت ساٹھ کروڑ روپے تھی اور یہ سوال گیری کے سامنے آنے والا تھا۔

آخر کمپیئر نے پروگرام کو اس فائنل مرحلے کی طرف بڑھایا۔ اس نے کہا۔ "ناظرین! دل تھام کر بیٹھیں۔ مسٹر گیری اس مقابلے کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز

جیت چکے ہیں اور اس رقم کا چیک انہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ یہ چیک واپس کرنا چاہیں اور آگے بڑھنا چاہیں تو ہم آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق گیری آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے چیک کمپیئر کی طرف واپس بڑھا دیا جو پہلے کی طرح شیشے کے ایک باکس میں رکھ لیا گیا۔ کمپیئر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مسٹر گیری! آپ کے دل کے دھڑکن کیا کہہ رہی ہے؟"

گیری کوشش کر کے مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے برص زدہ ہونٹ کچھ اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ بولا۔ "جناب...... دھڑکن سولہ سولہ کی رٹ لگا رہی ہے۔ سولہ ملین۔"

کمپیئر نے کہا۔ "آٹھ ملین بھی تو معمولی رقم نہیں ہے۔ کیا آپ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہیں؟"

"اس کا فیصلہ سوال آنے کے بعد کرتے ہیں۔"

گیری پھر نروس انداز میں مسکرایا۔

"سوال خاصا مشکل ہے مسٹر گیری۔ میں آپ کو پھر مشورہ دوں گا کہ جواب کے حوالے سے اگر آپ کے ذہن میں شکوک زیادہ ہیں تو پھر آپ جواب مت دیں۔ آپ ایک خطیر رقم کے مالک بن چکے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اب یہ رقم آپ سے دور نہ ہو۔"

"میری بھی یہی خواہش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خواہش ہے کہ میں گرینڈ پرائز حاصل کروں۔"

"تو ٹھیک ہے جی۔ اب تیسرا اور آخری سوال آپ کے سامنے آ رہا ہے، اسکرین پر۔" کمپیئر نے کہا۔

اسکرین پر سوال جگمگایا۔ "اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے Fleas کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں، 1000...... 1400...... 2400 یا پھر 850۔"

اسکرین پر سوال پڑھنے کے بعد گیری کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ یہ ایک نہایت مشکل سوال تھا یا شاید یہ ترتیب ہی اس لئے دیا گیا تھا کہ اس کا جواب دیتے ہوئے صرف اور صرف اندازے سے کام لیا جا سکے۔ یعنی اس سوال کے حوالے سے یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا تھا۔ بس ایک تکا لگایا جانا تھا اور یہ تکا کامیاب بھی ہو سکتا تھا اور ناکام بھی۔

کمپیئر نے متجسس نظروں سے گیری کے برص زدہ چہرے کو دیکھا۔ "جی مسٹر گیری! سولہ ملین ڈالرز کا سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ کے ذہن میں کیا آ

رہا ہے؟"

"یہ بہت کٹھن سوال ہے۔" گیری پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"انعام بھی تو بہت بڑا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو سوال پر مرکوز کریں اور پھر یہ بھی سوچیں کہ یہاں کوئی دس پندرہ یا بیس آپشن نہیں ہیں۔ صرف چار آپشن ہیں اور ان میں سے ایک درست ہے۔"

گیری کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ یقیناً وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک سوال کے بدلے میں اس کی انعامی رقم تقریباً ساٹھ کروڑ سے قریباً ایک سو بیس کروڑ ہونے والی تھی۔ صرف ایک سوال کا درست جواب اور وہ جواب ان چار آپشنز میں موجود تھا۔ یہی اس کھیل کی خوبصورتی تھی۔ اب یہ بس ہمت کا کھیل تھا۔ درست جواب پر ساٹھ کروڑ روپے کا اضافہ اور غلط جواب پر جیتی ہوئی رقم سے بھی محرومی۔ اس صورت میں گیری کو فقط پینسٹھ ہزار ڈالرز یعنی تقریباً انچاس لاکھ روپے ملنے تھے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ گیری اپنی انعامی رقم کو ڈبل کرنے کی بے پناہ کشش سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اس کھیل کو یہیں پر چھوڑ دیتا۔

اگلے دو تین منٹ بے حد اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے تھے۔ کمپیئر اس تناؤ اور سنسنی میں اضافے کے لئے مسلسل چھوٹے چھوٹے فقرے بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "مسٹر گیری! یقیناً کوئی ایک آپشن تو ایسا ہوگا جسے آپ دوسرے آپشنز سے بہتر سمجھتے ہوں گے۔"

گیری پھیکے انداز میں مسکرایا اور طویل سانس لے کر بولا۔ "نہیں۔ یہ پہلا سوال ہے جس کے حوالے سے میرا ذہن بالکل 'بلینک' ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔"

ہمارے کیبن میں ریان ولیم نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران کا چہرہ بھی سپاٹ تھا اور لگ یہی رہا تھا کہ اس بھرے پُرے ہال میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اس سوال کا جواب جانتا ہو۔

"تو کیا آپ کھیل یہیں پر چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" کمپیئر نے گیری سے پوچھا۔

"جی...... میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی آخری لائف لائن استعمال کروں گا۔" گیری نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر گیری کے دوست کو فون لگایا جائے۔" کمپیئر نے آرڈر جاری کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اور ہم امید کرتے ہیں کہ گیری کا یہ دوست ان کے لئے پہلے کی طرح بخت

آور ثابت ہوگا۔''

چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے کہا۔ ''ہیلو ایمران ڈیئر! تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

عمران نے کہا۔ ''اس سوال کے حوالے سے میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری ہے...... اور شاید اس ہال میں موجود تمام لوگوں کی ہے۔ اب یہ سراسر قیافے اور ''لک'' کا کھیل بن گیا ہے۔ یہ ففٹی کا نہیں سیونٹی فائیو اور ٹونٹی فائیو کا رسک ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کسی ریوالور میں آٹھ خانے ہیں۔ چھ خانوں میں گولیاں ہیں اور دو خانے خالی ہیں۔ آپ کو چرخی گھما کر اپنی کنپٹی پر ٹریگر دبانا ہے۔''

''شاید تم نے ٹھیک مثال دی ہے۔'' گیری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

چیمبر میں ایک بیل کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی برٹش کمپیئر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اس فائنل مرحلے میں ہم اپنے معزز Participant کو سوچ بچار کے لئے جو وقت دیتے ہیں، وہ پانچ منٹ کے بجائے دس منٹ کا ہوتا ہے۔ فون کال بھی دو منٹ کے بجائے چار منٹ کی ہوتی ہے۔ مسٹر گیری! آپ اپنا پورا ٹائم لیں اور جو فیصلہ کریں، سوچ سمجھ کر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے ایک بڑی اماؤنٹ لے کر جائیں۔ آپ نے اپنے علاج اور دوسروں کی صحت و تندرستی کے لئے جو ارادے ظاہر کئے ہیں، وہ پورے ہوں۔''

ناظرین بہت شور مچا رہے تھے اور ہاتھوں کے اشارے سے گیری کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کھیل یہیں پر ختم کر دے کیونکہ ایک خطیر رقم اس کے حصے میں آ چکی ہے۔ ٹی وی کیمروں نے گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھایا۔ وہ بھی زبردست کشیدگی کا شکار تھیں۔ گیری کی چھوٹی بہن بھی اشاروں سے بھائی کو کھیل Quit کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

ہمارے کیبن میں عمران نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور ریان ولیم سے پوچھا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں جناب؟''

''میں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔''

''یعنی آپ چاہتے ہیں کہ رسک لیا جائے؟''

''بالکل لیا جائے...... لیکن یہ رسک تم لو۔''

''میں آپ کو پھر بتا دوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریوالور کے چھ خانوں میں گولیاں ہوں اور صرف دو خانے خالی ہوں۔''

''میں نے زندگی میں کبھی خانے نہیں گنے مسٹر ایمران! میں یہ داؤ کھیلنا چاہتا ہوں اور...... تمہارے ذریعے کھیلنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کا فیصلہ حتمی ہے؟''

''ہاں حتمی ہے۔'' ریان ولیم نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ''تخت یا تختہ۔''

عمران کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے فون سیٹ کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''گیری! میری رائے میں آپشن نمبر 2۔''

چند سیکنڈ کے بعد فون کال کا وقت ختم ہو گیا۔

اب سب کچھ گیری گرانٹ پر تھا۔ کمپیئر نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''جی مسٹر گیری! آپ جواب دیجئے۔ اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے Fleas کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ 1000...... 1400 ...... 2300 ...... یا پھر 850۔''

گیری خاموش رہا۔ اتنے بڑے چیلنج کے سامنے وہ سکتہ زدہ نظر آ رہا تھا۔

کمپیئر نے دہرایا۔ ''جی مسٹر گیری! آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ آپ کے درست جواب کا مطلب ہے، سولہ ملین ڈالرز سے زیادہ مالیت کا بے مثال لگژری طیارہ۔ ایک سپنوں کا جہاز۔ آپ کے غلط جواب کا مطلب ہے، قریباً آٹھ ملین ڈالرز سے محرومی۔ آپ اب بھی کھیل چھوڑ سکتے ہیں۔''

گیری نے آخری بار ہمارے کیبن کی طرف دیکھا۔ ریان ولیم نے اپنا...... بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ گیری نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''میں آپشن نمبر 2 کے ساتھ جانا چاہوں گا...... 1400۔''

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ سب نگاہیں شیشے کے گول چیمبر پر اور الیکٹرانک اسکرین پر مرکوز تھیں۔

کمپیئر سنسنی خیز نظروں سے کبھی گیری کی طرف اور کبھی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر گیری!! ابھی آپ کا جواب ''سیو'' نہیں کیا گیا۔ کوئز شوز کی تاریخ کے اس سب سے بڑے شو میں، میں آپ کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر اب بھی آپ اپنا جواب بدلنا چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔''

گیری نے متوحش نظروں سے کمپیئر کو دیکھا پھر ہمارے کیبن کی طرف نگاہ دوڑائی۔

عمران خاموش تھا اور ریان ولیم بھی۔ ریان ولیم کے دونوں دوست بھی یکسر خاموش تھے۔

ایسے شوز میں کمپیئرز اور ہوسٹ اپنے کھلاڑی کو اس طرح کی آفرز دیتے ہیں۔ ان آفرز کا مطلب کھلاڑی کے اعصاب ٹیسٹ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آفر کبھی سودمند ہوتی ہے اور کبھی نقصان دہ۔ ریان ولیم نے گیری کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ جواب دے اور آپشن نمبر 2 کے ساتھ رہے۔

گیری نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میرا جواب آپشن نمبر 2 ہی ہے۔''

آپشن نمبر 2 کو ''سیو'' کر لیا گیا۔

سینوں کی دھڑکنیں نقاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ ہر نگاہ الیکٹرانک اسکرین پر تھی۔ اگر جواب درست ہوتا تو اسکرین پر سبز رنگ نمودار ہونا تھا...... دوسری صورت میں سرخ رنگ۔ شاید کوئی بھی نگاہ سرخ رنگ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ان فیصلہ کن گھڑیوں میں یہ سرخ رنگ خوف کی علامت بن گیا تھا۔ سبز رنگ خوشی اور جوش سے منسلک ہو گیا تھا۔ ہال میں پن ڈراپ خاموشی تھی۔ گیری آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

......اور پھر ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ اس خاص قسم کے چھناکے کے ساتھ ہی الیکٹرانک اسکرین پر سرخ رنگ ابھرا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی۔ گیری کا جواب غلط ہو چکا تھا......

ٹی وی کیمروں نے بار بار چہروں کے ردِعمل دکھائے۔ گیری سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ اور بہن نے اپنے سر گھٹنوں میں دے رکھے تھے۔ کمپیئر خاموش تھا۔ ریان ولیم خاموش تھا۔ دو سو سے زیادہ ناظرین خاموش تھے اور کچھ صداہائے تاسف بلند کر رہے تھے۔ کئی سیکنڈ بعد کمپیئر کی نہایت گمبھیر آواز ابھری۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر گیری! آپ کا جواب غلط ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آپ نے بہت دلیری سے مقابلہ کیا۔ آپ کے پاس کھیل سے پسپا ہونے کا آپشن موجود تھا مگر آپ نے اور آپ کے دوست نے فائٹ کرنے اور خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔ اس کے لئے آپ کی تعریف کرنا پڑے گی۔ زندگی خطرے مول لینے کا نام ہی تو ہے۔''

کمپیئر نے تالیاں بجائیں۔ آڈئینز نے بھی مرے مرے انداز میں اس کا ساتھ دیا۔

جو جواب اسکرین پر آیا، وہ آپشن نمبر تین تھا...... یعنی 2400۔

کمپیئر نے قاعدے کے مطابق جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''سائنسی تحقیق کی تازہ رپورٹ کے مطابق طاعون کے جرثومے کی کم و بیش 2400 اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ تاہم ان میں سے صرف 120 اقسام ایسی ہیں جو طاعون کا جرثومہ انسان میں منتقل کر سکتی

ہیں۔ ان 120 اقسام میں سے تقریباً بیس بائیس قسمیں ایسی ہیں جو چوہوں کے ذریعے طاعون کے پھیلاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں طاعون جیسی خطرناک بیماری پھیلنے کے امکانات ہمہ وقت موجود ہیں۔''

ہال میں ویسی ہی خاموشی طاری تھی جو طاعون سے برباد شدہ کسی بستی میں ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک کے کھیل میں اپنے رویے سے گیری نے قریباً سو فیصد ناظرین کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ صدمے کی شدت سے گیری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں۔

کمپیئر نے گیری کو گلے سے لگایا اور تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی پینسٹھ ہزار ڈالرز کا چیک بھی اسے دیا گیا۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا اینٹی کلائمیکس تھا۔

......قریباً دس منٹ بعد کھیل کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کھیل کا سارا پیٹرن وہی پہلے والا تھا...... پہلے ایک ہاؤس وائف کھیلنے کے لئے آئی۔ اس کا تعلق انڈیا سے تھا۔ یہ بھی چند دیگر امیدواروں کی طرح پہلے مرحلے میں منتخب ہوئی تھی۔ یہ پچیس چھبیس سالہ خاتون صرف دوسرے مرحلے تک پہنچ سکی۔ اس نے فقط دس ہزار ڈالرز جیتے۔ پھر ایک جاپانی آیا۔ یہ بھی زیادہ آگے نہیں جا سکا۔ اگلے قریباً پون گھنٹے میں چار امیدوار ابتدائی مرحلوں میں فارغ ہو کر واپس گئے۔ صرف ایک شخص پانچ لاکھ ڈالرز یعنی قریباً تین کروڑ چھہتر لاکھ روپے کے انعام تک پہنچ سکا۔

چھٹے نمبر پر جو کھلاڑی شیشے کے چیمبر میں داخل ہوئی اور ہاٹ سیٹ پر بیٹھی، یہ وہی امریکن لڑکی تھی جس کا باپ ریان ولیم کا کاروباری حریف بھی تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریانی اور اس کے باپ کا نام مسٹر بفیلو بتایا گیا تھا۔ لڑکی دیکھنے میں پُرکشش تھی اور کسی ماڈل ہی کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے نہایت ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم کا لباس بھی ایسا تھا جو چھپا کم رہا تھا اور اور دکھا زیادہ۔ ریان ولیم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ''کہتے ہیں کہ خوب صورتی اور ذہانت عورتوں میں کم کم ہی اکٹھی ہوتی ہے لیکن اس خبیث میں یہ دونوں چیزیں اکٹھی آ گئی ہیں۔''

یہ فقرہ بولنے کے فوراً بعد ریان ولیم اپنے بھاری بھرکم جسم کو ہلکورا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غالباً وہ اس لڑکی کو کھیلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دونوں دوست بھی بیزاری کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

ریان ولیم کی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس وقت ہم اس میگا شو میں سے باہر نکل رہے تھے، کمپیئر کی خوبصورت آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ''...... تو جی ناظرین! مس ماریانی وہ ہونہار امیدوار ہیں یا کہہ لیں کہ Participant ہیں جن سے لوگوں نے مسٹر گیری ہی کی طرح بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ مس ماریانی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک بڑی کامیابی سے کوئز شوز میں حصہ لیتی رہی ہیں...... اور آج وہ اس میگا ایونٹ میں موجود ہیں جس میں یہ قریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر گرینڈ پرائز سولہ ملین ڈالرز تک پہنچ سکتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے میگا شو میں مس ماریانی نے تین مرحلے حیران کن تیزی سے پار کر لئے تھے۔ اب تک وہ دو ملین یو ایس ڈالرز جیت چکی ہیں اور چوتھے مرحلے میں ہیں......''

کمپیئر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم ایک بند کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں حسبِ سابق میری اور عمران کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور ہمیں ایک نیم گرم کوریڈور میں سے گزار کر اسٹیشن وین میں پہنچا دیا گیا۔

ہم واپس اسی رہائش گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے ہمیں میگا شو میں حصہ لینے کے لئے لے جایا گیا تھا۔ یہاں ہمارا خدمت گار عملہ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب ان لوگوں میں پہلے سی گرم جوشی موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ مسٹر ریان ولیم اور ان کے دونوں دوست بھی اسی کوٹھی میں موجود ہیں مگر انہوں نے عمران کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنے پورشن تک محدود رہے۔

جان محمد صاحب ہمارے پاس آئے۔ وہ بھی افسردہ تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ''ریان ولیم صاحب دوستوں کے ساتھ مل کر غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہسکی پی رہے ہیں۔''

''میرے بارے میں کچھ فرمایا ہے انہوں نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی وہ فرمانے کی پوزیشن میں نہیں۔'' جان صاحب نے کہا۔

دس پندرہ منٹ بعد ایک اور اطلاع پہنچی اور یہ بھی پریشان کن تھی۔ وہی ہوا تھا جس کا ریان ولیم کو ڈر تھا۔ میگا کوئز شو کے حوالے سے یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ جان محمد صاحب کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی گہری ہوگئی۔ انہوں نے فون پر پوچھا۔ ''یہ کنفرم اطلاع ہے؟'' دوسری طرف سے غالباً اثبات میں جواب دیا گیا تھا۔

جان محمد صاحب نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''امریکن ماریانی گرینڈ پرائز جیت گئی

ہے۔ سولہ ملین ڈالرز کا لگژری پلین۔''

''اب تو ریان صاحب کا حال اور بھی برا ہو جائے گا۔ کہیں پریشر کی وجہ سے ان کا بھاری بھرکم جسم پھٹ ہی نہ جائے۔'' عمران نے تشویش ظاہر کی۔

ریان صاحب تو نہیں پھٹے لیکن ان کا ایک دوست ضرور پھٹ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد وہ نشے میں ڈولتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔ یہ وہی ٹماٹر کی ناک والا تھا۔ وہ بالکل ٹن ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کو گھورا اور کرخت انگلش میں بولا۔ ''واہ...... واہ بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے ہو ہمارے لئے۔ ہمیں تو نہال کر دیا تم نے اور مالا مال کر دیا۔ تمہارا تھوبڑا چومنے کو دل چاہتا ہے...... اور دل چاہتا ہے کہ تمہیں گائے کے گوبر میں تولا جائے اور یہ سارا گوبر گٹھڑی میں باندھ کر تمہارے سر پر رکھ دیا جائے۔ واہ...... کہاں چھپے ہوئے تھے تم اب تک؟ کہاں سے ڈھونڈا ہے تمہیں ہمارے پیارے ریان نے؟''

''تمہارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تمہاری وائف کے بستر کے نیچے۔'' عمران نے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا بکا تم نے؟'' ریان کے شرابی دوست نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میری صفائی تو آپ نے خود ہی پیش کر دی ہے۔ میں خود نہیں آیا بلکہ مجھے ڈھونڈ کر لایا گیا ہے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ آپ لوگوں کے...... اصرار پر ہوا ہے۔ باقی قسمت کے کھیل میں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اس نے شرابی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ''ہاں، قسمت کے کھیل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں کوئی چیز اٹھا کر مارتا ہوں تو تمہیں لگ سکتی ہے اور نہیں بھی لگ سکتی۔ قسمت کا کھیل ہی ہے نا؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر کا ایک چھوٹا گلدان اٹھایا اور طاقت سے عمران کے سر کو نشانہ بنایا۔ عمران نے جھک کر خود کو گلدان کی ضرب سے بچایا۔ گلدان اڑتا ہوا ایک قد آدم آئینے سے ٹکرایا اور اسے چکنا چور کر گیا۔

''واقعی قسمت کا کھیل ہے۔'' ٹماٹر کی ناک والے نے سر اوپر نیچے ہلایا...... ''اس شیشے کی قسمت میں موت لکھی تھی۔ چچ چچ...... کتنا قیمتی شیشہ تھا...... میڈ اِن فرانس۔'' اس نے کہا اور تاسف انگیز انداز میں جھک کر شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ یہ ٹکڑا عمران کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بہت برق رفتار تھا۔ اس شخص نے آئینے کے ایک بڑے ٹکڑے سے یکا یک عمران کی رانوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو بچا نہ سکتا۔ پھر بھی نکیلا ٹکڑا اس کی ناف کے قریب لکیر ڈالتا ہوا نکل گیا۔

ٹن حملہ آور سخت اشتعال میں تھا۔ شاید وہ مزید حملے کرتا مگر عمران نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر طاقت سے دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور ایک چھ فٹ اونچے آرائشی لیمپ پر گر کر اسے چکنا چور کر گیا۔ لیمپ کی روشن ٹیوب لائٹ ایک چھوٹے سے دھماکے سے چکنا چور ہو گئی۔ عمران نے ٹماٹر کی ناک والے کی فربہ گردن اپنے آہنی بازو میں جکڑ لی اور ٹوٹ جانے والے لیمپ کا الیکٹرک تار اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امکان تھا کہ اس تار میں ابھی تک کرنٹ دوڑ رہا ہو گا۔ عمران نے تار کے ننگے سرے حملہ آور کے چہرے کے قریب کیے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تاہم اس کی چربی دار گردن پر عمران کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا بالائی دھڑ بس مچل کر رہ گیا۔ عمران الیکٹرک تار اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ پھر فلم شعلے کے گبر سنگھ کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ ''ہم کو کچھ پتا ناہیں ٹھاکر...... کہ اس میں کرنٹ ہے یا ناہیں...... ہم کو کچھ پتا ناہیں۔ یہ سارا قسمت کا کھیل ہے۔ اگر کرنٹ ناہیں ہوا تو تمہیں جندگی مل جائے گی۔ اگر ہوا تو پھر ناک کی طرح تمہارا باقی کا تھوبڑا بھی بندر کی پیٹھ جیسا ہو جائے گا۔''

سرخ ناک والے حملہ آور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس آفت میں آ گیا ہے۔ نہایت زوردار اور جسیم ہونے کے باوجود وہ اپنے بالائی جسم کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا نشہ یقیناً ہرن ہو چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب ریان ولیم اپنے پہاڑ جیسے جسم کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوا......

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ریان چنگھاڑا۔

عمران نے چند لمحے توقف کیا پھر حملہ آور کی گردن چھوڑ دی۔ وہ بری طرح کھانستا اور ابکائیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں مسلح گارڈز بھی اندر داخل ہو گئے۔ وہ خطرناک ارادوں سے عمران کی طرف بڑھے مگر ریان ولیم نے گرج کر انہیں روک دیا۔

اس کے اشارے پر دو گارڈز، ابکائیاں لیتے اور گالیاں بکتے ہوئے سرخ ناک والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ بری طرح ڈول رہا تھا۔

ریان ولیم نے خشمگیں نظروں سے عمران کو گھورا اور بولا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟ تمہیں پتا ہے اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا جناب...... اور میرے خیال میں آپ کے معزز دوست نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب کچھ نشے کی زیادتی کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے زیادہ پی رکھی تھی۔''

عمران کے اس ڈپلومیٹک جواب نے ریان ولیم کا طیش قدرے کم کیا۔ وہ کچھ دیر عمران

کو گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے چلنے کا انداز اور اس کا لب و لہجہ دونوں بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی کافی سے زیادہ پیے ہوئے ہے۔

ناکامی کا افسوس تو یقیناً سب کو ہوا تھا...... اور ماریانی کی کامیابی بھی یقیناً ریان اور اس کے ساتھیوں کو بہت کھٹکی تھی مگر اپنے جذبات کا ایسا بھونڈا اظہار سراسر غلط تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ریان ولیم بروقت آ گیا ورنہ بات بہت بڑھ سکتی تھی۔

○......❖......○

اسی روز رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ریان ولیم کی مہمان نوازی کو خیر باد کہا اور عاطف وغیرہ کے پاس واپس آ گئے۔ اگلے دن صبح جان محمد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے رات والے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے فورڈ (سرخ ناک والے) پر غائبانہ لعنت ملامت بھی کی۔

میں بہت پریشان تھا۔ اقبال، میڈم صفورا اور دیگر ساتھیوں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میری پریشانی اور بے چینی کا اصل مرکز بالو تھا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اگر مجھے تسلی تھی تو صرف ایک بات کی۔ صفیہ اس کے ساتھ تھی پچھلے چند ماہ میں وہ اس کے ساتھ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

میں نے جان محمد صاحب سے پوچھا۔ ''ریان صاحب سے کوئی بات ہوئی، ہمارے ساتھیوں کے بارے میں؟''

''پرسوں ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا رابطہ الٰہ آباد میں موجود انٹر پول کے ایک اعلیٰ افسر سے ہے۔ کچھ سراغ ملے ہیں۔ ان پر پیش رفت ہو رہی ہے۔''

''اس کے بعد بات نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بعد تو یہ شو والا ہلا گلا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب ویسے ہی ریان صاحب اور اس کے ساتھی بڑے خراب موڈ میں ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''جان انکل! یہ تو ساری وقت گزاری والی باتیں لگتی ہیں۔ سراغ مل گئے ہیں...... پیش رفت ہو رہی ہے...... ٹارگٹ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ یہ تو وہی گھسے پٹے جملے ہیں جو ہر سنگین واقعے کے بعد اربابِ اختیار کی طرف سے بولے جاتے ہیں۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' جان محمد صاحب نے پوچھا۔

''اس کا تو مطلب ہے کہ اب تک ہم نے وقت ہی ضائع کیا ہے...... اور وقت بھی ایسا جو بڑا قیمتی تھا۔'' عمران بولا۔

"خیر، ایسی بات بھی نہیں۔ ریان صاحب نے جس طرح ذمے داری لی تھی مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔"

"آپ ابھی اس سے رابطہ کریں اور صحیح صورتِ حال کا پتا کریں۔" عمران کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

جان محمد صاحب نے چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد موبائل پر نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ "ہیلو کون؟...... ریان صاحب کہاں ہیں...... کیا؟...... لاہور سے چلے گئے...... کب؟...... لیکن انہوں نے انفارم ہی نہیں کیا۔ اچھا اچھا...... چلو ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ جان محمد صاحب کی انگریزی بس واجبی سی تھی۔

ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "کیا ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"ریان اور اس کے ساتھی آج صبح سویرے لاہور سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"شاید اسلام آباد۔ میں دوسرے نمبر پر کوشش کرتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور دوسرا نمبر ملانے لگے۔ دوسری طرف بیل ہوتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیور کرنے کی زحمت نہیں کی۔

عمران گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "جو کچھ کرنا ہو گا، ہمیں خود کرنا ہو گا۔ اس گورے میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ کوئز شو میں ہارنے کے بعد بھی اپنی کمٹ منٹ پوری کرے۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا ہمارے لئے۔"

عمران ایک یار باش شخص تھا۔ ہر جگہ اس کے دوست نشانیاں چھوڑ جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ عمران نے لکھنؤ میں اپنے ایک شناسا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس شخص کا تعلق سیّد گھرانے سے تھا اور یہ انڈیا کی وزارتِ خارجہ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔

عمران ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ پہلی کوشش میں حبیب شاہ نامی اس شخص سے رابطہ نہیں ہو پایا لیکن دوسری کوشش میں ہو گیا۔ اس بندے سے عمران کی پُرتپاک گفتگو ہوئی اور عمران نے اسے اپنے مسئلے کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ظاہر ہے کہ فون پر تفصیلی گفتگو ٹھیک نہیں تھی۔ رات کو انٹرنیٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے بارے میں فیصلہ ہوا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ "کیا ہمیں دوبارہ انڈیا جانا پڑے گا؟"

"اگر جانا بھی پڑا تو تم نہیں، میں جاؤں گا۔"

"تم نے خطرے مول لینے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ٹھیکیدار تو میں ہوں...... اور تمہیں پتا ہے کہ بہت عرصے سے ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں میرا اپنا لالچ بھی شامل ہے۔ یار! اُدھر جاؤں گا تو عاصمہ سے پھر ملاقات ہونے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک بے کس پری ہے اور ایک جابر دیو کی قید میں ہے۔ یہ ڈی ایس پی سجاد موہل کسی دیو یا جن سے کم تو نہیں۔ ان جنات کی جان عام طور پر طوطوں میں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں وہ طوطا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں سجاد کی جان ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ عاصمہ سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم صرف بے پَر کی اڑاتے ہو......"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ اپنے دل کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ آہ...... اس میں جب مجھے شبانہ کی جھلک نظر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ماضی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور "گردشِ صیام" پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔"

"گردشِ صیام نہیں گردشِ ایام ہوتا ہے۔"

"اب تم بھی غلطی کر رہے ہو، گردش ہوتا نہیں بلکہ ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یا ہوتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ میں وہ طوطا پکڑ سکتا ہوں یا نہیں جس کی ٹانگ توڑنے سے ڈی ایس پی سجاد کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے......"

"اور فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہم اقبال، صفورا، نوری اور بالو وغیرہ کو واپس لا سکتے ہیں یا نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

میرے اس فقرے نے اسے پھر سے سنجیدہ کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے کش لینے لگا۔ میں نے کہا۔ "سچ پوچھو عمران، تو کبھی کبھی تم پر غصہ آنے لگتا ہے۔ کئی معاملوں میں تم حد سے گزر جاتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں خطروں میں رہنا پسند ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی موت کی طرف سے بہت بے پروا ہو...... اور یہ بے پروائی اب تمہارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر بھی عاصمہ جیسے معاملات سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مانا کہ اس کا شوہر مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا...... لیکن اس کی مایوسی دور کرنے کے لئے تم نے خود کو اس کے لئے چارا بنا لیا۔ اور ایک بار نہیں دو بار۔"

"یار! دوسری بار تو میں نے صرف اپنی قسم پوری کی تھی...... اور بات صرف موہل کی

مایوسی کی نہیں تھی، وہ جنونی اپنی نقد جان دے رہا تھا۔ باقاعدہ راہی عدم ہو رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ دو سال پہلے میں نے جس رات اسے گرفتاری دی تھی، اگر نہ دیتا تو وہ شراب میں دس پندرہ نشہ آور گولیاں ڈال کر مرحوم ہو جاتا...... یا پھر اپنے سرکاری پستول سے اپنی کنپٹی میں سوراخ کر لیتا۔ میں نے ایک انسان کی جان بچائی...... اور ایک عورت کو بیوگی سے بچایا...... بس...... اور مجھے یہ کرنے میں کوئی پچھتاوا نہیں۔"

"اور اس کا صلہ کیا ملا ہمیں...... ہمیں مارا پیٹا گیا۔ ڈیزل انجن کی دھونی دی گئی۔ ہمارے ساتھی دربدر ہوئے۔ بالو دربدر ہوا۔ اب وہ پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہیں؟"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "جگر! فکر نہ کرو۔ انہیں بہ خیریت یہاں لانا میری ذمے داری ہے۔ اور میں یہ پوری کروں گا۔"

اس کی آواز میں وہی یقین تھا جو سننے والے کی سماعت میں جذب ہوتا تھا اور اسے گہرائی تک متاثر کرتا تھا۔

ہم اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے، تب عمران ایک بار پھر ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ اس نے جہاں بھی فون کیا، وہاں سے گرم جوشی کے ساتھ جواب ملا۔ یہ فروری کی آخری تاریخیں تھیں لیکن سردی کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایک شفاف چمکیلی دوپہر تھی۔ کوٹھی کے خوب صورت لان میں پھول جھوم رہے تھے۔ تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ یہ میری جانی پہچانی فضا تھی۔ یہ میرا جانا پہچانا لاہور تھا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کی اَن گنت یادیں ایسی ہی سہانی دوپہروں اور شاموں سے وابستہ تھیں۔

اچانک وہ ہوا جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی گھٹن میں یکایک ایسی ہوا چلی جس نے سارے منظر ہی بدل دیئے۔ میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ ہماری بائیں جانب والا دروازہ کھلا اور جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ میڈم صفورا، اقبال، نوری، صفیہ اور اس کی گود میں بالو۔

عمران ریسیور چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرح مجسم حیرت ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ان سب کے پیچھے عمران کے ساتھی جیلانی کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ یقیناً یہ لوگ جیلانی کے ساتھ ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ میں لپکا اور آگے بڑھ کر بالو کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران اور اقبال ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اقبال کے بعد عمران اور میڈم صفورا ایک دوسرے کے گلے ملے۔ اقبال مجھ سے آ چمٹا۔ یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ صفیہ اور نوری بھی آنکھوں میں

آنسو لئے کھڑی تھیں۔ نوری کی کلائی پر پلاستر نظر آ رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" "کیسے پہنچے آپ لوگ یہاں؟" میں نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب ان کی مہربانی ہے۔" میڈم صفورا نے دروازے میں کھڑے ایک گندمی سے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان اچھی شکل وصورت کا تھا۔ اس نے جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ اس کے سلام کے انداز سے ہی پتا چل گیا کہ وہ انڈیا سے آیا ہے۔ میڈم صفورا نے کہا۔ "اس کا نام عطا الرحمان ہے۔ ایئر انڈیا میں سروس کرتا ہے۔ یہ اپنی اسٹوری خود ہی سنائے گا تو زیادہ اچھی طرح تم لوگوں کی سمجھ میں آئے گی۔"

ہم نے عطا الرحمان سے مصافحہ کیا۔ اس سے گلے ملے۔ "آپ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل خیریت سے ہیں......" اقبال نے کہا۔

"سوائے نوری کے۔" عمران نے فقرہ مکمل کیا۔ "اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے۔"

نوری کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ اقبال بھی چپ ہو یا۔ میڈم صفورا نے کہا۔

"ہمیں بیٹھنے کے لئے بھی کہا جائے گا یا کھڑے کھڑے ہی سب کچھ پوچھ لیا جائے گا؟"

ہم سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔ بالو بدستور میری بانہوں میں تھا۔ اس کا معصوم لمس مجھے سلطانہ کی یاد دلانے لگا۔ وہ بھی دو چار منٹ کے اندر ہی میری گود میں سے مانوس سا ہو گیا۔ بالو اس لباس میں نہیں تھا جس میں بیس بائیس دن پہلے ہم نے اسے الٰہ آباد میں چھوڑا تھا۔ باقی سب کے لباس بھی وہ نہیں تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ آج صبح ہی عطا الرحمان کے ساتھ نیو دہلی سے لاہور پہنچے ہیں۔ اقبال کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ عمران سے کہاں اور کیسے رابطہ کیا جائے۔ ہاں، اپنے ساتھی جیلانی کا فون نمبر اسے معلوم تھا۔ اس نے جیلانی سے رابطہ کیا اور پھر یہ سب لوگ ایک زبردست سرپرائز کے طور پر ہمارے پاس یہاں اس کوٹھی میں پہنچ گئے۔

اس سارے معاملے میں عطا الرحمان کا کردار نہایت اہم محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کردار کیا تھا؟ میرے، عمران اور جیلانی کے ذہن میں بھی یہ سوال مچل رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کا سفری سامان دیکھ کر یہ پتا تو ہمیں چل ہی گیا تھا کہ یہ لوگ قانونی طریقے سے بذریعہ ایئر لائن یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو پایا، اس کا جواب ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ملا۔

ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ عطا الرحمان الہ آباد کی عاصمہ کا سگا بھائی ہے۔ عطا الرحمان لکھنوی لب و لہجے میں بڑی صاف اردو بولتا تھا۔ اس کی شکل و شباہت بھی اس کی گواہی دیتی تھی کہ ڈی ایس پی سجاد کی بیوی عاصمہ سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

عطا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ حضرات کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بحفاظت یہاں پہنچانے کے لئے جو بھی تھوڑی بہت کوشش کی ہے، وہ اپنی بہن عاصمہ کے کہنے پر ہی کی ہے۔ عاصمہ، عمران بھائی کی بے حد احسان مند ہے۔ اسے ہرگز ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ عمران بھائی کے قریبی ساتھیوں کو وہاں الہ آباد میں کسی طرح کی کوئی مشکل پیش آئے۔ وہ اس بارے میں بہت فکرمند تھیں۔ انہی دنوں وہ واقعہ ہوا جس کی وجہ سے عاصمہ بہن اس قابل ہوئی کہ وہ آپ کے ساتھیوں کی مدد کر سکے۔ وہ واقعہ آپ کی ساتھی نوری کے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا تھا۔''

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''عطا بھائی! بہتر ہے کہ آپ شروع سے ساری بات بتائیں تاکہ ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔''

عطا بولا۔ ''شروع میں جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو اقبال بھیا یا میڈم صفورا ہی بتا سکتی ہیں۔''

اقبال بولا۔ ''تابش اور عمران بھائی...... جب ڈی ایس پی سجاد موہل نے آپ دونوں کو ہوٹل پارک ویو سے پکڑا تو ہم نے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ صرف دو پولیس اہلکاروں نے آپ دونوں کو بے بس کر کے گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی پولیس والے نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب ہمارا ہوٹل پارک ویو میں رکنا ازحد خطرناک ہے۔ ہم نے فوراً ہوٹل چھوڑ دیا اور کرائے کی اسٹیشن ویگن کے ذریعے وہاں سے نکل گئے۔ کیپٹن اجے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس بھرا ہوا ماؤزر بھی تھا۔

''ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ایک پولیس ناکے پر رکنے کا اشارہ کیا گیا...... میرا خیال ہے کہ یہاں ہم سے غلطی ہوئی۔ وہ معمول کی چیکنگ تھی۔ ہم رک جاتے تو سرسری جائزے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی مگر اجے کی ہدایت پر ویگن ڈرائیور نے گاڑی کا رخ یکدم ایک بغلی گلی میں موڑ لیا۔ یہیں سے ایک پولیس موبائل ہمارے پیچھے لگ گئی۔ ویگن ڈرائیور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے اجے کے ہاتھ میں ماؤزر دیکھ لیا تھا۔ اجے نے اسے گاڑی تیز چلانے کے لئے کہا اور ہدایت کی کہ وہ پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے لیکن پولیس موبائل تو گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے پیچھے لگ چکی تھی۔ اجے نے چلتی ویگن میں ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کچھ آگے جا کر ویگن کو ایک تنگ سڑک میں گھسا

دیا۔ یہاں ہماری تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ دو تین افراد زخمی بھی ہوئے لیکن یہ فائدہ ہوا کہ ہم وقتی طور پر پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے ویگن ڈرائیور کو چلتی گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ جلد ہی ہم الہ آباد کے مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں مگر اتنا پتا تھا کہ پورے شہر میں پولیس حرکت میں آ چکی ہوگی اور وائرلیس پر پیغام چل رہے ہوں گے۔

''ہم نے ویگن کو ایک جگہ کھیتوں میں چھوڑ دیا اور وہ دو ٹولیوں کی صورت میں اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہم ایک ویران خشت بھٹا پر پہنچ گئے۔ یہ خشت بھٹا ڈھے چکا تھا اور یہاں بھٹے کی بنیادوں میں نیچے کی طرف دو کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم ان کھولیوں میں جا چھپے۔ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ چمگادڑیں اور بلیاں تھیں یا آوارہ کتے تھے۔ ہم پورے چار دن وہاں چھپے رہے۔ آخر بھوک سے بے بس ہو گئے۔ تھوڑے سے بسکٹ اور نمکو تھے، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ پولیس اس علاقے میں بھی ہمیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اجے اور نوری نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ سردی بہت تھی۔ اجے نے اپنا منہ سر ایک گرم چادر میں لپیٹ لیا۔ نوری نے بھی اپنی چادر سے نقاب کر لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے روپ میں کھولی سے نکلے اور قریبی بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ قریبی بازار بھی وہاں سے قریباً تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ریلوے کالونی کی تین چار دکانیں تھیں...... اب آگے کی بات بتاؤ نوری۔''

اقبال نے نوری کو گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

نوری گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے جھمکے بھی اس کی طرح اداس نظر آتے تھے...... بھانڈیل میں وہ ہمیں گھاگرے اور کھلے گریبان والی چولی میں نظر آتی تھی۔ اس کی عریاں کمر نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی اور اس کی چال میں ایک ''مشتعل کرنے والا لہراؤ'' ہوتا تھا...... مگر آج وہ یکسر مختلف دکھائی دیتی تھی۔

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''اجے بابو اور میں بازار کے پاس پہنچے تو وہاں پولیس کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اجے بابو نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں کا اکٹھے آگے جانا ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کھمبے کے پاس کھڑا کیا اور خود سودا لینے کے لئے آگے چلے گئے۔ ابھی ان کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک جیپ میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں بھی پولیس والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا...... بی بی! تم یہاں کیا کرت ہو؟ میں نے کہا، میرا گھر والا آگے گیا ہے، میں اس کا انتظار کرت ہوں۔ انہوں

نے دو چار باتیں کیں اوران کو مجھ پر شک ہو گیا۔ انہوں نے مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے لے گئے۔ مجھے ایک چوکی پر زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس والیوں نے بھی مجھ سے بہت سوال جواب کئے۔ انہوں نے میرا پتا ٹھکانا پوچھا۔ میں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ ان کا شک پکا ہو گیا کہ میں ان چھ لوگن میں سے ہوں جو پانچ دن پہلے ہوٹل سے غائب ہوئے تھے۔

''کوئی تین گھنٹے تک چوکی میں رکنے کے بعد مجھے ایک کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک کمرا تھا جو دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔ یہاں مارنے پیٹنے کا سامان بھی پڑا ہوا تھا...... تھوڑی دیر بعد بھاری مونچھوں والا سوجی سوجی آنکھوں والا ایک افسر کمرے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو آپ دونوں کو ہوٹل سے پکڑ کر لے گیا تھا۔ وہ بہت خراب بندہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور بہت ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کمرے میں دھواں چھوڑ دیوے گا اور میں کھانس کھانس کر مر جاؤں گی۔ وہ بہت برا بندہ تھا۔ اس نے مجھے بہت تھپڑ مارے اور دیواروں کے ساتھ پٹخا...... میرا بازو ٹوٹ گیا اور......''

نوری کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکنے لگی۔

میڈم صفورا نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔ میڈم صفورا نے باقی کی رُوداد انگلش میں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈی ایس پی موہل بالکل جنونی بندہ تھا۔ یہ نوری سے ہمارا پتا ٹھکانا پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے نوری کو ''ریپ'' کرنے کی کوشش بھی کی...... مگر یہاں ہمیں موہل کی بیوی کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس کا نام عاصمہ ہے اور عطا الرحمٰن اس کا سگا بھائی ہے۔ جب سجاد موہل نشے میں چور بے بس نوری سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا، وہ کمرے میں آئی۔ اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے شوہر کے سر پر پیچھے سے ماربل کے وزنی گل دان سے ضرب لگائی۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ عاصمہ نے نوری کو کپڑے پہنائے اور اسے فوری طور پر اپنے بھائی عطا کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے سجاد موہل کی کوٹھی سے لے کر نکل گیا۔ سجاد موہل کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگ گئی تھی۔ عاصمہ نے اسے گاڑی میں ڈالا اور خود لے کر اسپتال پہنچی۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔''

عطا الرحمان نے کہا۔ ''سجاد بھائی اب تک اسپتال میں ہیں۔ ان کے دماغ میں خون جم گیا ہے۔ آپریشن کے ذریعے خون کا لوتھڑا نکالا گیا ہے۔ اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔''

''کسی طرح کا شک تو نہیں ہوا اسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' عطا الرحمان نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو کوئی شک نہیں ہے۔ آگے کا

پتا نہیں۔ ویسے بھی چوٹ کے بعد بھائی صاحب کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ......'' وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا لگتا ہے؟'' عمران نے استفسار کیا۔

''لگتا ہے کہ اب وہ پولیس کی سروس بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت بدلے بدلے نظر آتے ہیں وہ۔''

میری آنکھوں کے سامنے عاصمہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ ایک وفا شعار بیوی تھی۔ ایک باہمت عورت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ احسان شناس بھی تھی۔ اپنی احسان شناسی میں وہ اس حد تک گئی تھی جہاں تک جا سکتی تھی۔ وہ ہمارے لئے تو کچھ خاص نہیں کر پائی تھی لیکن اس نے نوری کے لئے اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے لئے اپنی ہمت کے مطابق سب کچھ کیا تھا۔

عطا الرحمان نے کہا۔ ''نوری میرے پاس تھی۔ میں نے اسے اپنے ایک سکھ دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ اب نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ نوری ٹھیک سے بتا نہیں سکتی تھی کہ باقی لوگ کہاں ہیں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ لوگ جہاں پر ہیں، وہاں سے تھوڑی دور دو اور خشت بھٹے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے 11 کے ہندسے کی طرح بالکل ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے چالو ہیں اور ان میں سے رات دن دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اب ہم نے ان دونوں بھٹوں کی تلاش شروع کی۔ ہم بھٹے تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید نوری کے لاپتا ہونے کے بعد باقی لوگ اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں...... ساتھ ساتھ جڑے ہوئے دونوں بھٹوں کی تلاش کسی جاسوسی کہانی کی طرح تھی جی......'' عطا نے ذرا توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ''میں اور میرے دوست اس جانکاری تک پہنچے کہ الٰہ آباد کے آس پاس کم از کم آٹھ جگہ ایسے جڑواں بھٹے موجود ہیں۔ اب ان میں سے ہماری مطلوبہ جگہ کون سی تھی...... پھر نوری نے ایک اور جانکاری دی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ اور باقی ساتھی جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے دن میں تین چار بار ریل گاڑی بھی گزرتی تھی۔ ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ نوری کی اس دوسری جانکاری نے ہمیں صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق اقبال صاحب، اجے صاحب اور باقی خواتین مسمار بھٹے کی کھولیوں میں موجود نہیں تھے۔ نوری کے لاپتا ہونے کے بعد وہ یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔ مگر پھر قسمت نے یاوری کی۔ جب ہم دونوں دوست واپس جا رہے تھے اچانک اجے صاحب گنے کے ایک کھیت میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنی گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا ماؤزر پکڑ رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہم کوئی بھی حرکت

کرتے تو وہ ہمیں اڑا دیتے۔ بہرحال، ہماری اور ان کی غلط فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ اجے صاحب کو پتا چل گیا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں اور نوری ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں بھی یقین ہوگیا کہ ہماری ملاقات نوری کے ساتھی اجے صاحب سے ہی ہوتی ہے۔ اقبال، میڈم صفورا، صفیہ اور بچہ مال گاڑی کے ایک خراب ڈبے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں ان سب کو لے کر اپنے سکھ دوست لال سنگھ کے گھر آ گیا...... اور عاصمہ کو یہ خوش خبری سنائی۔ میں ایئرلائن میں اسٹیوارڈ کے طور پر کام کرتا ہوں۔ میرے سسر بھی ایئر انڈیا میں ہیں۔ عاصمہ بہن کی یہ پُرزور خواہش تھی کہ میں نہ صرف اقبال صاحب اور تینوں خواتین کے سفری کاغذات تیار کرواؤں بلکہ انہیں خود پاکستان چھوڑ کر بھی آؤں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سفری کاغذات فرضی ناموں سے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے تیار کئے گئے ہیں۔ ان کو Valid کرانے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اللہ نے بھی مدد کی اور اب ہم آپ کے سامنے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "عطا! ہم تو ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لئے لمبے چوڑے پلان بنا رہے تھے۔ تم نے ایک دم نمودار ہوکر ہماری مشکلیں آسان کر دیں۔"

عطا نے جذباتی انداز میں کہا۔ "میں نے اور عاصمہ نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر۔ احسان تو آپ نے کیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے عمران بھائی۔"

پھر عطا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ "عاصمہ نے یہ خط بھی دیا ہے آپ کے لئے۔"

عمران نے لفافہ کھول کر خط پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

ہم لوگ نوری کی چوٹ پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں فریکچر ہوا تھا۔ یہ چوٹ اسے تب لگی جب ڈی ایس پی سجاد موہل اس سے مار پیٹ کر رہا تھا۔ پھر وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کی چوٹ کی پروا کئے بغیر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ یہ کوشش عاصمہ نے ناکام بنائی اور سجاد کو اسپتال پہنچا دیا۔

ہم رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ اگلے روز ناشتے کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ ہم نے اقبال اور صفورا کو اس میگا کوئز شو کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے ہماری جان ڈی ایس پی موہل اور انڈین جیل سے بچی تھی۔ میگا شو کی تفصیلات جان کر اقبال اور میڈم صفورا بھی حیران ہوئے۔

دوپہر کے وقت ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے عاصمہ کے خط کے بارے میں

پوچھا۔ اس نے جھٹ خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ عاصمہ نے لکھا تھا۔ "عمران بھائی جان! مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بس اندازہ سا ہے کہ آپ کی جان سجاد سے چھوٹ گئی ہے اور آپ شاید پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کرے میرا یہ اندازہ درست ہو...... اور میرا یہ خط بھی عطا کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے۔ دو سال پہلے آپ نے میرے لئے جو کچھ کیا تھا، میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ انگوٹھے ہیں عمران...... اور آپ کی ہر ادا انوکھی ہے۔ آپ نے سجاد کی زندگی بچانے اور میری زندگی سنوارنے کے لئے خود کو بلاتردد پولیس کے حوالے کر دیا تھا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔ آپ کی ساری زندگی انڈیا کی کسی جیل میں گزر سکتی تھی۔ آپ کے اس احسان کا بوجھ ہی کم نہیں تھا کہ پچھلے مہینے آپ نے اس احسان کو دہرا دیا۔ میرے سر کی قسم کو پورا کیا اور خود کو سجاد کی سختی اور بے حسی کے حوالے کر دیا۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

"دو سال پہلے جب سجاد کا چھوٹا بھائی اور میرا دیور انور پاکستان میں ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا تو میرے دل میں بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ایک میل سا آ گیا تھا۔ لیکن آج میں اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچتی ہوں تو شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ ایک پاکستانی ہیں...... اور اس ایک پاکستانی نے میرے دل کا سارا میل دھو دیا ہے۔ مجھے ہر اس شخص سے محبت کرنا سکھا دی ہے جس کا تعلق سرحد کے اس پار سے ہے۔ آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتے ہیں اور رہیں گے۔ سخت بیمار رہنے کے بعد سجاد بھی اب کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔ کاش ایک وقت ایسا آئے جب میں انہیں آپ کے پاس لے کر آؤں اور وہ آپ سے معافی مانگیں...... اور اس نوکھے احسان کا شکریہ ادا کریں جو آپ نے دو سال پہلے ان پر کیا تھا۔"

میں خط پڑھ چکا تو عمران بولا۔ "اس خط میں دو باتیں غلط ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"ایک تو وہ امید غلط ہے جو عاصمہ نے اس کھڑوس سجاد موہل سے لگائی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ سیدھا ہو سکے۔"

"اور دوسری غلط بات؟"

"اس نے پھر بھائی جان لکھا ہے۔" عمران نے ٹھنڈی سانس لی اور کسی اُلو کی طرح اداس نظر آنے لگا۔

قریباً چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد عطاالرحمان جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہی کچھ دیر بعد جان محمد صاحب آ گئے۔ انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اقبال، میڈم صفورا اور نوری وغیرہ بخیریت واپس آ چکے ہیں۔ وہ پریشان تھے۔ انہوں نے قدرے پشیمان لہجے میں کہا۔ ''ریان سے یہ امید نہیں تھی۔ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ اسے اپنی کمٹ منٹ پوری کرنی چاہئے تھی...... یا ہمیں کم از کم اتنا ہی بتا دیتا کہ تلاش کا کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... لیکن مجھے امید ہے وہ رابطہ کرے گا ضرور۔ شاید ابھی تک وہ اپنی شکست اور ماریانی کی فتح کے صدمے سے باہر نہیں آیا۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساتھ والے ٹی وی لاؤنج سے میڈم صفورا کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''عمران...... تابش...... ادھر آؤ...... دیکھو یہ کیا نیوز آ رہی ہے۔''

ہم لپکتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ جان محمد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹی وی چینل پر ایک سنسنی خیز بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

میڈم صفورا نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''جہاز گر گیا...... پرائیویٹ جیٹ فیلکن 900 سی یہ وہی ہے جس کا تم نے بتایا تھا۔ اوہ مائی گاڈ...... یہ دیکھو، نیچے پٹی میں تفصیل بھی چل رہی ہے۔''

ہم بھی سکتہ زدہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ سی این این تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا...... ''ہمارے ذرائع کے مطابق یہ لگژری طیارہ چند ہی روز پہلے مسٹر بفیلو کی ملکیت میں آیا تھا۔ وہ اپنی ایک خاتون دوست مس امینڈ اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس طیارے پر برمنگھم سے ہمبرگ جا رہے تھے۔ ان چاروں کے علاوہ عملے کے تین افراد بھی اس لگژری طیارے میں سوار تھے۔ یاد رہے کہ مسٹر بفیلو ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ کیسینوز کی ایک انٹرنیشنل چین کے مالک تھے جس کو نائٹ رائیڈر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسٹر بفیلو کی عمر پینتالیس سال تھی۔ انہوں نے اپنے پس ماندگان میں......''

عمران نے چینل بدلا۔ یہ ''وی او اے'' تھا۔ یہاں بھی یہی خبر موجود تھی۔ ایک پہاڑی پر طیارے کا سلگتا ہوا ملبا دکھایا جا رہا تھا اور امدادی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر بتا رہا تھا کہ طیارے میں سوار سات افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ اس نے ہلاک شدگان کے ضمن میں طیارے کی ائرہوسٹس کا ذکر بھی کیا جو ایک معروف ماڈل گرل بھی تھی۔

ہم قریباً آدھ گھنٹے تک سخت حیرت کے ساتھ اس حادثے کی خبریں سنتے رہے۔ پھر توقع کے عین مطابق وہ خبر بھی آ گئی جو ابھی تک انہیں آئی تھی۔ ایک انگلش نیوز چینل نے بتایا کہ اطلاعات کے مطابق مسٹر بفیلو بوائڈ نے یہ تین انجن والا جیٹ جہاز جوئے کی کسی بڑی بازی میں جیتا تھا۔ اس بازی، یا کہہ لیں کہ انعامی بازی میں کئی ایسے معروف افراد نے حصہ لیا تھا جن کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہے۔ ان میں مسٹر بفیلو کے کاروباری حریف مسٹر ریان ولیم بھی شامل تھے۔ اطلاعات کے مطابق مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا تھوڑے سے مارجن کے ساتھ یہ مقابلہ جیت نہیں پایا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے ٹی وی بند کیا اور تبصرے میں مصروف ہو گئے۔ عمران بولا۔ ''اس کو کہتے ہیں بال بال بچے۔ ہمارا آخری جواب درست ہوتا تو آج یقیناً بفیلو کے بجائے وہ موٹا ریان ولیم آنجہانی ہو چکا ہوتا۔''

جان محمد صاحب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کھوئی کھوئی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ ''میرا خیال ہے...... ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار پھر تمہاری ''لک'' کام کر گئی ہے۔ یعنی جس کو ہم بدقسمتی سمجھے تھے، وہ خوش قسمتی نکلی۔''

اقبال اور میڈم صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ جان محمد صاحب نے کہا۔ ''خبروں کے مطابق بظاہر یہ فیلکن تکنیکی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ کوئز شو کے روز یہ ''تکنیکی خرابی'' کسی کے حصے میں بھی آ سکتی تھی۔''

میڈم صفورا نے کہا۔ ''مسٹر بفیلو کی اس طیارے میں یہ شاید دوسری پرواز تھی۔''

اقبال بولا۔ ''اسے پہلی ہی کہنا چاہئے۔ نیوز کے مطابق پہلی پرواز تو برمنگھم شہر کے اوپر تھی اور بالکل مختصر سی تھی۔ شاید دس پندرہ منٹ کی۔''

اس خبر نے ہمیں حیرت کے ساتھ ساتھ صدمے سے بھی دوچار کیا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک طمانیت کے احساس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شان دار فیلکن 900 سی ریان ولیم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ ریان ولیم، اس کا بھتیجا گیری یا پھر ہم میں سے بھی کوئی اس حادثے کا لقمہ بن سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد جان محمد صاحب کے سیل فون پر مسٹر ریان ولیم کی کال آ گئی۔ اس نے جان محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے طیارے کے حادثے کی خبر سن لی ہے؟ جان محمد صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔

دونوں میں دس پندرہ منٹ تک اس بارے میں بات ہوئی۔ پھر جان محمد صاحب نے عمران سے کہا کہ ریان ولیم، اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عمران نے بات کی۔ بات کرتے ہوئے اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوطرفہ گفتگو ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ ریان کی آواز آئی۔

''ہیلو مسٹر ایمران! تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں......اور آپ؟''

''میں بھی خیریت سے ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے بخیریت ہونے میں کچھ نہ کچھ تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ بظاہر جو کچھ ہمارے نقصان میں نظر آ رہا تھا، وہ دراصل فائدے میں تھا۔ ہمیں وقتی طور پر ضرور شاک پہنچا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ ہم اس روز اپنی سلامتی جیت کر اٹھے تھے اور بفیلو اپنی زندگی ہار کر اٹھا تھا۔''

''بس جی، یہ اتفاقات ہیں زمانے کے......''

ذرا توقف کے بعد ریان ولیم نے کہا۔ ''تمہارے ساتھیوں کا کیا بنا؟''

''آپ کو ان کا خیال کیسے آ گیا؟'' عمران نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ دن تک اس کام کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ لیکن اب میں پھر سے کوشش شروع کرتا ہوں۔''

''پھر سے کوشش کی ضرورت نہیں جناب...... وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ جو کام آپ اور ہم نہیں کر سکے، وہ ایک اکیلی عورت نے کیا ہے۔''

''زبردست مسٹر ایمران! یہ خبر تو تم نے بہت اچھی سنائی ہے۔ کیسے ہوا یہ سب؟''

''جیسے آپ ہمیں اچانک اٹھا کر الہ آباد سے لاہور لے آئے تھے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی خدا کا ایک بندہ مل گیا۔ وہ انہیں یہاں لے آیا......''

عمران اور مسٹر ریان ولیم کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ آخر میں ریان نے کہا۔ ''ایمران! ہمارے درمیان رابطہ رہے گا۔ مجھے اس واقعے پر بھی بہت افسوس ہے جو لاہور میں تمہارے اور میرے دوست فورڈ کے درمیان پیش آیا۔ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔''

''اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جی۔ جو ہو گیا، وہ ہو گیا۔''

O......❖......O

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ میں حسب

معمول فرش کے سخت بستر پر تھا۔ سونے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک مارشل آرٹ کی کڑی مشق کی تھی۔ اس وقت تھک کر چُور ہو رہا تھا۔ ایسی تھکن اب مجھے تکلیف کے بجائے راحت دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اس جسم کو سزا دے رہا ہوں جس نے ماضی میں مجھے سستی، بزدلی اور ذلت کے تاریک غاروں میں پھینک رکھا تھا۔ بارونداجیکی کے فلسفے کے مطابق میں اپنی ذات سے لڑتا تھا، اپنے نفس کو مارتا تھا۔ میری خوراک بہت سادہ ہو چکی تھی۔ میں سادہ ترین لباس پہن رہا تھا اور موسم کی شدت سے نبردآزما ہونا میرا مشغلہ بن چکا تھا...... عاطف، فرح اور جیلانی میری تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔

موبائل کی گھنٹی نے مجھے بیدار کیا۔ عمران بستر پر سو رہا تھا۔

یہ اس کے موبائل کی گھنٹی تھی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ ریان ولیم کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے عمران کو جگایا۔

''کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

تمہارے ابا جی کا فون ہے۔'' میں نے اسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی اسکرین پر نام دیکھا اور برا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو ایمران؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جی میں بول رہا ہوں۔ کیا ملکہ الزبتھ قاتلانہ حملے میں ماری گئی ہے؟'' عمران نے آخری فقرہ اردو میں کہا۔

''کیا کہا تم نے؟'' ریان ولیم نے پوچھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں، اتنی رات گئے آپ کا فون؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' ریان کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔ موبائل فون کا اسپیکر آن تھا اس لئے اس کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

''کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے؟''

ریان ولیم کی آواز ابھری۔ ''میں لک پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہاری لک پر بھروسا ہے۔ یہ بھروسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ میں لکی بندے کو پہچان لیتا ہوں۔ میری اس صلاحیت نے مجھے کم کم ہی دھوکا دیا ہے۔''

عمران مسکرایا۔ ''کیا آپ نے مجھے یہی بتانے کے لئے آدھی رات کو فون کیا ہے۔''

''تمہارے لئے آدھی رات ہو گی لیکن یہاں امریکا میں دوپہر ہے۔ ایک بڑی چمکیلی اور خوش قسمت دوپہر۔''

''خوش قسمت دو پہر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں ایمران! تمہیں پتا ہے نا کہ آخری سوال کا جواب غلط ہونے کی وجہ سے ہم مقابلے کے ابتدائی انعام پر آ گئے تھے۔ یعنی بنیادی انعام پینسٹھ ہزار ڈالرز۔ پتا ہے گیری نے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کا کیا کیا؟''

''کیا کیا؟''

''اس نے کیلیفورنیا میں یونہی راہ چلتے چلتے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کے لاٹری ٹکٹ خرید لئے۔ اس ریاستی لاٹری کے لئے چار بڑے انعام نکلتے ہیں۔ گیری کا دوسرا بڑا انعام نکل آیا ہے۔ پتا ہے یہ کتنا ہے؟''

''کتنا ہے جناب؟''

''آٹھ ملین ڈالرز...... پورے آٹھ ملین ڈالرز۔'' ریان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ ''تم لکی ہو بھئی۔ مجھے پہلے بھی اس میں شبہ نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے۔''

''آپ میرے لئے اس طرح کا گمان کرتے ہیں، اس کے لئے آپ کا شکریہ۔''

عمران کا لہجہ روکھا پھیکا تھا۔

''میں بہت جلد پھر پاکستان آ رہا ہوں۔ پروفیسر رچی بھی میرے ساتھ ہوگا۔ کچھ اور کام بھی ہیں لیکن سب سے اہم کام تم سے ملنا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد یہ بات چیت ختم ہوئی تو عمران نے تکیے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور بولا۔ ''دنیا مطلب دی او یار۔ مطلب ہووے تے پیار وی کر دے ظالم دنیادار۔''

''یہ تو واقعی چمتکار ہوا ہے عمران۔ جو بدترین ہار نظر آ رہی تھی، وہ ایک مناسب جیت میں بدل گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو پینسٹھ ہزار ڈالرز اس انعامی مقابلے میں جیتے گئے، وہ پینسٹھ ہزار ڈالرز نہیں تھے۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز تھے قریباً ساٹھ کروڑ پاکستانی روپیا۔''

''کہنے تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جگر! خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے کہا ہے نا کہ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ اب پروگرام کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کل کا پروگرام۔''

''تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اپنی گرل فرینڈ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''شاہین کی اور کس کی؟ تمہاری سرکس کی ساتھی۔ موت کے کنوئیں کی ساتھی...... اور شاموں اور راتوں کی ساتھی۔''

''یہ آخری بات تم نے بالکل غلط کی ہے۔ میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ تم پر 'توہین

چینل' کا مقدمہ ہو سکتا ہے۔ شاموں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن وہ میری راتوں کی ساتھی نہیں ہے...... بلکہ کوئی بھی راتوں کی ساتھی نہیں ہے۔ یہ باب اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے......''

''چلو جو بھی ہے لیکن کچھ تو خوفِ خدا کرو۔ تمہیں چوبیس روز ہو گئے ہیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے لیکن ابھی تک اسے شکل بھی نہیں دکھائی۔''

''میں نے ابھی شکل دکھائی ہی کسے ہے؟ ابھی تو میں لاہور سے بھی ٹھیک طرح سے نہیں ملا۔ میرے گلی کوچے...... میرے لوگ...... میرے بازاروں کی رونقیں سب کچھ مجھ سے دور ہے۔ یہاں آتے ہی یہ ریان ولیم والا ٹینٹا کھڑا ہو گیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے سب کچھ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ کل لاہور سے ملیں گے۔''

''ضرور ملیں گے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہوگی۔'' عمران نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''بچوں کے لئے ہر بات کا سمجھنا ضروری نہیں ہوتا۔ کئی باتیں اور فلمیں صرف اٹھارہ سال سے اوپر کے لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تایا جی۔'' میں نے کہا۔

''یار! ایک بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اٹھارہ سال کی حد کیوں رکھی گئی ہے؟ کیا اس عمر میں بندہ بہت مضبوط ہو جاتا ہے؟ یہ تو بہت طوفانی عمر ہوتی ہے۔ حد ہونی چاہئے پینتیس سال چالیس سال یا پھر اٹھاسی سال سے اوپر۔ یوں بے راہ روی کا کوئی خطرہ تو نہیں رہے گا۔''

''خطرہ تو پھر خطرہ ہوتا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''تم اپنے آباؤ اجداد کا کوئی تجربہ بیان کر رہے ہو۔ میں عام بات کر رہا ہوں۔''

میں نے گھونسا تانا تو وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے جا کھڑا ہوا۔

اب ہم میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بے دریغ لتاڑتے تھے۔ زبانی بھی اور جسمانی بھی۔ مجھے پھر اس لاٹری کا خیال آ گیا جس کا دوسرا بڑا انعام برص زدہ گیری کو ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس خطیر انعامی رقم سے بہت سی ریان ولیم کے گنبد نما پیٹ میں چلی جاتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو گیری کے حصے میں آنا ہی تھا۔ وہ اس ''کچھ نہ کچھ'' سے بھی اپنی بہت سی خواہشات پوری کر سکتا تھا۔ اسے ایک ڈیڑھ ملین بھی مل جاتا تو بہت تھا۔ میں نے

تصور کی نظروں سے گیری گرانٹ کے افسردہ چہرے کو خوشی کی روشنی میں چمکتے دیکھا۔ میں اور عمران دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ میں اور عمران ایک موٹر سائیکل پر سوار لاہور کی سیر کے لئے نکلے۔ یہ وہی موٹر سائیکل تھی جو کئی برسوں سے موت کے کنوئیں میں عمران کی ساتھی تھی۔ ایک شیطانی چرخا۔ جب یہ چلتی تھی تو لگتا تھا کہ پوری دنیا میں بس اسی کی گونج ہے۔ عمران کی فرمائش پر جان محمد صاحب نے کل ہی یہ موٹر سائیکل سرکس سے منگوائی تھی۔ جان محمد صاحب نے عمران ہی کی فرمائش پر ابھی تک اس کے سارے ''سرکس فیلوز'' کو اس کی آمد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ شاہین بھی ان میں شامل تھی۔

ہم دونوں ہیلمٹ پہن کر اس ''تاریخی'' موٹر سائیکل پر بیٹھے اور لاہور میں گم ہو گئے۔ عمران ایک گرمی میں جھلسے ہوئے پیراک کی طرح تھا اور وہ لاہور کے ٹھنڈے تالاب میں غوطہ زن ہو گیا تھا۔ مال روڈ، لوئر مال روڈ، میکلوڈ روڈ، سرآغا خاں روڈ، فیروز پور روڈ، وہ کون سی سڑک تھی جس کے سکون کو اس موٹر سائیکل کے شور نے تہ و بالا نہیں کیا۔ وہ بلا کی رفتار سے چلاتا تھا اور اس کے پیچھے بیٹھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ جیل روڈ کے قریب ایک چوراہے پر وہ دائیں جانب سے آنے والے ایک ٹرک کے سامنے سے اتنی تیزی سے گزرا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ ''یار! اب اتنے بھی شوخے نہ بنو۔ مانا کہ تمہاری جان ہتھیلی پر ہے لیکن دوسروں کی جان تو ہتھیلی پر نہ رکھو۔''

''یار! کبھی موٹر سائیکل کے نیچے آ کر بھی ٹرک تباہ ہوا ہے۔''

''یہ بالکل بیکار دلیل ہے تمہاری۔ ٹرک ڈرائیور گھبرا کر ٹرک کو گندے نالے میں بھی گرا سکتا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ رفتار کچھ کم کر دیتے ہیں اب ساٹھ سے اوپر نہیں جاؤں گا۔''

''یعنی تمہارے خیال میں ساٹھ کم ہے؟''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکل کا ہوٹر سنائی دیا۔ وہ ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

''لو اب بھگتو...... اشارہ کاٹا تھا نا تم نے۔ تمہارا پھوپی زاد پیچھے لگ گیا ہے۔''

عمران نے بھی عقب نما آئینے میں ٹریفک سارجنٹ کو دیکھ لیا۔ پھر عمران نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ رفتار کم کرنے یا موٹر سائیکل روکنے کے بجائے اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹریفک سارجنٹ اور عمران کے درمیان اچھی خاصی ریس

ہوئی۔ ایک اور ٹریفک سارجنٹ بھی اس ''کارِ خیر'' میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر وہ عمران ہی کیا جو ان لوگوں سے پکڑا جاتا یا خوف کھا کر رک جاتا۔ وہ موت کے کنوئیں کا کھلاڑی تھا...... بلکہ اس سے بھی آگے کی چیز تھا۔ کسی بھی گیم کو ''گیم آف ڈیتھ'' بنا کر اسے مزہ آتا تھا۔ بہر حال، میرے کہنے پر اس نے بے چارے سارجنٹس کو زیادہ ''خجل'' نہیں کیا اور داتا دربار کے قریب اپنے شیطانی چرخے کو ایک تنگ گلی میں گھسا دیا۔ پھر ایک اور زیادہ تنگ گلی میں گھسنے کے بعد اندر ہی اندر سفر کرتا راوی روڈ کی طرف نکل آیا۔

بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہیرو بھائی، ہیرو بھائی کی آوازیں بلند ہوئیں...... میں نے چار برس پہلے کے چاچے رفیق کو دیکھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا آیا۔ اس نے عمران کو گلے لگایا...... پوپلے منہ سے بولا۔ ''پتر کہاں رہے اتنی دیر؟ ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا تمہیں شکل دکھائے ہوئے۔ بڑے بڑے برے خیال آتے تھے ہمیں۔ لگتا تھا کہ پورا محلّہ ویران ہو گیا ہے۔''

''بس آ گیا ہوں نا۔ اب آپ کے آس پاس ہی رہوں گا۔ اور زاہد بھائی! یہ جھنڈیاں شنڈیاں کس سلسلے میں ہیں؟ کیا آپ کو پتا تھا کہ میں تشریف لا رہا ہوں......''

عمران کا پڑوسی زاہد بولا۔ ''ہمیں پتا ہوتا، تم آ رہے ہو تو پھر ان جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ ڈھول ڈھمکا اور باجا گاجا بھی ہوتا۔ یہ تو نذیرے کی شادی کی جھنڈیاں ہیں...... چاچے نذیرے کی شادی ہو رہی ہے ہفتے کے دن۔ آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔''

''بھائی زاہد تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ چاچا نذیر اور شادی؟''

''ہاں، یہ لمبی کہانی ہے ہیرو بھائی۔'' لمبے بالوں والا ایک لڑکا بولا۔ ''جوانی میں چاچے نذیرے کی ایک منگیتر تھی۔ دو سال رہی تھی یہ منگنی پھر ٹوٹ گئی۔ لڑکی کی شادی کہیں اور ہوئی، ہمارے چاچے نذیرے کی شادی کہیں اور۔ اور پھر پینتالیس پچاس سال گزر گئے۔ اب دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں کے جیون ساتھی دیر ہوئی، اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ دونوں کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ ہم سب محلے والے مل کر امام صاحب کے پاس گئے۔ ان کی اجازت اور رضامندی سے ہم لوگ چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی شادی کرا رہے ہیں۔ اسی محلے سے برات جانی ہے۔ اسی محلے سے ڈولی اٹھنی ہے۔''

''زبردست...... یہ تو بڑی فائیو اسٹار قسم کی خبر سنائی ہے تم لوگوں نے۔'' عمران نے کہا۔

عمران کی آمد پر لوگوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہم سب کے ساتھ ہی سیمنٹ کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ کوئی ہمارے لئے حلوہ پوری لے آیا، کوئی چائے، کوئی گاجر کا حلوہ۔ ایک لڑکی نے چوبارے کی تیسری منزل سے ٹوکری لٹکائی اور زور سے بولی۔ ''عمران بھیا! گرم نہاری۔''

''شکریہ...... شکریہ۔'' عمران نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

کئی چھوٹے لڑکے عمران کے شیطانی چرخے کے اردگرد گھوم رہے تھے اور اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ عمران کی تلاش میں بھٹکنے والے ٹریفک سارجنٹس میں سے ایک یہاں پہنچ گیا تھا۔ ''لو کرلو تماشا۔'' میں نے عمران سے کہا۔

سارجنٹ نے عمران کی کھٹارا موٹر سائیکل دور ہی سے دیکھ لی تھی۔ وہ غصے میں تپا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ ''السلام علیکم سارجنٹ بھائی۔'' عمران نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔

''یہ تمہاری بائیک ہے؟'' سارجنٹ نے کرخت لہجے میں کہا۔

''میں اس کا مالک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ لیکن میں اس ملکیت سے انکار نہیں کرسکتا۔''

''تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا...... موٹر سائیکل سمیت۔'' سارجنٹ کو وردی کی موجودگی نے ایک دم پتھر کا بنا دیا تھا۔

عمران نے منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار اپنے واکی ٹاکی کو اپنے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ غالباً اپنے ساتھیوں کو اپنی لوکیشن بتانا چاہتا تھا۔ یکا یک ایک عمر رسیدہ باریش شخص آگے بڑھا اور اس نے سارجنٹ کے ہاتھ سے واکی ٹاکی چھین لیا۔ وہ گرج کر بولا۔ ''ہم تمہیں کچھ نہیں کرنے دیں گے ہیرو پتر کے خلاف۔ یہ ڈیڑھ سال بعد آیا ہے یہاں۔ ہماری آنکھیں ترسی ہوئی ہیں اس کے لئے۔ تم اسے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟''

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مظاہرے کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر پھل فروش بولا۔ ''ہماری یونین ہے ٹھیلے والوں کی۔ تم بھتا لیتے ہو ہم غریبوں سے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں...... ہم تمہارے خلاف کارروائی کرائیں گے۔ اخباروں کے دفتروں کے سامنے مظاہرہ کریں گے...... تم کرو چالان۔ ہم سے بھی جو کچھ ہوسکا، کریں گے۔ یہاں کوئی بھی دُودھ کا نہایا ہوا نہیں ہے۔''

سارجنٹ ذرا ڈھیلا پڑتا نظر آیا...... لیکن وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور موٹر سائیکل کا ہوٹر گونجا۔ غالباً اس دوسرے سارجنٹ کو وائرلیس پر پیغام مل چکا تھا۔ اس نے طوفانی انداز میں اپنی ہیوی موٹر سائیکل موقع پر پہنچائی اور اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے عمران کی طرف بڑھا۔

عمران کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ پھر یہ آثار مسرت میں بدل گئے۔ ''عمران بھائی آپ؟'' اس نے تعجب سے کہا۔

''بے شک میں ہوں۔ بقلم خود۔''

''او گاڈ! آپ نے اتنا دوڑایا ہمیں۔ آپ نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لئے پتا ہی نہیں چلا۔''

''میری بے مثل موٹر سائیکل نے تو ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا۔''

''مجھے تھوڑا سا شک تو ہوا تھا لیکن......''

دوسرا سارجنٹ جو ذرا سینئر تھا، بدستور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا ساتھی اسے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے بجھانے لگا۔ وہ کبھی خاموش ہو جاتا، کبھی نفی میں سر ہلانے لگتا۔ اسی دوران میں بالا دودھ فروش، دو بڑے گلاس باداموں والے دودھ کے لے کر آیا۔ سب نے سینئر سارجنٹ کو گھیرا ڈال لیا اور زبردستی بٹھا کر دودھ پلایا۔ کوئی اس کے کندھے دبانے لگا۔ کوئی اس کی پینٹ سے مٹی جھاڑنے لگا۔ یہاں تک کہ سارجنٹ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

چاچے رفیق نے پوپلے منہ کے ساتھ پُرخلوص دعا دی۔ ''ہنستے ہوئے کتنا چنگا لگتا ہے۔ دیکھنا بڑی ترقی ہوگی تیری۔ وڈی عید سے پہلے پہلے ''ہیڈ کانسٹیبل'' بن جائے گا۔''

چاچے رفیق کی بات پر قہقہہ پڑا۔ ماحول خوش گوار ہوگیا۔ دونوں سارجنٹ ڈیوٹی پر تھے۔ وہ زیادہ دیر ہمارے ساتھ نہیں ٹھہر سکے اور واپس چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والا سارجنٹ نواز احمد عمران کا شناسا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے کسی نئی ہنڈا گاڑی کا چالان کیا اور رجسٹریشن بک رکھ لی۔ لیکن یہ بک تھانے میں جمع کرانے سے پہلے ہی نواز احمد سے کہیں گم ہوگئی۔ نواز احمد کے لئے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ گاڑی مالکان کا دعویٰ تھا کہ ڈپلی کیٹ بک کی وجہ سے ان کا ڈیڑھ دو لاکھ کا نقصان ہوگیا ہے۔ نواز احمد کو نوکری کے لالے پڑ گئے۔ اس موقع پر عمران نے اپنی گرہ سے کچھ رقم دی تھی اور اس نوجوان ٹریفک آفیسر کی نوکری بچائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کے اَن گنت واقعات عمران سے منسوب ہیں۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے بہت سی جگہوں پر لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

عمران اور میں عمران کے پرانے گھر میں بھی گئے اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی زندگی کے وہ بدترین دن یاد آ گئے جب میں ہر گھڑی خودکشی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران اپنی شخصیت کے تمام تر سحر کے ساتھ میرے اور میری موت

کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ تب میرا اور اس کا کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ اپنوں سے کہیں بڑھ کر میرے لئے فکر مند تھا۔

ہم نے اس شاندار ماحول میں قریباً چار گھنٹے گزارے۔ ہم نے لنچ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی کیا۔ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر یہ ایک عوامی لنچ تھا۔ گرما گرم نان، انڈا چنے، سلاد اور آخر میں ملائی والی دودھ پتی۔ جوں جوں اردگرد کے لوگوں کو عمران کی آمد کا پتا چل رہا تھا، وہاں اس سے ملنے کے لئے آ رہے تھے۔ اس سے اپنے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔ گفتگو کا ایک دلچسپ موضوع چاچے نذیرے کی شادی بھی تھا۔ عمران نے وعدہ کیا کہ وہ نذیرے کی شادی میں ضرور شرکت کرے گا اور چاچے، چاچی کو سلامی بھی دے گا۔

تین بجے کے قریب عمران کی موٹر سائیکل پھر اسٹارٹ ہوئی اور آدھے لاہور کو پتا چل گیا کہ کچھ اسٹارٹ ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ''اس دفعہ مجھے چلانے دو۔ میں بھی تو اس کا مزہ چکھوں۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہاری استادی سمجھ رہا ہوں۔ گھبراؤ مت، میں آہستہ چلاؤں گا۔''

ہم نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے اچھرہ پہنچے۔ یہاں ہم نے عمران کے ایک پسندیدہ ریستوران میں چائے پی۔ اس ریستوران سے میری بھی ایک یاد وابستہ تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ ایک عید کے موقع پر ہم سب گھر والے آئس کریم کھانے یہاں آئے تھے۔ کتنے سہانے دن تھے۔ میں، عاطف، فرح اور امی...... ہم اصرار کر کے ثروت اور بھائی ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے...... امی میرے سامنے اُس کونے والی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میں پانی پی رہا تھا انہوں نے کہا تھا۔ ''تابش! تین گھونٹ میں پیتے ہیں۔''

وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ میں آج بھی پانی پی رہا تھا لیکن وہ آواز کہیں نہیں تھی، وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ آنکھیں جل اٹھیں۔ سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ میری ماں کو مارنے والے کہاں تھے؟ وہ اسی شہر میں تھے شاید۔ اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''عمران! ہم سیٹھ سراج کو کب ڈھونڈیں گے؟''

وہ مسکرایا۔ ''بھئی، ہم ڈھونڈنا شروع تو کر چکے ہیں بلکہ...... میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی حد تک کامیابی بھی مل چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

اس نے اپنے سر کو حرکت دیئے بغیر ڈائننگ ہال کے بائیں گوشے کی طرف دیکھا اور

بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ راوی روڈ سے دو بندے مسلسل ہمارے پیچھے ہیں۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ان کا تعلق سراج وغیرہ سے ہے۔ نہ...... نہ، مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں شک ہو گا۔''

ایک دم مجھے یاد آیا۔ جب آج صبح گھومنے پھرنے کے لئے نکلے تھے تو عمران نے ایک تیر سے دو شکار والی بات کہی تھی۔ تو کیا اس کا اشارہ اس طرف تھا؟ شاید...... ایسا ہی تھا...... وہ جانتا تھا کہ جب ہم اس طرح نکلیں گے اور جانی پہچانی جگہوں پر جائیں گے تو سیٹھ سراج کے گرگوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہمیں دیکھے گا، یا اسے ہمارے بارے میں پتا چلے گا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''جو کچھ بھی کرنا ہے لیکن اب گھر کا رخ نہیں کرنا۔ یقیناً یہ لوگ ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ اور یہ ان کے نزدیک ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔''

ہم تقریباً پندرہ منٹ وہاں مزید بیٹھے۔ عمران سوچ میں تھا۔ اس نے دو سو روپے کے بل کے ساتھ بیرے کو پورے آٹھ سو روپے ٹپ دے دی۔ بیرے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آج صبح جب ہم گھر سے نکلے تو عمران کی جیکٹ کی جیب میں ایک موٹی رقم موجود تھی۔ اب اس رقم میں سے تھوڑی ہی بچی تھی۔ اس نے یہ روپے اپنی جان پہچان والے مختلف ضرورت مندوں میں تقسیم کئے تھے۔ بیس ہزار کی رقم موج میلے کی مد میں خرچ ہوئی۔ یہ بیس ہزار روپے اس نے چاچے نذیرے کی شادی کے انتظامات مزید بہتر کرنے کے لئے دیئے تھے۔

ہم ریستوران سے نکلے اور اپنے شیطانی چرخے پر آ بیٹھے۔ عمران نے عقب نما آئینہ درست کر لیا۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس نے راوی روڈ سے روانہ ہونے کے بعد طوفانی رفتار اختیار کیوں نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

یہ ''پیچھا'' ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ وہ دونوں افراد بھی بائیک پر تھے۔ واقعی اب گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عمران یونہی اِدھر اُدھر موٹر سائیکل گھمانے لگا۔ ''کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی سنسان سڑک پر چلتے ہیں۔ وہاں جا کر ان جن پیاروں سے ہیلو ہیلو کرتے ہیں۔''

لیکن صرف ایک دو منٹ بعد عمران قدرے متفکر نظر آیا۔ وہ بار بار عقب نما آئینہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! عجب اناڑی لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ لگتا ہے ''پراپر'' طریقے سے کسی شریف بندے کا پیچھا کرنے کا پتا ہی نہیں ہے انہیں۔ اب پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔''

''تم بھی تو موڑ پر موڑ کاٹ رہے ہو۔''

''لیکن یار، رفتار تو معمولی سی ہے۔ اتنی رفتار پر تو کوئی نابالغ بدمعاش بھی تعاقب جاری رکھ سکتا ہے۔''

اس نے جھلا کر موٹر سائیکل روک دی۔ ہم دونوں بدستور عقب نما آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ دونوں بندے واقعی کوئی غلط موڑ کاٹ گئے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد عمران نے موٹر سائیکل واپس موڑی۔ ہم انہی راستوں پر واپس ہوئے۔ یہ دلچسپ صورت حال تھی۔ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اس کمینے سیٹھو سراج کے کارندے ایسے اناڑی نہیں ہو سکتے۔ کہیں یہ کوئی اور معاملہ نہ ہو۔''

''کبھی کبھی تم عقل کی بات کر ہی جاتے ہو۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ دور فاصلے پر وہ دونوں افراد اپنی موٹر سائیکل سمیت ایک پان شاپ کے قریب کھڑے نظر آئے۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھ رہے تھے۔ ہماری موٹر سائیکل کی آواز ٹریفک کے شور کے باوجود دور ہی سے ان کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ اس وقت یقیناً ان کی سٹی گم ہو گئی جب عمران نے اپنی عجوبہ بائیک عین ان کے پہلو میں جا کھڑی کی۔

انہوں نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک نے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ دونوں کی عمریں پچیس چھبیس سال رہی ہوں گی۔ دیکھنے میں وہ بالکل عام سے دکان دار ٹائپ نظر آتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل پر آگے بیٹھے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ ''ماچس ہو گی تمہارے پاس؟''

''نن... نہیں۔'' وہ ہکلایا۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' عمران بولا۔ ''تم اتنی دور سے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ یقیناً تمہیں اپنا سگریٹ جلانا ہو گا۔ یہ لو۔'' عمران نے اپنا سگریٹ لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا... مطلب... جی۔''

''مطلب کے بچے۔ پیچھا کیوں کر رہے ہو ہمارا؟ کوئی لڑکی نہیں ملی تمہیں۔'' عمران

پھنکارا۔

''وہ تو...... وہ جی...... ہم تو......'' وہ بری طرح ہکلایا۔

''ہم تو...... تم تو...... چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ۔ ورنہ ابھی یہاں مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ بھرکس سمجھتے ہو نا تم؟''

دونوں بندوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ صاف پتا چلا کہ وہ اس قماش کے لوگ نہیں ہیں۔ یا تو چھوٹے موٹے جرائم پیشہ ہیں یا کسی اور چکر میں ہمارے پیچھے ہیں۔ عمران نے ان کی موٹر سائیکل کی چابی نکال لی۔ چند ہی منٹ بعد ہم دونوں ان دونوں کے ساتھ ایک سستے سے چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ اب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ ''کیا چکر ہے صاف صاف بتاؤ۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔'' عمران نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم...... ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''کیوں، میں نے دیوتا لکھی ہے یا ہیری پوٹر میں کام کیا ہے؟''

''وہ جی...... دراصل۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''اور تمہاری شکل مجھے کچھ پہچانی سی لگ رہی ہے۔ تم راوی روڈ پر تو نہیں رہتے ہو؟'' عمران نے قدرے فربہ نوجوان سے پوچھا۔

''ج ج...... جی ہاں۔ میں ادھر ہی رہتا ہوں۔ در...... دراصل کسی نے کہا تھا کہ آپ جب بھی مجھے نظر آئیں، میں آپ سے ملوں اور آپ کو اس کے پاس لے کر آؤں۔''

''یہاں لاہور میں مجھے سب سے زیادہ فلمسٹار ریما جی چاہتی ہیں۔ دوسرا نمبر نرگس کا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی تم جیسے گاؤدی کدو کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ بتاؤ کون ہے وہ؟ اور کہاں رہتی ہے؟''

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تصدیق کئے بغیر ہی مؤنث کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔ یہ بھی اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کا انداز تھا۔

''وہ ہمارے پیر جی ہیں جی۔ پیر شوکت تھانوی صاحب۔ یہاں لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یار! مجھے تھانوی کے لفظ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ ''تھانے'' سے تو نہیں نکلا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو پھر پیر تھانوی کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ ابھی الٰہ آباد والے پیر تھانوی سے بمشکل جان چھڑائی ہے۔''

''کس مقصد سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے پیر صاحب؟'' میں نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔

''انہوں نے بتایا نہیں۔ لِں...... لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''سچ پوچھیں جی تو میں پچھلے تقریباً آٹھ ماہ سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں آتے جاتے آپ کے خالی گھر پر نظر ڈالتا تھا۔ آج گھر میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ آپ کی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں دوڑا ہوا باہر نکل آیا۔''

''تم چھپا رہے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تمہارے پیر صاحب ہیں اور تمہیں ہی پتا نہیں کہ وہ کیوں اتنی بے قراری سے میرا انتظار کر فرما رہے ہیں۔''

وہ ذرا تذبذب میں رہ کر بولا۔ ''مجھے زیادہ تو پتا نہیں جی۔ پر کوئی ایسا مریض ہے جس کا وہ علاج کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے علاج کے لئے ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پوری بات تو آپ کو پیر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو ان کے پاس۔ ابھی ملاقات کر لیتے ہیں۔ لیکن جانا کہاں ہے؟''

''یہیں جی۔ شاہ جمال موڑ کے قریب۔'' اکہرے بدن والے نے جواب دیا۔

ہم چائے خانے سے باہر نکل آئے۔ عمران نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تم اس موٹے کدو کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھی کو بٹھا لیتا ہوں۔''

O......❖......O